سلسلۂ یادگار مہاراجہ نظم (۱)

دیوان ثاقب

طبعزاد

جناب میرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب قزلباش لکھنوی

دار التصنیف و التالیف

محمود آباد

مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ

گوہرِ نابِ بقا، در چشمۂ حیواں مجو   زندہ جاوید دارد، مرد را نامِ نکو

اِنَّ آثَارَنَا تَدُلُّ عَلَيْنَا
فَانْظُرُوا بَعْدَنَا اِلَی الْآثَارِ

سنہ ۱۹۳۶ء

فہرست مضامین

انتساب

حضرت مہاراجہ محمود آباد مرحوم و مغفور نے اپنے دست کرم سے کلام ثاقب کی مدتوں آبیاری کی، لیکن قبل اس کے کہ یہ نخل ادب پھولے پھلے اور اس کے پھولوں کی مہک دنیائے ادب اُردو میں منتشر ہو، دست اجل نے اس پیکر جود و سخا اور مربی کمالات انسانی کو حجاب ابدی میں چھپا لیا!!! کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ

لیکن فنا اُن لوگوں کے واسطے قابل عبرت ہے جو عمدہ مآثر و عواقب سے محروم ہیں، بفضل خدا میرے ولی نعمت نے دو گوہر نایاب جن میں تمام صفات حمیدہ اُن مرحوم کے جمع ہیں، چھوڑے ہیں اور جس نے ایسے برگزیدہ اور منتخب روزگار خلف چھوڑے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا:۔

مَنْ خَلَفَ مِثْلَهُ مَا مَاتَ یعنی عالی مراتب والا مناقب سرکار راجہ

محمد امیر احمد خاں خان بہادر والی ریاست محمود آباد دام اقبالہ
وضاعف اجلالہ، اور اُنکے برادر عزیز حضرت مہاراج کنور محمد امیر
حیدر خاں بہادر زاد عمرہ و حشمتہٗ ۔

خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے ہر ایک دُرِ یکتا، ہر ایک قدر شناس
علم و ہنر، ہر ایک سخن گستر و سخنور ہے۔ لذٰلک خاکسار مشاطۂ سخن کے
ان گوندھے ہوئے ہاروں کو اپنے دونوں آقازادوں کی خدمت میں
بکمال ادب و عقیدت نذر کرتا ہے:۔

پھول وہی جو سہرے پر چڑھے

بندۂ ناچیز ثاقب
۸ - مارچ سنہ ۱۹۳۴ء

عرض حال

منظور ہے گزارش احوال واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

چھپن سال شاعری کی خدمت کی، اس طویل مدت میں یہ کوشش رہی کہ زبان میر کی اور تخئیل غالب کی سی ہو، معلوم نہیں کہ یہ سعی مشکور ہوئی یا غیر مشکور؟ اپنا عیب بھی محبوب ہوتا ہے، لہذا یہ میرے سمجھنے کی بات نہیں، البتہ حسن ظن رکھنے والے احباب مجھکو میر و غالب کا صحیح پیرو خیال کرتے ہیں، اس خیال کی ذمہ داری میرے سر عاید نہیں ہوتی، میں تو احباب کی اس عنایت کا جواب آج سے اکیس برس پہلے ایک نظم میں دے چکا ہوں جو ماہ اکتوبر ۱۵ سنہ ۱۹ع کے رسالہ تمدن میں بمقام لکھنؤ شائع ہو چکی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

جانشینی میر و غالب کی کہاں اور میں کہاں — وہ خدائے فن تھے اُن سے مجھکو نسبت کچھ نہیں

اتنی عمر میں صرف اتنا سا خیال کرنے کا گنہگار ہوں کہ شاید چند شعر ان دونوں باکمال استادوں کے رنگ میں نظم ہو سکے ہوں، دنیا اس جرم کو معاف کر دے تو اس کا احسان ہے، اب صرف یہ عقدہ رہ جاتا ہے کہ پھر اس مجموعہ مہملات کو چھپوایا ہی کیوں؟ خدا گواہ ہے کہ یہ بھی اپنے بس کی بات نہ تھی! آرزو دل و دمنا ل

جہل است و کفارہ یمین سہل! اسکے ماسوا، جواں بخت، جواں سال، محسن، مربی علم دوست، ہنر پرور، سخن سنج، آقا یعنی حضرت ولی نعمت راجہ محمد امیر احمد خاں بہادر والی ریاست محمود آباد اور انکے برادر عزیز جوان صالح، سعید و ذکی فاضل و باذل، نکتہ رس، دقیقہ شناس مہاراج کنور محمد امیر حیدر خاں بہادر دام اجلالہما کا باصرار فرمانا کیونکر نہ قبول کرتا؟

ممدوحین کا اصرار جب تک حکم کی حد تک نہیں پہونچا اسوقت تک مجھے اس ذخیرۂ فضول گوئی کے شایع کرنے کی جرأت نہیں ہوی، میں نے اسے عیب کی طرح چھپایا اور ذی استطاعت احباب کی فیاضی قبول نہیں کی اب فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ پر ڈرتے ڈرتے عمل کرتا ہوں، ناظرین کو اختیار ہے کہ بمصداق مَنْ صَنَّفَ فَقَدِ اسْتَهْدَفَ تیر ملامت کا نشانہ بنائیں یا خردہ گیری سے اعراض فرمائیں!

پیرانہ سری کے باعث مدح و قدح دونوں کی پروا باقی نہیں، یہ بھی اختیار ہے کہ جس شعر کا مطلب پسند خاطر ہو اور الفاظ یا طرز ادا نامرغوب، تو اُسے اصلاح دیکے اپنی پسند کا بنالیں مجھے کوئی شکایت نہوگی، اس صورت میں اصلاح دینے والے کی گرانی طبیعت مندفع ہوجائیگی اور بیچارہ شاعر جواب دہی کی زحمت

سے محفوظ رہے گا اور اگر درحقیقت راقم الحروف کا کلام ناظرین کرام کی رائے میں لغو ٹھہرے تو پھر قرآن پاک کی اس ہدایت پر عمل فرمانا اولیٰ ہے:۔

اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا

جن حضرات کرام نے میرے واقعات زندگی ضبط تحریر میں لانے اور میرے کلام پر تبصرہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی اور اپنا وقت عزیز صرف کیا، میں اُن کا تہہ دل سے شکر گزار اور رہینِ منت پذیر ہوں، بالخصوص عالی جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولٰنا مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب حسرت شروانی مدظلہ کی عنایت کا جنھوں نے اپنے اخلاق کریمانہ سے دیوان کو مطالعہ فرما کر اپنی زریں رائے سے مجھ ناچیز کو سرفراز فرمایا۔

معائب کلام کا میں خود مقر ہوں، ظاہر ہے کہ جامۂ بشریت میں خطا او نسیان کا پیوند روز ازل سے لگا ہوا ہے، بد مذاقی اگرچہ میرا خاصۂ طبیعت نہیں مگر احباب کی خوشنودی مزاج۔ سے روگردانی بعید از اخلاق تھی بنابریں اقل التصنیفین کو ترجیح دینا گوارا کیا۔

افسوس ہے کہ صحت نامہ کے بعد بھی دیوان میں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں

مگر حسن اتفاق سے بعض غلط اشعار مطبوعہ جو ارباب نقد کے تبصروں کے ضمن میں آگئے ہیں وہ صحت کے ساتھ درج ہیں اور انھیں کو صحیح سمجھنا چاہئے۔

تبصروں میں بعض اشعار ایسے بھی ملیں گے جو دیوان میں درج نہیں ہیں یہ وہ اشعار ہیں جنکو میں خود بھولا ہوا تھا اور ناقدین کو یاد تھے۔

زیادہ نیاز

مستغنی از عواقب

خاکسار میرزا ذاکر حسین ثاقب قزلباش

۲۱ - جون ۱۹۳۶ء

از آثار جناب شیخ بدر الزماں صاحب
بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ علیگ

معذرت از مقدمہ نگار

میرزا ثاقب صاحب کے کلام کی طباعت کے لئے اہلِ سخن عرصہ سے مشتاق اور منتظر ہیں، ممدوح کے حلقۂ احباب میں اکثر یہ چرچا رہا کہ کسی طرح ان کا کلام جلد شایع ہو جائے، میرزا کے سرپرست خاص، جناب مہاراجہ صاحب محمودآباد مرحوم و مغفور نے، جو اپنی شانِ علم نوازی میں تمامی رؤساء اودھ میں یکتا اور بے نظیر تھے، اس کام کو اپنے ذمہ لے رکھا تھا، اور اسی بنا پر میرزا کے کسی عقیدت کیش دوست کو اس باب میں سبقت کی جرءت نہوی۔ یہ خبر کس کو تھی کہ وہ علم پرور ہستی دفعتًہ بعالم فانی سے راہی عالم جاودانی ہو جائیگی، اور اپنے میرزا کے کلام کو صدہا دیگر تشنہ کام والیفار طلب ارادوں اور تجویزوں کی صف میں سوگوار و ماتم نشیں چھوڑ جائے گی؟

حال میں میرزا کے ایک قدیم و عزیز دوست خان بہادر معین الملک شیخ منیں الزماں خاں صاحب (سابق وزیر مال ریاست بھوپال) نے یہ تحریک ترغیب جناب محترم چودھری شفیق الزماں صاحب تعلقدار گڈھی بھلول ضلع بارہ بنکی)

جو میرزا کے نہایت ہی مخصوص اور مخلص دوست ہیں) یہ مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ سردست میرزا کے کلام کا ایک مختصر انتخاب تو شایع کردیا جاے، مکمل دیوان بعد میں طبع ہوتا رہیگا چنانچہ اشعار کا انتخاب ہوگیا۔ راقم الحروف کے سپرد خدمت مقدمہ نگاری کی گئی اسکی داغ بیل بھی بساط انتخاب کے مطابق تیار کرلی گئی۔ شدہ شدہ اس تجویز کی خبر موجودہ راجہ صاحب محمود آباد تک پہونچی۔ انھوں نے بجا طور پر یہ محسوس کیا کہ اپنے اولوالعزم اور علم نواز باپ کی خواہش و ارادہ کے ایفا کا حق اُن سے زیادہ کسی کو حاصل نہیں ہے، اور حقیقت امر یہ ہے کہ شان علم پروری اور ہنر نوازی میں وہ اپنے پدر بزرگوار کے صحیح معنی میں جانشین ہیں۔ چنانچہ ممدوح نے میرزا کے مکمل دیوان کی طباعت کا اعلان فرمادیا، لہذا طباعت انتخاب کی تجویز مسترد ہوگئی۔ خدمت مقدمہ نگاری راجہ صاحب ممدوح نے بھی نیازمند ہی کے سپرد کی۔ میری ذمہ داریاں فزوں تر ہوگئیں؛ عم محترم شیخ متین الزماں صاحب کا حکم، ممدوح الشان جناب راجہ صاحب بہادر محمود آباد کا فرمان، اور میرزا ثاقب جیسے شفیق و کرمفرما بزرگ کا اصرار، میرے لئے بجز سر تسلیم خم کرنے کے کوئی سبیل مفر باقی نہ رہی، ورنہ پیشۂ وکالت کی ابتدائی منزل اور اسکی دریوزہ گرانہ مصروفیتیں کسی طرح اس امر کی

مقتضی نہ تھیں کہ میں میرزا ثاقب جیسے باکمال و دقیقہ سنج شاعر کے کلام پر مقدمہ لکھنے
کی ذمہ داری اپنے سر لوں، بہر حال بہ تعمیل ارشاد مقدمہ لکھا گیا ہے۔ مجھے یہ بھی
کہنے میں تامل ہے کہ ادبی حیثیت سے اس مختصر انتشارئیہ پر لفظ مقدمہ کا اطلاق
بھی ہو سکتا ہے، تاہم میں اپنے لئے یہ کچھ کم باعث شرف و سعادت نہیں سمجھتا
کہ جو خدمت مجھے تفویض ہوئی تھی وہ میں نے بقدر استطاعت انجام دیدی لغزشیں
اکثر و بیشتر ہونگی، ناظرین کرام سے امید عفو ہے۔

رسم ہے کہ مقدمہ کے مطالب کا ایک خاکہ اور اُسکے مضامین کی ایک فرد
ترتیب دیکر بسبیل تعارف، معذرت کے عنوان سے پیش ناظرین کی جاتی ہے،
میں اپنے کو اس رسم نوازی سے سبکدوش پاتا ہوں! یہ مقدمہ ترتیب سے کلیتاً
بے نیاز ہے، لہذا فردِ ترتیب پیش کرنے کی حاجت نہیں۔ رہے مطالب،؟
وہ اپنا آپ تعارف کرالیں گے! میں اُنکے تعارف کی آڑ میں اپنے کو خود ستائی
کا مجرم کیوں ٹھہراؤں؟ یہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اس مختصر انتشارئیہ پر غالباً
لفظ مقدمہ کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔ لہذا آپ اس مقدمہ میں ناقدانہ موشگافیوں
کی تلاش و جستجو کی زحمت نہ فرمائیں۔ مقدمہ نگار کی تمام تر کوشش یہ رہی ہے

کہ میرزا کا کلام اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ ناظرین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ معاصرین یا متقدمین کے کلام سے موازنہ کر کے ناخوشگوار نتائج اخذ کرنے کا طریقہ مقدمہ نگار کی نظروں میں مستحسن نہیں معلوم ہوا۔ مقابلہ و موازنہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر کی انفرادیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا، اور اکثر "تحسین بیجا" کا پہلو اسقدر غالب و نمایاں ہو جاتا ہے کہ اُس شاعر کے کلام سے بجائے ہمدردی و دلچسپی کے ناظرین کو ایک قسم کی معاندت و منافرت پیدا ہو جاتی ہے اور شاعر خود تحسین بیجا کے نشے میں اتنا مخمور و سرشار ہو جاتا ہے کہ اُسکی آیندہ ترقی مسدود ہو جاتی ہے! یہ نتائج محض قیاسی نہیں ہیں بلکہ میرے ذاتی تجربہ پر مبنی ہیں:۔ شعرائے حال میں سے ایک صاحب کے (جن کا نام لینا میں مناسب نہیں سمجھتا) کلام کی قسط اول بڑی آب و تاب کے ساتھ شایع کی گئی، اُنکے عقیدت کیش احباب میں سے دو صاحبوں نے بڑی چاہ اور گرمجوشی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ مقدمہ و دیباچہ لکھا۔ انمیں سے ایک صاحب نے جوشِ عقیدت میں اپنے ممدوح کے کلام کا موازنہ میرزا غالب کے کلام سے کر ڈالا، اور وہ بھی اس غلو کے ساتھ کہ اپنے ممدوح کو بامِ ثریا پر پہونچا دیا، اور اُس خدائے

فن کو تحت الثریٰ میں ڈال دیا! اس خیرہ سری کا کیا جواب؟ مجھے شاحضرت سعدی کا یہ قول یاد آیا کہ: "گوہر اگر در خلاب افتد ہماں نفیس است وغبار اگر بفلک رود ہماں خسیس"! چنانچہ اس جسارت ابلہانہ کا نتیجہ وہی ہوا جو میں عرض کر چکا ہوں۔ متقدمین کا شمار "السابقون الاولون" میں ہے اُنکے دامن میں عالم خیال اور دنیائے علم و ادب کی وہ خوبیاں اور فضیلتیں تھیں جو اخلاف کو نصیب نہیں انکی لغزشوں میں بھی ایک کیف ہے جو شعراء حال کی "سلیقہ شعار سبک روی" میں آپ کو مشکل ملے گا۔ اخلاف کی بلند نظری اور ذوق ہنر مندی کا صحیح اقتضا یہ ہے کہ متقدمین کے نقش قدم کو اپنا رہبر و رہنما بنائیں اور تقلید کورانہ سے اپنا دامن پاک رکھیں۔ اس طرح انکے لئے بھی بلندی و رفعت کی راہیں پیدا ہو سکتی ہیں ورنہ محض "حریفانہ ہمسری" سے متقدمین کا مرتبہ حاصل کرنا دشوار بلکہ محال ہے! میرزا ثاقب نے بصد عجز و انکسار میر و غالب کا دامن پکڑ کر میدان شاعری میں قدم رکھا، اور انکی تمام عمر یہ خواہش اور کوشش رہی کہ انہی دونوں خدایان سخن کے نقش قدم پر چلیں آپ اس جذبہ کو آپ "حریفانہ ہمسری" سے تعبیر نہیں کر سکتے اور نہ اس کوشش کو آپ سعی بیجا کا لقب دے سکتے ہیں۔ رہا یہ امر کہ میرزا کی یہ سعی کہاں تک مشکور ہوئی اسکا

حضرت راجہ محمد امیر احمد خاں بہادر والیٔ ریاست محمود آباد دام اقبالہٗ

بہ رسمِ پیکرِ دانش چو خامہ بست میاں گرفت نقش شبیہ "امیر احمد خاں"

فیصلہ خود ناظرین کرام فرمائینگے۔ میرے نزدیک تو کسب کمال کا یہ فلسفہ ہے کہ "حصول ماہتاب کی کوشش کیجئے تب کہیں ستارے نصیب ہوتے ہیں"!
میرزا نے اسی اصول کو پیش نظر رکھکر میرؔ و غالبؔ کی پیروی کی ہے۔ اُنکے دماغ میں ان استادان سخن سے کسی حریفانہ ہمسری کا وہم و گمان بھی نہیں ہے۔ چنانچہ جس عقیدتمندانہ اور متواضع انداز میں میرزا نے اپنا دامن اتہام ہمسری سے پاک کیا ہے، اسکے ثبوت میں میرزا کا یہ شعر کافی ہوگا:

جانشینی میرؔ و غالبؔ کی کہاں اور میں کہاں   وہ خدائے فن تھے اُنسے مجھکو نسبت کچھ نہیں

اور یوں تو شاعرانہ تعلی کے جوش میں شاعر کچھ کا کچھ کہہ جاتا ہے جس کے لئے وہ عدالت گاہ علم و ادب میں مستوجب تعزیر نہیں قرار پاتا!

موازنہ فن تنقید کا ایک ضروری جزو خیال کیا جاتا ہے لیکن اس میں افراط و تفریط کی اسقدر زیادہ گنجائش ہے، کہ علامہ شبلی جیسا مسلم الثبوت ادیب بھی (جسکے احسان سے اُردو زبان کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتی اور جسکو اُردو زبان میں اگر فن تنقید کا بانی کہا جائے تو بیجا نہو گا) اپنا دامن اشتباہ جنبہ داری اور جذبہ ہیرو پرستی سے پاک نہ رکھ سکا، تو مجھ، ہیچمداں کا کیا ذکر؟ لہذا میں نے یہ مناسب نہیں

سمجھا کہ میرزا ثاقب کے کلام کو ہدف موازنہ یا بالفاظ دیگر نشانۂ ملامت و حرف گیری بناؤں۔ چنانچہ میں نے میرزا کے کلام کے صرف وہ خط و خال ناظرین کے سامنے نمایاں کر دئیے ہیں جو میرے نزدیک اُنکے انفرادی محاسن و خصوصیات میں داخل ہیں۔ انداز بیان، یا خیال آفرینی کا ضمنی تقابل اگر کہیں متقدمین یا معاصرین سے کیا بھی گیا ہے، تو اُس سے مراد تفوق و ترجیح نہیں ہے بلکہ محض تشابہ و مماثلت :

میں نے میرزا کے کلام پر بہ اُصول "خذ ما صفا" تنقید و تبصرہ کیا ہے کلام کا تجزیہ بہ اصول "تشریح بعد الممات" کرنے سے عمداً اعراض کیا گیا ہے: اول تو مقدمہ کے حدود اس تفصیل کے متحمل نہ تھے، دوسرے "ناظرین کرام کے فیصلۂ حسن و عیب" پر میری رائے ناقص ایک قسم کا بار ہوتی، تیسرے، میرے نزدیک کلام کی اشاعت اولی کے دیباچہ یا مقدمہ میں قضیۂ حسن و عیب، چھیڑنا ایک پیش از وقت بات ہوتی! لہٰذا اس انداز تنقید کو اشاعت ثانیہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا!

آخر میں مجھے اس امر کا نہایت ندامت کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میرزا کے کلام کی طباعت میں تاخیر و تعویق کا بہت کچھ ذمہ دار میں ہوں: میں نے اس مختصر انتشار کے تلبند کرنے میں بہت زیادہ وقت لیا، جسکی تمام تر وجہ یہی تھی کہ

مختلف الانواع افکار اور بے ربط قسم کی مصروفیتوں نے مجھے سکون و یکسوئی کے بہت کم موقعے دئے کہ جن میں یہ نام نہاد مقدمہ کسی نہ کسی طرح لکھدیا گیا۔

مقدمہ ہذا کی ترتیب و تکمیل کے ضمن میں مجھے عزیزی چودھری عرفان حسین سلمہ ایم، اے، ایلیگ (خلف اکبر چودھری احسان حسین صاحب تعلقہ دار سبحہ ضلع بارہ بنکی) کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ہے، جنکے تازیانۂ یاد دہانی اور علمی انہماک و دلچسپی کے بغیر غالباً یہ اوراق منتشر پایۂ تکمیل کو نہ پہونچتے۔ اور اس باب میں مجھ پر خود میرزا ثاقب صاحب کا احسان اسقدر گرانبار ہے کہ میں اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا، ممدوح نے تکمیل مقدمہ کے لئے جس قدر زحمت انتظار گوارا کی ہے وہ انکی عین سرافرازی و قدر افزائی تھی جسکے بغیر یہ اوراق منتشر زیب اشاعت نہیں ہوسکتے تھے۔ عم محترم شیخ متین الزماں صاحب قبلہ نے ان اوراق منتشرہ کو بالاستیعاب مطالعہ فرمایا ہے اور اپنے زریں مشوروں سے انھیں سربلند اور ممتاز کیا ہے۔ انکا رسمی شکریہ ادا کرنا میرے لئے چھوٹا منھ بڑی بات ہوگی! فقط

سراپا تقصیر و خطا
اصغر بدر الزماں

تعارف

میرزا ذاکر حسین نام، ثاقب تخلص، تاریخی نام میرزا انتظار مہدی و آغا محمد فائق ۱۲۸۵ ہجری ۱۸۶۹ء
وطن مالوف طبرستان، مولد اکبر آباد (آگرہ)، گہوارہ تعلیم و تربیت لکھنؤ۔

سلسلۂ نسب حاجی علی قزلباش مازندرانی المعروف بہ علی قلی خاں شاملو سے ملتا ہے
حاجی صاحب ممدوح میرزا کے مورث اعلیٰ تھے، اور شاہ طہماسپ صفوی کے معتمد علیہ
امرائے دربار میں سے تھے۔ تقریباً دو سو برس کا زمانہ گزرا کہ میرزا کے اسلاف کو کشمکش
معیشت کے ہاتھوں ترک وطن کرنا پڑا، وہ بسلسلۂ تجارت وارد ہندوستان ہوئے
اور بمصداق «ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست» اس گہوارۂ تہذیب
تمدن اور مرکز علم و ادب کو اپنا مسکن و مستقر بنا لیا۔

میرزا کے آبا و اجداد نے اکبر آباد میں سکونت اختیار کی۔ شہنشاہ اکبر نے کچھ
ایسی مبارک گھڑی سے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ شہر
علوم و فنون کا مرکز ہو گیا، اور اس کثرت سے ارباب کمال یہاں مجتمع ہوئے
کہ اسکو ہندوستان میں وہی مرتبہ حاصل ہو گیا، جو ایتھنز کو یونان میں حاصل
ہوا تھا؛ دور آخر میں میر و غالب جیسے خدایان سخن بھی اس مردم خیز سرزمین

میں پیدا ہوئے، ہمارے میرزا کے لئے یہ واقعہ کچھ کم باعث شرف وسعادت نہیں ہے کہ انھوں نے ۲۔ ماہ جنوری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۹ ماہ مبارک رمضان ۱۲۸۵ھ ہجری کو بوقت اذان صبح اسی مبارک خطۂ ارض پر خواب عدم سے آنکھ کھولی! جسے یہ سعادت نصیب ہو، اس سے زیادہ میر و غالب کی جانشینی کا مستحق کون ہو سکتا ہے!

میرزا کی خاندانی وجاہت ہندوستان میں بھی برقرار رہی، اکثر اہلِ خاندان اپنی ذاتی قابلیت اور علمی فضیلت کی وجہ سے جلیل القدر عہدوں پر فائز رہے، اور اب بھی ہیں۔ میرزا کے خاندان کے اکثر بزرگوں کو شرکت دربارِ شاہی کی سند عطا ہوئی اور خلعتِ فاخرہ مرحمت ہوئے، میرزا کے والد ماجد مولوی آغا محمد عسکری قزلباش المعروف بہ میرزا محمد حسین ایک زمانے تک سرکار برطانیہ کے ملازم رہے۔

میرزا کی ولادت کو تقریباً چھ ماہ کا زمانہ گزرا تھا کہ ناسازگاری روزگار نے میرزا کے والد ماجد کو اکبر آباد چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ بڑے میرزا صاحب مع اہل و عیال لکھنؤ چلے آئے، اور یہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی، لیکن

فکرِ معاش کے ہاتھوں ایک جگہ قرار کہاں؟ چنانچہ پندرہ سولہ برس الہ آباد میں
سرکاری ملازمت کی اور ۱۸۸۶ء میں اس سے با دل ناخواستہ مستعفی ہو گئے
اسکے بعد ریاست بھوپال میں ۱۸۹۶ء تک بڑی شہرت اور کامیابی کے ساتھ
وکالت کی بالآخر شام زندگی گزارنے کے لئے لکھنؤ تشریف لائے اور یہیں
۲۶۔ اگست ۱۹۰۱ء مطابق ۱۱۔ ماہ جمادی الاول ۱۳۱۹ھ ہجری کو، کشاکش
حیات فانی سے دست بردار ہو کر گوشہ لحد میں آرام فرمایا۔

دہلی کے مٹنے کے بعد لکھنؤ اُردو زبان کا واحد مرکز اور مستند ٹکسال ہو گیا،
چنانچہ ہمارے میرزا نے اسی زبان کے آغوش میں پرورش پائی جسے ناسخ و
آتش اور انیس و دبیر کے سے ارباب کمال نے آبِ کوثر سے دھوکر تمام خس و خاشاک
سے پاک و صاف کر دیا تھا۔

میرزا کی ابتدائی تعلیم قدیم اسلوب پر ہوئی: فارسی، عربی اور اردو تو گویا
گھر کی لونڈی تھی! لیکن ہمارے میرزا فطرۃً شاعر اور آپ کے والد ماجد کو اس فن سے
طبعی نفرت! اس پر طرہ یہ کہ بڑے میرزا صاحب کا قیام فکرِ معیشت کے ہاتھوں
غیر معین، کچھ تو ان پریشانیوں کی وجہ سے اور زیادہ تر باپ بیٹے کے طبعی اختلاف

مذاق کے باعث، میرزا کی تعلیم جس عنوان اور اسلوب سے اور جس اعلیٰ پیمانے پر بڑے میرزا صاحب چاہتے تھے نہ ہو سکی۔ جس زبان اور جس علم کی جانب فطری ذوق شاعری نے رہنمائی کی، وہ تو ہمارے میرزا نے بحد کمال حاصل کر لیا، اور جس چیز کو محض باپ کی رضا جوئی میں حاصل کرنا پڑا وہ ادھوری اور ناتمام رہ گئی! چنانچہ زبان فارسی جسے عروس تغزل اور روح شاعری کہنا بیجا نہ ہوگا میرزا نے بدرجہ اتم حاصل کی، عربی میں بھی درسیات ابتدائی کی منزل طے کر ڈالی کیونکہ اسکے بغیر فارسی اور اردو دونوں غیر مکمل رہتیں، البتہ انگریزی زبان میں جو باپ کی خاطر سے بجبر حاصل کرنا پڑی تھی انٹرنس سے آگے نہ بڑھ سکے! بہرکیف "علم ماضی"، "علم حال"، دونوں سے بہت کچھ بہرہ مند اور متمتع ہو گئے!!

بڑے میرزا صاحب کی وکالت بھوپال ہی کے زمانے میں، ہمارے میرزا، انگریزی تعلیم کے لئے، اپنے مولد یعنی آگرہ بھیجے گئے اور سینٹ جانس کالج میں داخل ہوئے، وہاں تقریباً چار سال ۱۸۸۷ء لغایت ۱۸۹۱ء قیام رہا حسن اتفاق سے وہیں میر مومن حسین صاحب صفی مرحوم متوطن امروہہ ضلع مرادآباد شاگرد رشید ملک الشعرا مہدی علی خاں صاحب ذکی مرادآبادی سے میرزا کو شرف تقرب حاصل

ہوگیا۔ یہ بزرگ اپنے زمانے کے جیّد ادیب و انشاپرداز اور ماہر فن شاعری تھے عربی، فارسی، اُردو تینوں زبانوں میں قادر الکلام اور صاحب تصنیف و تالیف تھے۔ اس شرف تقرب کا قدرۃً نتیجہ یہ ہوا، کہ میرزا کی شاعری پر باعتبار فن جلا ہوگئی، اور اس طرح ہمارے میرزا ہر اعتبار سے مکمل شاعر ہوگئے۔

ماہ دسمبر ۱۸۹۱ء میں میرزا کی شادی ہوی، یہیں سے زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوگیا، دورِ تاہل کی گوناگوں ذمہ داریاں اور نت نئی فکریں، محتاج تشریح نہیں، لیکن باوجود انہی تلخکامیوں کے، یہی چیزیں ارتقاء حیات انسانی کے اجزاء لاینفک ہیں۔ جذبات کا مدوجزر، احساسات کا نشیب و فراز، تمناؤں کا جھرمٹ مایوسیوں کا ہجوم، خیالات کی نیرنگی، تجربات کی فراوانی، نفس کی فریب کاری، ضمیر کی دامن کشی، انہی کیفیات اور تجربات کے دامن میں حیات انسانی کی نشو و نما ہوتی ہے! اسی کشمکش کا نام زندگی ہے، اور اسی کشمکش میں انسان کی تعمیر و تخریب کا راز مضمر اور پوشیدہ ہے!

باپ جب تک زندہ رہے، میرزا دورِ تاہل کی ذمہ داریوں سے بہت کچھ مطمئن اور سبکدوش تھے، لیکن تابکے؟ زندگی کے اس جدید عنوان نے فکر معیشت ناگزیر

کردی۔ چنانچہ اس فکر و جستجو کے ہاتھوں وہ کچھ کرنا پڑا جس سے میرزا کی شاعر نژاد
طبیعت کو کوئی لگاؤ نہ تھا، انجام کار ناکامی!

ہمارے میرزا نے ۱۸۹۸ء میں خاصے بڑے پیمانے پر بمقام لکھنؤ ایک
کارخانہ تجارت کی بنا ڈالی جسکا سلسلہ چار پانچ سال تک کسی نہ کسی طرح جاری رہا
آخر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی اور اس تجارت میں میرزا کو بڑا خسارہ ہوا! تجارت
اور شاعری میں کوئی رشتۂ اخوت کیونکر قائم ہوتا! یہ بھی عالم شباب کی ایک
شاعرانہ اُمنگ تھی! بہرحال اس خسارے کا صدمہ اتنا زیادہ ہوا کہ میرزا نے
پھر کبھی تجارت کی جانب رُخ نہیں کیا! تاہم یہ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا!

ہر ناکامی کے پردے میں ایک نہ ایک راہ کامرانی بھی پنہاں ہوا کرتی ہے
گو شکست نصیب انسان اُسے فوراً محسوس کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا! دُنیا
میں ناکامی و کامرانی کچھ اس انداز سے ہم رشتہ و منسلک ہیں کہ دونوں میں حد فاصل
قایم کرنا بسا اوقات ناممکن و محال ہو جاتا ہے، لیکن ہر ظلمت یاس سے ایک
شعاعِ امید پیدا ہوتی ہے جس کی روشنی حرماں نصیب انسان کے
لئے شمعِ ہدایت کا کام کرتی ہے، ورنہ نظام عالم کا تمام شیرازہ بکھر جائے!

چنانچہ ہمارے دل گرفتہ میرزا کے لئے بھی کامرانی کی ایک راہ نکل ہی آئی! اس زیاں نصیب تجارت کے سلسلے میں میرزا کو مہاراجہ محمود آباد مرحوم کے پدر بزرگوار، سرامیر الدولہ راجہ محمد امیر حسن خاں بہادر جنت آرامگاہ سے شرف تعارف، اور رفتہ رفتہ شرف تقرب حاصل ہوگیا، جس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے میرزا ابتدائے عہد مہاراجہ صاحب مرحوم میں ریاست محمود آباد کے ملک الشعرا اور مستقل وثیقہ دار ہوگئے۔ (یہ واقعہ ۱۸۹۶ء کا ہے)

قبل اسکے کہ ریاست محمود آباد کی ملک الشعرائی کا فخر حاصل ہو، ہمارے میرزا بہ تلاش معاش ۱۹۰۰ء میں کلکتہ چلے گئے، حسن اتفاق سے وہاں سفیر ایران کی خدمت میں باریابی حاصل ہوگئی، وہ میرزا کی ذہانت و قابلیت سے اسقدر محظوظ اور متاثر ہوئے کہ انھوں نے میرزا کو اپنا پرائیوٹ سکریٹری مقرر کر دیا، میرزا نے اس جلیل القدر عہدے پر تقریباً دو سال نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کام کیا، بظاہر اسباب یہ ایک مستقل صورت پیدا ہوگئی تھی، لیکن جس شخص کی آنکھوں میں شام اودھ کی دلفریبیاں بس گئی ہوں وہ زلف بنگالہ کی ابلہ فریب درازی سے کیونکر متاثر ہو سکتا! میرزا اپنی ملازمت سے بظاہر قانع اور مطمئن تھے، لیکن انکا قلب جس فضا اور ماحول کا

خوگر دجو یا تھا وہ بنگالہ میں کہاں میسر؟ اس کشمکش بیم و رجا کی حالت میں مہاراجہ صاحب مرحوم کے پرائیویٹ سکریٹری (راقم الحروف کے پدر محترم) شیخ رئیس الزماں صاحب مرحوم کا ایک تار پہونچا کہ جناب راجہ صاحب (مہاراجہ صاحب مرحوم) آپ کو یاد فرماتے ہیں، میرزا نے اس دعوت کو بطور پیام زلیست لبیک کہکر فوراً اپنے آقائے نامدار (سفیر ایران) سے رخصت حاصل کی اور لکھنؤ پہونچگئے (یہ واقعہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء کا ہے)۔ خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر! میرزا نے اپنے گھر کی نان جویں کو سفرہ ایران پر ترجیح دی! راجہ صاحب ممدوح نے پچاس روپیہ ماہوار کا وثیقہ مقرر کر دیا، اور برائے نام میر منشی کا عہدہ سپرد فرمایا، لیکن فی الحقیقت نہ اس ملازمت کا کوئی عنوان اور عہدہ، اور نہ اسکی کوئی ذمہ داری اور پابندی! یہ بھی ایک انداز علم نوازی تھا، جو ریاست محمود آباد کا ہمیشہ طرہ امتیاز رہا ہے، وہ دن ہے اور آج کی گھڑی، زمانے نے ہزاروں کروٹیں بدل ڈالیں لیکن ہمارے میرزا کی قناعت نواز، صبر آشنا، خود دار، اور وطن پرست طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ لکھنؤ سے باہر قدم نکالتے۔

پچاس روپیہ ماہوار کی بضاعت ہی کیا! مگر ایک متوکل علے اللہ کی نگاہ میں

یہی پچاس روپیہ پچاس اشرفیوں کے برابر! خدا نے اس قلیل رقم میں وہ وسعت و برکت دی، کہ اسی میں بچوں کی پرورش و پرداخت، تعلیم و تربیت، شادی بیاہ، دُکھ بیماری، سب ہی کچھ ہوا اور ہوتا رہتا ہے، لیکن میرزا بفضلہٖ کبھی کسی کے دست نگر نہیں ہوئے، طبیعت ایسی خود دار کہ کتنی ہی مصیبت کیوں نہ پڑے، کیا مجال کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز کریں!

میرزا کے اخلاق و عادات، نہایت ہی سادہ، بلند، اور مستحسن ہیں طبیعتہً نہایت متواضع و منکسر مزاج، لیکن ساتھ ہی انتہائی خود دار، تصنع اور بناوٹ سے عاری، صادق اللہجہ، مروت شعار، نام و نمود سے گریزاں، تحسین و ستائش سے بے نیاز، قدرے دیر آشنا، مگر ساتھ ہی اصول آشنا نوازی اور آئین دوستداری نہایت ہی مستحکم و دیرپا، مخلص و باوضع، پاسداری احباب و کرم و ایثار شعار عام، دوست کے سامنے سرنگوں، حریف کے مقابل سربلند، تکلف بیجا سے بری، لیکن شرف بے تکلفی میرزا کے معدودے چند احباب ہی کو حاصل ہے بمقتضائے خلوص، ذکی الحس مگر صاف دل اور محبت نواز، آزاد خیال، راسخ العقائد، محب و مدح خوان اہلبیت، لیکن تعصب اور رسم پرستی کو باعث

ننگ سمجھتے ہیں۔ ہمارا تجربہ تو میرزا کے اخلاق کے بارے میں یہی کچھ ہے اور یوں تو غیب کا حال اللہ ہی پر روشن ہے! میرزا کو نہ ہم فرشتہ سمجھتے ہیں اور نہ آپ کو سمجھانا چاہتے ہیں، اُن میں وہ کمزوریاں بھی ہیں جو جامۂ انسانیت کے لئے بمنزلۂ زیور ہیں۔ میرزا سے خود پوچھئے تو وہ اپنے کو سراپا خطا و عصیان کہیں گے، لیکن ہم اُنکی اس منکسر مزاجی کی ہم نوائی کرنے سے قاصر ہیں۔ عادات جو بمنزلۂ طبیعت ثانیہ ہوا کرتے ہیں، وہ اسقدر سادہ اور غیر مکلف ہیں کہ میرزا کبھی کسی کے لئے باعث زحمت نہیں، اُنکی سب سے بڑی ضیافت، عظیم اللہ خانی حقہ، نہ حقہ ہو تو سگرٹ ہی سہی: بہرحال کوئی نہ کوئی سامان ایسا فراہم ہو جس سے یہ واضح ہو جائے کہ دماغ کا سرمایہ دود ہے، ہاں اگر دیدیجئے تو عنایت ورنہ تقاضا نہ گلہ! کھانے پینے میں مطلق کسی قسم کا تکلف نہیں، لباس نہایت سادہ وضع ہندوستانی، انداز گفتگو نہایت متین اور سنجیدہ، بسا اوقات کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں: ایک طرح کی محویت خیال طاری رہتی ہے جس میں کسی قسم کا مظاہرہ تصنع شامل نہیں ہوتا،

یہ ہے میرزا تاقب اور اُنکی روئداد زندگی کا ایک مختصر خاکہ، آپ اگر تفصیل

چاہتے ہیں، توزحمت کرکے لکھنؤ تشریف لائیے، اور یہاں کی کسی تنگ وتاریک اور گمنام گلی میں میرزا کو تلاش کرکے، اُن سے ملئے اور ربط پیدا کرنے کی کوشش کیجئے! ممکن ہے ہمارا یہ مختصر خاکہ آپ کو میرزا کی جستجو اور تعارف میں کچھ مدد دے۔

آیندہ باب میں ہم میرزا کا بحیثیت شاعر تعارف کرینگے، جو اس مقدمہ کا اصلی مدعا ہے اور جس کے بغیر میرزا کی زندگی کا ہر خاکہ محض جسم بے روح ہے!

میرزا بحیثیت شاعر

حدیثے دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد وگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

شاعری کیا ہے؟ شعر کسے کہتے ہیں؟ اس موضوع پر کوئی مستقل باب قائم کرنا اس مقدمہ کی قلمرو سے باہر ہے، اس فرو گزاشت کو آپ ہماری علمی ناداری و تہیدستی پر محمول کریں، یا ہمیں ناظرین کرام کی علمی بصیرت کے اعتراف و احترام کا تمغا عطا فرمائیں! بہر حال بجز ضمنی اشارات کے، اس بحث سے کنارہ کشی ہمارے نزدیک انسب ہے!

اُردو جیسی صغیر سن اور کم مایہ زبان میں بھی اس موضوع پر اس قدر کافی

سرمایہ موجود ہے کہ مزید توضیح محض تحصیل حاصل ہوگی! حکمائے شرق و مغرب نے شعر کی منطقی تعریف و توضیح میں بڑی بڑی خامہ فرسائیاں کی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انمیں سے کوئی توجیہ بھی تمام اصناف شاعری پر محیط نہیں ہے، اور نہ ہو سکتی ہے؛ ہماری رائے میں، شاعری علم کی وہ صنعت ہو کہ جسکی منطقی تشریح اور فلسفیانہ تجزیہ تقریبًا محال ہے۔ جو چیز محض وجدانی ہے اسکی منطقی تعریف و تشریح ہمیشہ ناقص و محدود ہوگی، انسانی جذبات کیفیات اور خیالات کے بے شمار انداز ہیں، اور انمیں سے ہر ایک کے اندر ایک جداگانہ عالم شعریت پنہاں ہو! آپ ہی فرمائیے کہ ایسی بوقلموں اور سیال چیز کی منطقی تشریح اور فلسفیانہ تجزیہ کیونکر ممکن ہے؟ "اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَۃً وَاِنَّ مِنَ البَیَانِ لَسِحرًا"، کا اشارہ اسی منطقی فروما ئیگی و بیچارگی کی جانب ہے! "حکمت"، کا تجزیہ تو کچھ نہ کچھ ہو بھی جائے گو وہ بھی ایک خود فریبی سے زیادہ وقیع نہوگا، لیکن "سحر"، جو تمامی آئین و قواعد سے بے نیاز اور بالاتر ہے اُس کا تجزیہ کیونکر ہو؟ بقول ثاقب ؎

رازِ غمِ الفت ہم سمجھے تو مگر چپ ہیں ۔۔۔ کہنے میں نہیں آتی، جو بات ہو وجدانی

اس معذرت کے بعد ہم نفس شاعری کی تفصیلی بحث سے سبکدوش

ہو جاتے ہیں۔ ہمارے مقدمہ کی وسعت اسکی روادار بھی نہیں کہ میرزا کے
علاوہ ہم کسی اور بحث کو اپنا موضوع کلام قرار دیں۔

ہمارا ارادہ تھا کہ میرزا کی سخن طرازی کی ابتدا اور اُسکی تربیت اور نشو و نما
کا ایک خاکہ ارتقائی اور تاریخی پہلو سے پیشکش ناظرین کریں، لیکن میرزا جیسے
خود فراموش آدمی کی زندگی میں فلسفیانہ ترتیب اور نظام کہاں؟ مجبوراً یہ
خیال ترک کرنا پڑا۔ اس مجموعہ میں میرزا کا تمام کلام جو دستبرد زمانہ سے بچ سکا
اور جو بوقت فراہم ہوا، بلا قید ترتیب، ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے
اور جہاں تک تاریخ اور سنہ کا پتہ چل سکا ہے، اُسے غزل یا نظم کی پیشانی
پر درج کر دیا گیا ہے۔ ناظرین اگر میرزا کے کلام کو ارتقائی نقطۂ نظر سے پرکھنا
چاہیں، تو اپنے مذاق کے مطابق اس مجموعۂ منتشر میں جس طرح چاہیں ترتیب
پیدا کر لیں، ہمیں اس امر کے اعتراف کرنے میں مطلق حجاب نہیں ہے کہ ہمارا
مقدمہ فلسفیانہ ترتیب سے اُسی قدر بے نیاز ہے جس قدر کہ ہمارے ہیرو کی زندگی!
سن شعور کو پہونچتے ہی میرزا کے الفاظ نے جامۂ موزونیت پہننا شروع کر دیا
رفتہ رفتہ ہمارے میرزا اپنے ہم جنسوں اور ہم مشربوں میں شاعر مشہور ہو گئے۔

گر شود نورِ بصیرت کُحلِ چشمِ اعتبار　　　حسنِ صُورت می نماید حُسنِ معنی آشکار

میرزا کے والد کو اس شغل سے طبعی نفرت تھی، لہذا میرزا اپنے ذوق فطری کو پردۂ خفا میں پورا کیا کرتے تھے! ہمیں افسوس ہے کہ اس دور میں پردہ کا کوئی شعر ہمیں دستیاب نہ ہوسکا ورنہ ارتقائی حیثیت سے ناظرین کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوتا۔

جذبات اور ذوق فطری کا خاصّہ ہے کہ اگر انہیں زیادہ دبائیے تو وہ آمادہ بفساد و بغاوت ہوجاتے ہیں، بہتے ہوے پانی کو کون روک سکتا ہے:۔ چنانچہ حکمائے نفسیات کا یہ قول ہے کہ "جذبات کو روکئے نہیں اگر ضرورت سمجھئے تو اُنکے دھارے کو بدل دیجیے" یوں تو میرزا کی شعرگوئی کی ابتدا دس ہی گیارہ برس کی عمر سے ہوی، لیکن اُنکی عمر تقریبًا پندرہ برس کی تھی، جب اُنکا ذوق فطری بغاوت کرکے دفعتًہ سربام آگیا!

جس زمانے میں بڑے میرزا صاحب الہ آباد میں ملازم تھے، شاہزادہ میرزا قیصر بخت فروغ دہلوی وہیں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے، میرزا بھی اپنے باپ کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑے میرزا صاحب اور شاہزادہ صاحب موصوف میں بڑے گہرے تعلقات اور مراسم تھے، دسمبر ۱۸۸۴ء میں ایک دن رات کو

شاہزادہ صاحب کے یہاں آ نکلے چند مخصوص احباب کی صحبت تھی، جس میں حافظ زکریا خاں صاحب زکی شاگرد میرزا غالب، قاضی نجم الدین خاں صاحب برق شاگرد مومن خاں، خان بہادر ذوالقدر منشی خواجہ غلام غوث بیخبر، اور شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں صاحب دہلوی جیسے عالم وادیب بھی موجود تھے۔ ہمارے پانزدہ سالہ میرزا بھی نہیں معلوم کیونکر اس بزم صنادید میں داخل و شریک ہو گئے، باتوں باتوں میں شاعری کا ذکر چھڑا۔ ایسی منتخب محفل میں ایک صغیر سن اور مبتدی کا زبان کھولنا ہی بڑی جرات اور جسارت کا کام تھا! لیکن میرزا نے بھی موقع پاکر اپنا کلام سنایا، بعض نے تحسین و آفرین کی؛ اور جنھیں یہ باور کرنے میں تامل ہوا کہ ایک طفل مکتب کے کلام میں اتنا سوز و گداز کہاں سے آیا، وہ خاموش رہے! چنانچہ میرزا کے امتحان کی نوبت آ گئی! یہ گویا اس موقع کے منتظر ہی تھے، فوراً تیار ہو گئے، پہلے خود شاہزادہ صاحب نے میرزا کے سن و سال اور اپنے تعلقات کا لحاظ کرتے ہوئے، ایک مصرع پر گرہ لگانے کی فرمائش کی۔ میرزا نے اس فرمائش کی تعمیل چشم زدن میں کر دی ملاحظہ ہو:۔

(مصرعہ) پر مارتے ہیں چرخ کے سینے پہ پھٹا پھٹ [مصرعہ ثانی]

(گرہ) ایسے ہیں مرے نالہ و افغاں کے کبوتر [مصرعہ اول]

حاضرین مجلس اس بدیہ الکلامی پر ششدر رہ گئے! بڑی تحسین و آفرین کے بعد قاضی نجم الدین خاں صاحب برقؔ نے ایک اور مصرع طرح دیکر غزل کی فرمائش کی، میرزا نے تھوڑی ہی دیر میں ایک نہایت پُر کیف اور مرصع غزل کہکر حاضرین کو سنا دی۔ نعرہائے شاباش و آفرین سے محفل گونج اٹھی، پوری غزل صفحہ ۱۳۰ میں درج دیوان ہے۔ ہم یہاں مصرع طرح اور میرزا کی غزل کے چند اشعار پیش کرتے ہیں، تاکہ میرزا کی خداداد استعداد اور وہبی ذوق شاعری کا ناظرین اندازہ کر سکیں:۔

(مصرع طرح)۔ نہ وہ آسماں کی ہیں گردشیں، نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے [مصرع ثانی]

(گرہ)۔ نہ وہ مہر و ماہ کی تابشیں، نہ وہ اختروں کی نمائشیں [مصرع اول]

(مطلع)۔ رخ و زلف کا ہوں فسانہ خواں، یہی مشغلہ یہی کام ہے۔
مجھے دن کا چین عذاب جاں مجھے شب کی نیند حرام ہے۔

(دیگر اشعار) کہوں حسرتوں کا ہجوم کیا، درِ دل تک آکے وہ بے وفا۔

مجھے یہ سنا کے پلٹ گیا، کہ یہاں تو مجمعِ عام ہے۔

تپ غم سے ہوتی ہے اب مفر، کہ طبیب مرگ ہو چارہ گر

مرا قصہ آج ہے مختصر، مری داستان تمام ہے۔

حاضرین محفل میرزا کی اس غزل کے لئے سراپا تحسین تھے، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں صاحب نے تو یہاں تک کہد یا کہ "میاں صاحبزادے! اگر زندہ رہے تو اپنے وقت کے میر ہو گے"! ہم ان اشعار یا اس غزل کے بارے میں مدح و ستایش کا کوئی علیحدہ باب نہیں قائم کرنا چاہتے، اور نہ ہم ناظرین سے اس امر کے متوقع ہیں کہ وہ اس غزل کو کلام اساتذہ کی صف میں رکھکر مقابلہ کریں۔ ہم نے تو میرزا کی شاعری کے دسر بام، آنے کا واقعہ اس وضاحت و تفصیل کے ساتھ محض اس لئے بیان کیا ہے، کہ بمصداق ع

"قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"، ناظرین کو میرزا کی افتاد طبیعت اور وجدانی کیفیات کا صحیح اندازہ ہو جائے، اور اس ناقابل تردید نظریہ کی مزید توثیق ہو جائے کہ شاعری مثل دیگر فنون لطیفہ محض وہبی اور وجدانی چیز ہے نہ کہ اکتسابی اور مصنوعی! شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خاں صاحب مرحوم

اگر آج زندہ ہوتے تو میرزا کا کلام دیکھکر انھیں نہایت مسرت ہوتی کہ اُن کی پیشین گوئی ایک بڑی حد تک پوری ہوی! اتنا کہنے میں ہمیں بھی تامل نہیں ہے کہ میرزا کے کلام میں، میر کے "نشتر" نہ سہی، لیکن میر کی "آہ" اور اُنکے "سوز و گداز" کا عنصر کافی نمایاں ہے، اتنی قربت اور رسائی بھی دوسرے کسی کو کہاں نصیب!

اس واقعہ سے میرزا کی بڑی ہمت افزائی ہوی، رفتہ رفتہ حجاب پدری بھی اُٹھگیا، پھر تو میرزا تھے اور شاعری: محفل شعرا میں، بزم اساتذہ میں، اوراق رسائل میں، اور کبھی کبھی تارہائے مضراب میں! بقول ڈاکٹر اقبال سہ

اُڑائے کچھ ورق لالہ نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے؛ چمن میں ہر طرف بکھری ہوی ہے داستاں میری

اسطرح میرزا کا کلام تمام فضاء ادب میں منتشر ہو گیا، اسکی فراہمی میں بڑی دشواریاں پیش آئیں، جو کچھ بدقت دستیاب ہو سکا، اُسے یکجا کر کے **دیوان ثاقب** کے نام سے ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے! بسیط حصہ کلام کا میرزا کی بیخودی کے ہاتھوں ضایع ہو گیا، جسکی فراہمی کی کوئی امید نہیں! حافظ شیراز کے بارے میں تو یہ حکایت مشہور ہے کہ شاگردوں نے ان کا کلام

دپارہ ہائے گل، پر محفوظ کر رکھا تھا، جس نے بالآخر دیوان حافظ کی شکل اختیار کی! دورِ حاضر میں میرزا کو ایسے عقیدت کیش اور سعادت مند شاگرد کہاں میسر ہوتے!

میرزا کی بیخودی کے ذیل میں ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا: کسی بڑے معرکہ آرا مشاعرے میں میرزا بھی مدعو تھے، غزل کہکر ایک پرزے پر لکھ لی اور اُسے جیب میں ڈال لیا، میرزا اس وقت عمر کی اس منزل سے گزر رہے تھے جب دامن اور گریبان کے چاک میں فاصلہ کم رہا کرتا ہے! چنانچہ غزل کہیں گر گئی! مشاعرے میں اپنے نزدیک بڑے اطمینان سے ایک طرف جا بیٹھے کہ جب باری آئیگی غزل جیب سے نکال کر پڑھ دینگے! تھوڑی دیر میں ایک نوعمر اور غیر معروف مبتدی نے غزل خوانی شروع کی، نعرہ ہائے تحسین و آفرین سے لوگوں نے مشاعرہ سر پر اٹھا لیا! میرزا کو شبہہ ہوا کہ جیسے یہ اشعار انکی غزل کے ہیں، لیکن داد دینے والوں کی ہمنوائی میں پیش پیش رہے: تیسرا شعر جب پڑھا گیا تو شبہہ نے یقین کی صورت اختیار کر لی، جیب میں ہاتھ ڈالا تو غزل غائب، میرزا کی عالی حوصلگی نے یہ کسی طرح گوارا نہیں کیا

کہ بھری محفل میں اس جرأت مجرمانہ کا بھرم کھولیں! انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چند اشعار کی ایک غزل اور کہہ ڈالی اور اُسے کسی عذر لنگ کے بعد مشاعرے میں پڑھ دیا!

شاعری مثل دیگر فنون لطیفہ کسی زمانے کی پابند نہیں ہے، اور نہ اُس کا مدوجزر اقوام کے عروج و زوال سے وابستہ ہے، شاعر اس قسم کے تمام قیود سے بے نیاز ہوتا ہے، وہ اپنا عروج و زوال خود ہی پیدا کرتا ہے، بعض حکماء کا قول ہے کہ شاعری مثل دیگر فنون لطیفہ دور انحطاط میں ترقی کرتی ہے! اس متناقض نظریہ کی توجیہ یوں کی جاتی ہے کہ دور انحطاط میں قوم کے بازوئے عمل معطل اور بیکار ہو جاتے ہیں اور اس عالم بیکاری میں قوت متخیلہ ترقی کرتی ہے، لہٰذا شاعر، مصور، پیکر تراش، فلسفی اس قسم کے ماہرین فن پیدا ہوتے ہیں! حکماء کے دوسرے گروہ کا نظریہ اسکے بالکل برعکس ہے! بہرحال ان میں سے کسی نظریہ کو کلیتہً نہیں قرار دیا جاسکتا؟ قوم کے عروج و زوال کے ساتھ ساری فضا میں تبدیلی واقع ہوا کرتی ہے جس سے زندگی کا ہر عنوان متاثر ہوتا ہے۔ قوت متخیلہ دور انحطاط میں اسی طرح متحرک رہتی ہے، جس طرح

کہ دورِ عروج میں، فرق صرف اسلوب بیان اور انداز اظہار کا ہوتا ہے،
عالم عروج میں خیالات کی تقطیع، کیفیات مسرت و شادمانی، رقص و ترنم، نغمہ و
سرود پر ہوتی ہے، اور دورِ انحطاط میں قوت متخیلہ کی جولانگاہ حکمت و فلسفہ،
الٰہیات و تصوف، بے ثباتیٔ دنیا، جذبات کے سامنے عقل کی بے بسی اور
اسی قسم کے مختلف حقایق ہوا کرتے ہیں، میرزا ثاقبؔ دورِ انحطاط کے شاعر ہیں
لہٰذا اُنکے کلام میں آپ کو زندگی کے حقایق اکثر و بیشتر ملیں گے، لیکن دورِ عروج
کے خط و خال کمیاب و کمتر بلکہ مفقود! جیسا کہ خود میرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

[ثاقبؔ] بزم میں ہے مری طلب، وہ بھی سرور و عیش کی
ڈھونڈ رہے ہو تم جہاں، حیف، کہ میں اُدھر نہیں

ہر قوم کے لئے بلا قید عروج و زوال، شاعر کا وجود ناگزیر ہے، محفل عیش و
نشاط، بزم سرود و رباب، انجمن رقص و ترنم، میدان رزم و جنگ، افسانۂ
حسن و عشق، رشتۂ گل و بلبل، حکایت زلف دراز، نوائے سوز و ساز،
قصۂ وصل و فراق، داستان رنج و الم، رموز حکمت و فلسفہ، غرض کہ عالم
امکان کا کوئی عنوان ایسا نہیں ہے، جس کا رازداں شاعر سے بہتر کوئی

اور ہو! دنیا میں شاعر کی سحر طرازی اور اعجاز نگاری کے واقعات بے شمار ہیں ج
ہزیمت خوردہ قوم کو فتح و کامرانی کا منہ کس نے دکھایا؟ دنیا کو درس محبت
کس نے دیا؟ سوز پروانہ کو ہمدوش تجلی کس نے کر دیا؟ شمع کو حسن فروزاں
کس نے بخشا؟ بلبل کے ترنم اور گل کے رنگ و بو کا عرفان کس کے طفیل میں
نصیب ہوا؟ کارنامہ ہائے اقوام کہن کس نے زندہ کئے؟ مختصر یہ کہ دنیا
ہر ہر قدم پر شاعر کی رہین منت ہے، لیکن دنیا کی طبعی ناسپاسی کو کیا کہئے؟!
افلاطون نے نظام حکومت کا دستور العمل بنایا، تو شاعر کو کلیتًا قلم انداز کر دیا!
حالانکہ شاعر ہی کے قلب تپش اندوز کی ایک چنگاری تھی جس نے اعداء
یونان کے خرمن حیات کو جلا دیا! آج سائنس اپنے زعم عروج میں شاعر
سے برسر عناد ہے، لیکن باوجود تمام بلند پروازیوں کے ہم نے تو نہ دیکھا
کہ سائنس نے کبھی غنچۂ ناشگفتہ کا راز بتا دیا ہو، یا عقد پروین کی گرہ کھول دی
ہو، یا بوئے گل کا تجزیہ کر دیا ہو؟ آپ کہیں گے کہ موجودہ شاعری بے روح
ہے! اور محض صنعت آفرین ہے! مانا کہ یہ ایک حد تک صحیح ہے، لیکن قصور
کس کا ہے؟ آپ کے ذوق سخن فہمی کا یا شاعر کے مذاق سخن کا؟ ممکن ہے کہ

دونوں کا ہو، لیکن حقیقت یہ ہے، کہ: ؎

جب سے دل زندہ تو نے ہمکو چھوڑا ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

بہرحال شاعر سے شکایت کی گنجایش نہیں، شاعر کی تخئیل آپ ہی کی روداد زندگی سے تعمیر ہوتی ہے، جیسے اجزا آپ اُسے فراہم کرکے دینگے، ویسی ہی عمارت وہ بنائے گا: آپ پھول کے اجزاء کیمیاوی کے طلبگار ہیں، اور اُسکی پنکھڑیاں شمار کرنے پر قانع ہیں، شاعر آپ کو رمز رنگ و بو کیوں بتائے؟ آپ درد دل کا تجزیہ علم نفسیات کے خود ساختہ اور غیر مکمل اصول سے کرتے ہیں، اور آخر میں اُسے خود سری یا ابلہ فریبی کا لقب دیکر اپنے فرض تحقیق سے سبکدوش ہوجاتے ہیں! شاعر دو جملوں میں اس راز کو بتا دیتا ہے، جس سے ماہر نفسیات کو تسکین ہو یا نہو، لیکن اہل دل کی جمعیت خاطر ضرور ہو جاتی ہے: ملاحظہ ہو ؎

غم چیزے رگ جاں را خراشد کہ گاہے باشد و گاہے نہ باشد

مقدمہ

حصّہ دوم

حضرت میرزا ثاقب اور انکا کلام ——————— ایک مطالعہ

بنگاشتۂ کلکِ جناب شہنشاہ حسین صاحب رضوی

ایم اے، ال ال بی (علیگ) ایم آر اے ایس

اڈوکیٹ و مدیر رسالہ خیابان لکھنؤ

۷۸۶

پیش گفت حضرت ثاقب مدظلہ کے دیوان کا مقدمہ لکھنے کا محرک کون ہوا، میں کیا بتاؤں؟ ہو نہ ہو یہ جسارت میرے ہی دل کی ہے۔ خدا کرے کہ یہ اہم خدمت جوان نحیف ہاتھوں کے سپرد ہوئی ہے راقم الحروف اُس کو خاطر خواہ انجام دے سکے، کیوں؟ صرف اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کے سبب سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ نقاد کو رسم محبت سے بیر ہے، میرزا صاحب کے خاندان سے میرے موروثی تعلقات نصف صدی سے زیادہ زمانہ دیکھ چکے ہیں، کہتے ہیں کہ بارہ برس کے بعد تو خون بھی مل جاتا ہے، یہاں تو اس مدت دوازدہ گانہ کے چار دور ختم ہو چکے، لیکن سانچ کو آنچ کہاں! تنقید کے معنی بار دارح و ثنا کے نہیں ہیں بلکہ اُس کا حقیقی مفہوم ایک منصفانہ محاکمہ ہے ان سطور میں قدیم تعلقات کا پاس، شاعر کی بزرگی کا احترام، اور کہنہ مشقی و شہرت کمال کا دبدبہ کارفرما نہیں بلکہ جو کچھ بھی لکھنے کی کوشش کی جائیگی وہ ایک بے لوث تنقید کے مقصد کو انجام دینا ہوگا۔

تعارف اور ابتدائی حالات زندگی نہ حضرت ثاقب قزلباش کسی رسمی تعارف کے محتاج ہیں، نہ آنکے ابتدائی سوانح حیات پر مولانا شاکر حسین صاحب نکہت

سہسوانی کے مقالہ کے بعد جو شامل دیوان ہذا ہے مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت!
میرزا صاحب موصوف کی ادبی ہستی اور شاعرانہ عظمت نے نیلے ادب میں کافی
نمود اور شہرت حاصل کر چکی ہے، انکا الہامانہ کلام ملک کے موقر جرائد اور
ادبی رسائل کے ذریعہ سے اہل نظر کی نگاہ کا سرمہ بصیرت بن چکا ہے اسلئے
اُنکے ادبی کارنامے اب رسمی تعریف و تعارف سے بالکل بے نیاز ہیں، میرزا
اپنی عمر تیر کر چکے انھوں نے قدیم اسکول شاعری میں نشو و نما پائی اور جدید
اسکول شاعری کی بہاریں دیکھیں، اردو شاعری ہی نہیں بلکہ ہماری آنیوالی
نسلیں اُنکی اس عدیم المثال ہستی پر ہمیشہ ہمیشہ ناز کرینگی اور انکا کلام ان تمام
خصوصیات کا آیندہ بھی حامل پایا جائیگا جو گزشتہ و موجودہ تغزل کا طرہ
امتیاز ہے۔

ماحول مشاطہ را بگو کہ براسباب حسنِ یار ؛ چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

ایک نقاد نے کیا خوب کہا ہے :۔

"جدید رنگ تغزل کے نشر و اشاعت سے پیشتر قدیم اردو شاعری کا آخری
دور، جو معیار مذاق ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، پستی تخیل، سوقیانہ طرزِ ادا"

اور عریانی جذبات کے لحاظ سے اُس کا نہ صرف ایک مجموعۂ مزخرفات بلکہ اخلاق
سوز ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے لیکن اسکے ساتھ ہی جدید مذاق ادب کے
علم برداروں کی قواعد فن سے بیگانگی کے ساتھ، کورانہ تقلید نے جو ہنگامہ
برپا کر رکھا ہے وہ بھی ذوق سلیم کے لئے کچھ کم قابلِ تاسف نہیں، گویا نئی زمانا
شعر ایک لفظی گورکھ دھندے کا نام ہے جس میں چند خاص انداز کے بہ شکوہ،
رنگین اور ترنم خیز الفاظ کو، کچھ فارسی کی دور از کار تراکیب کے ساتھ مخلوط
کرکے ایک طلسم فریب تیار کر دیا جاتا ہے جس کی سطحی دل کشی عام منظر کو
چاہے جس قدر مسحور کرے لیکن جوہر شناس نگاہوں میں اس کا ہر لفظ میرزا
غالب کی زبان میں اپنی بے مائگی معنویت پر اس طرح صرف ماتم نظر آتا ہے

"آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا"

حضرت ثاقب کی شاعری عہد قدیم و جدید دونوں سے تعلق رکھتی ہے،
دوسرے الفاظ میں اگر ایک طرف اُنکی شمع فکر کی ابتدائی ضو فشانیوں نے ایشیائی
شاعری کے دور آخر کی بزم سخن کو شبستان تجلی بنایا تھا تو اُنکے کمال کا آفتاب نصف النہار
انہی ضو بار شعاعوں سے عصر جدید کے افق کو مرکز انوار بنا سے ہوئے ہے۔ آپکا

کلام ہردو اسکول شاعری کے محاسن کا جامع ہے اور آپ کے ذوق صحیح نے جو شاہراہ ابتدائے مشق سخن سے قایم کی ہے وہ جس قدر قدیم شاعری کی ضرب المثل بدمذاقی سے دور ہے اسی قدر عصر جدید کی بے راہروی سے بھی علیحدہ ہے

میرزا کی ساری عمر قریب قریب لکھنؤ میں کٹی، انھوں نے اپنی آنکھوں سے کس کو نہیں دیکھا، اُنکے عہد طفولیت کے نامور اساتذہ، اسیر، برق، بحر، قلق، امیر، جلال، شمشاد، عشق، اُنس، بقا، تعشق، رشید، کامل، سب ہی تھے، اسوقت لکھنؤ کے مذاق سخن پر دو متضاد قوتیں کام کر رہی تھیں، ناسخ کو تہہ خاک ہوئے تقریبًا نصف صدی گزر چکی تھی، ناسخیت ذی علم شعرا کے کلام پر اپنی تمام سحر کاریوں کے ساتھ کار فرما تھی، دوسری طرف سوقیانہ طرز ادا نے غزل کو اسقدر سبک کر دیا تھا کہ وہ آخر کار اہل نظر کی نگاہوں سے گر گئی اور ایسی پھیکی پڑی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسکی چاشنی رخصت ہو گئی، آخرالذکر قوت غلبہ پذیر ہوتی جاتی تھی؛ ور دنیا اس رنگ شاعری پر، پروانہ وار ٹوٹی پڑتی تھی، ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں جو شاعر پیدا ہوگا وہ متذکرہ بالا کشا کش سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، میرزا صاحب کے

دیوان میں جابجا ایسے اشعار ملیں گے جو بالکل ناسخ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں مثال کے لئے ملاحظہ ہو:۔

صفحۂ دل داغ حسرت کا رہینِ ناز تھا ۔۔۔ صبح تھی اور صبح پر خورشید نور انداز تھا

گردشِ چشمِ فسوں ساز اور علیٰ کا گماں ۔۔۔ یہ وہ جادو تھا کہ جو صورت کشِ اعجاز تھا

شمشیر و سر کی لاگ فقط میرے دم سے ہے ۔۔۔ سارا ہوا کا کھیل ہے موجِ حباب میں

زخمِ جگر سے ابروے قاتل نے چال کی ۔۔۔ دل تک شگاف دیکھ کے چھوٹا اس ہلال کی

غیر کی امداد سے چمکے نہیں اہلِ کمال ۔۔۔ نام کو روغن چراغِ طورِ سینا میں نہ تھا

مینا سے مے ہوا مجھے ہر خوشۂ عنب ۔۔۔ جس پھول پر نگاہ پڑی جام ہوگیا

کچھ انھیں اشعار پر موقوف نہیں میرزا صاحب کے کلام میں بہت زیادہ ناسخیت جلوہ گر نظر آئیگی لیکن لطف یہ ہے کہ آپ کے مذاق فطری نے رنگ تغزل کے لئے اپنی سحر بیانی سے درد اور سوز و گداز کی وہ لذت کلام میں پیدا کر دی ہے جس نے ناسخ کی شعلہ فشانی کو بجھا دیا اور یہی میرزا کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے، آپ کا کلام "از دل خیزد بر دل ریزد" کا پورا پورا مصداق ہے حضرت ناسخ بلاشبہہ استاد مسلم الثبوت اور کامل فن تھے، اُردو زبان اُنکا

احسان عظیم ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا میرزا صاحب کا کلام بھی
انھیں محاسن شاعری سے آراستہ ہے اور ضرور ہونا چاہئے تھا، مابہ الامتیاز
محض اسقدر ہے کہ ناسخ مرحوم کا کلام بے اثر اور سوز و گداز سے،
جو صنف غزل کی روح رواں ہے اکثر معرا ہے، اور میرزا صاحب کے کلام میں
یہ جوہر قریب قریب ہر شعر میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے، البتہ آپ کے کلام
میں جہاں ناسخ کا رنگ زیادہ گہرا ہو گیا ہے وہاں اثر اور مزہ جاتا رہا ہے،
بہرکیف یہ ماحول کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے جو میرزا صاحب ہی نہیں بلکہ انکے تمام
معاصرین کے لئے ناگزیر تھا اور کوئی بھی اس سے اپنے دامن کو بچا نہ سکا۔
میرزا صاحب کے دیوان میں گنتی کے چند اشعار ایسے بھی ملیں گے
جو اُن کے کلام کے ارفع مدارج پر نظر کرتے ہوئے اسقدر پست اور گرے
ہوئے ہیں کہ نہ معلوم وہ دیوان میں کیونکر جگہ پا سکے، میرزا صاحب ان اشعار
کو نہایت آسانی کے ساتھ خارج کر سکتے تھے اور ملک کے سامنے ایسا کلام پیش
کر سکتے تھے جو یکساں ہونے کے اعتبار سے اُنکے مخصوص انداز شاعری کو نمایاں
کرتا لیکن غالباً اسکی وجہ یہ ہو کہ میرزا صاحب ان اشعار کو پیوند دیوان کرنے

میں یہ دکھانا چاہتے ہوں کہ ان کا سا ذوق سلیم رکھنے والا شاعر لکھنؤ کی مسموم ہوا سے اپنے دامن فکر کو محفوظ نہ رکھ سکا اور مقتضائے زمانہ نے ان سے ایسے شعر کہوا کے چھوڑے، یہ ہیں وہ اشعار جو نقادوں کی نگاہوں میں خار کی طرح کھٹکتے ہیں لیکن وہ کیا کریں لکھنؤ کی بزم سخن سچ پوچھئے تو اس عہد میں بھی اس بے کیف رنگ شاعری پر سر دھنتی ہے ملاحظہ ہو۔

خفا کیوں ہو جو پیغام قضا اب تک نہیں آیا — بُرے دل سے تمھیں خود کو سنا اب تک نہیں آیا

غیرونکو دکھایا مرا دل کھول کے مٹھی — مجھ سے دم پرسش یہ کہا اور ہی کچھ ہے

تڑپا دیا دل گوندھ کے گیسو شب وصلت — میں جانتا تھا بیٹھ یہ پھولونکی چھڑی ہے

کیوں مرے سینے سے اُٹھئے پھیر کر مجھ پہ چھری — ناتواں ہے دل مگر یہ بار رہنے دیجئے

صاف کہہ دیجئے وعدہ ہی کیا تھا کس نے — عذر کیا چاہئے جھوٹوں کو مکرنے کے لئے

دیر پا ہے کس قدر ثاقب حسینوں کا شباب — عمر بھر اپنی جوانی کی قسم کھاتے رہے

ممکن ہے کہ دیواں کے مطالعہ کرنے میں میرزا صاحب کے کچھ شعر ایسے بھی ملیں جو عرف عام میں معنی بند کہلاتے ہیں لیکن ان اشعار سے میرزا کے فطری مذاق پر کوئی حرف نہیں آسکتا کیونکہ ممکن ہے کہ میرزا نے دیدہ و دانستہ ایسے

اشعار کہے ہوں کہ جنکے معنی غور و خوض کے بعد واضح ہوں جیسا کہ فارسی و اُردو
کے مستند اور مسلم الثبوت شعراء کے کلام میں موجود ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی
تخئیل کسی خاص بحر میں واضح طور سے نمایاں نہ ہوسکتی ہو، کیونکہ بحر اور قافیہ و ردیف
کی پابندی شاعر کے لئے نہایت سخت منزل ہوتی ہے اس وجہ سے بھی تخئیل،
الفاظ کے ذریعہ سے کافی نہیں ہوتی کہ واضح ہوسکے، غرض کہ میرزا صاحب ہی
کے کلام میں ایسی تعقید نہیں پائی جاتی بلکہ تمام شعراء کامل الفن کے کلام میں
کچھ نہ کچھ ایسے اشعار ضرور ملتے ہیں چنانچہ اس قسم کے چند شعر ذیل میں درج کئے
جاتے ہیں:-

انقلاب آکر مدد دیتے ہیں استعداد کو — کروٹیں بدلیں لہو نے اور انساں ہو گیا

کوئی بلند تمنا بھی فرعِ ہمت ہے — کسی زبان پہ آئی نہ آرزو میری

میں سخت جاں نہیں خنجر بھی تیز ہے لیکن — نگاہ یاس ہی قاتل کی تیز دستی ہے

انتظار دید میں تقسیم الفت ہے محال — راستہ کیا انکا چہرہ ہے، کہ دیکھا کیجئے

فرقت کا بزم الفت پر کچھ اثر نہیں ہے — او جانے والے دل ہی رہگزر نہیں ہے

دل مردہ کبھی جینے کا طلبگار نہ تھا — ہوشیاری کو سمجھتا تھا یہ ہشیار نہ تھا

شاعرانہ زندگی | میرزا صاحب کی شاعرانہ زندگی کے تحت میں بہت سے واقعات ایسے ہیں جو نہ صرف گوناگوں دلچسپیاں رکھتے ہیں بلکہ اُنکے ذیل میں بعض مائیہ نازارباب فضل وکمال کا بھی تذکرہ آجاتا ہے جو اُردو شاعری کی تاریخ میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

دہلی میں | دلّی میں ایک خاص موقع پر ہمکو قاری سرفراز حسین مرحوم سیاہ چین و جاپان سے ملنے کا اتفاق ہوا جنکی زندہ دلی ضرب المثل تھی۔ میرزا صاحب کے بڑے عقید تمند اور یار دیرینہ تھے چنانچہ اُنکے تصنیف کردہ ناولوں میں جو سنہ ۱۹۰۰ء سے قبل کی تصانیف ہیں میرزا کے اکثر اشعار جابجا نظر آتے ہیں جیسا کہ یہ شعر ؎

ہوائے عشق تھی یا صرصر فنا یارب   چراغ کس نے بجھائے ترے جلائے ہوئے

اثنائے گفتگو میں میرزا کی شاعری کا ذکر چھڑ گیا۔ مرحوم نے نہایت وجد کے عالم میں میرزا کا یہ مطلع پڑھا اور دیر تک اس کا مزہ لیتے رہے ؎

شکل ادھر آئی نظر بس عقل آدھر لاتے ہوئی   ہوش اُڑا دیتے ہیں دونوں وہ اکیلے ہوئی

اسکے بعد میرزا کی غزل کا ایک اور شعر پڑھا جو استاد ذوق دہلوی کی اس طرح میں تھا آئے ہے اور جائے ہے۔ چونکہ یہ زبان زمرۂ اہل لکھنؤ کا نہیں ہے میں نے

ازراہ استعجاب عرض کی کہ یہ کلام میرزا کا نہیں ہوسکتا! کھلکھلا کے ہنس پڑے!
اور ایک بزم حسن کا دلچسپ واقعہ جو انھیں دنوں پیش آیا تھا اور اسکے ساتھ ہی
انہی شوخیوں کا اقرار جو میرزا کو اس رنگین محفل میں لیجانے کے متعلق صیغۂ راز میں
تھیں من و عن کہہ سنایا، جہاں رنگ صحبت کو دیکھکر میرزا کو وہ مطلع جو اوپر مذکور
ہوا برجستہ نظم کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی، اس بزم رنگین میں پنڈت سری رام
آنجہانی مصنف خمخانہ جاوید بھی ذریعۂ ٹیلیفون طلب ہو کر شریک کئے گئے تھے صاحب
محفل کی فرمائش اور اہل بزم کے اصرار بلیغ سے میرزا کو یہ غزل اسی محفل میں بیٹھے بیٹھے
کہنا پڑی ہم میرزا کی بزرگ داشت کے خیال سے اس قصے کو تو نظر انداز کرتے ہیں مگر
اس غزل کے چند شعر رسالہ جامعیہ ملیہ دہلی سے نقل کرکے ناظرین کرام کی ضیافت
طبع کے لئے پیش کرتے ہیں۔

اسکے در سے روک کر مجھکو کوئی کیا پائے ہے ۔۔۔ نامرادوں کو بھی اک دن مدعا مل جائے ہے
لاکھ میں اسکو سنبھالوں پھر بھی تڑپا جائے ہے ۔۔۔ کیا کہوں اس سے، دل اسیوں کو کوئی بہلائے ہے
اک نہ اک دن آہی جائیگا ترس ظالم کو بھی ۔۔۔ دل کی صورت اب زمانہ بھی بلٹتا جائے ہے
خاطر غم تا کجا! یہ سہاں تو رات دن ۔۔۔ یا لہو دل کا پئے ہے یا کلیجا کھائے ہے

دید کے قابل نہیں ہے صورت انجام کار — تم سے کیونکر زخم میرے دل کا دیکھا جائے ہے

میں رُ روں کس لئے اور وہ نہ تڑپے کس طرح — جتنی طاقت دل میں ہے اتنا مجھے بہلائے ہے

بزم کی راحت دہی میں شمع کی محنت کو دیکھ — کیا یونہی سر کا پسینا پاؤں تک آجائے ہے

نواب طالب مرحوم اور میرزا نواب بہار الدین احمد خاں صاحب طالب دہلوی مرحوم، جو نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی کے بڑے بھائی اور فصیح الملک نواب میرزا خاں صاحب داغ دہلوی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، ٹھگی ڈکیتی کے انسدادی محکمہ میں، ملک متوسط ہند میں بعہدۂ انسپکٹر پولیس فائز تھے چھاؤنی سیہور انکا مستقر تھا۔ میرزا صاحب سے گہری دوستی تھی چنانچہ ۱۸۹۳ء میں میرزا نے مرحوم کی فرمائش پر جلسۂ احباب میں نفی البدیہہ ایک غزل کہی تھی، مکمل غزل نودستیاب نہ ہوسکی صرف چار شعر ملے ہیں جو درج ذیل ہیں: —

تحفہ رہِ غربت کا ہوں داغِ کفِ پا ہوں — وہ گل ہوں کہ میں چشمِ چراغِ کفِ پا ہوں

جادے سے الگ، خاک بیاباں سے ہم آغوش — گم کردہ منزل کا سراغِ کفِ پا ہوں

تلووں سے مرے خون یہ کہتا ہے نکل کر — میں بادہ سر جوش ایاغِ کفِ پا ہوں

خواہش ہے یہ اسے گرمیِ راہِ طلبِ دوست ‏ جلکر ہمہ تن صورتِ داغِ کفِ پا ہوں

اس واقعہ کے تقریباً چھ مہینے بعد میرزا نے ایک منظوم خط طلب مرحوم کو لکھا، یہ خط تو محفوظ نہیں لیکن جواب مورخہ دہم ماہ ستمبر ۱۹۳۳ء مجلہ خیابان لکھنؤ اشاعت ماہ دسمبر ۱۹۳۳ء میں مولنا شاکر حسین صاحب نکہت سہسوانی کے نوٹ کے ساتھ شایع ہوچکا ہے، جس کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں ملاحظہ ہو

پایا حبیبیِ صفیر کا خط ‏ ثاقبِ مہرباں تمھارا خط

طبعِ موزوں کو آزمایا خوب ‏ نظم میں خط لکھا ہے کیسا خوب

نظمِ خط پر جو میں نے غور کیا ‏ اُس سے یہ مدعا نکال لیا

طبعِ موزوں کو جب روانی ہو ‏ شعر کی ہر زمین پانی ہو

فن ہوا نظم کا تمھارا غلام ‏ خوب لکھتے ہو فے البدیہ کلام

یاں نہیں مشق شعر لکھنے کی ‏ کیا ہوا اگر کبھی غزل لکھدی

مدعا ہے کہ جب یہ خط دیکھو ‏ کچھ غلط ہو تو تم معاف کرو

ختمِ خط پر دعا یہ دل سے دی ‏ خوبیاں تم میں ہوں زمانے کی

تم سلامت رہو ہزار دن سال ‏ روز افزوں ہو عشرت و اقبال

راقم خط بس اور کوئی نہیں یا طلب یا وہی بہاء الدین
دس ستمبر ہے ابر کا جو بن یکہزار آٹھ سو ترانوے سن

الہ آباد میں یوں تو میرزا صاحب متعدد بار الہ آباد گئے اور وہاں کی ادبی صحبتوں میں شریک ہوئے لیکن فروری ۱۹۲۴ء کا واقعۂ سفر الہ آباد اُن کے شاعرانہ کیریر یعنی دورِ شاعری میں یادگار رہے گا۔

دیوان پنڈت رادھے ناتھ صاحب کول متخلص گلشن رئیس اعظم لاہور صوبۂ پنجاب نے ایک عظیم الشان مشاعرہ الہ آباد میں منعقد فرمایا تھا، رائیٹ انریبل سر ڈاکٹر تیج بہادر سپرو صدر اور سر سید محمد شاہ سلیمان صاحب چیف جسٹس ہائیکورٹ الہ آباد زینت افروز بزم مشاعرہ تھے، مصرع طرح یہ تھا ع ۔ ہمارا نالہ دل کیا کرے گا با اثر ہو کر۔ میرزا کی غزل صفحہ ۸۶ پر درج دیوان ہے۔ غزل نے جو مقبولیت حاصل کی اس کا صحیح اندازہ اسوقت ہوگا جس وقت دیوان ہذا مکمل ہو کر، سر سپرو اور سر سلیمان جیسے جلیل القدر نقادوں کے ہاتھوں میں پہونچیگا اور ہر دو بزرگوار ہماری استدعا پر میرزا کے کلام، انداز غزلسرائی اور اسکے تاثرات اور کیف وجدانی پر رائے زنی فرمائیں گے۔

الہ آباد کا نام آتے ہی نامراد ناصری کی یاد دل کو بر مانے لگتی ہے شیخ مہدی حسین ناصری ایم اے پروفیسر اور فیلو الہ آباد یونیورسٹی کا دم اس گئے گزرے زمانے میں الہ آباد کے لئے بہت غنیمت تھا، مسلم ہوسٹل کے بزم سخن کی شمع اسی ایک شخص کی ذات سے فروزاں تھی، میرزا صاحب کے مخصوص دوست، بڑے قدر شناس اور معرف کمال تھے، وہ یادگار مشاعرہ جس کی طرح، دل سے اور قاتل سے تھی، ناصری ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا، میرزا صاحب نے اس طرح میں تین غزلیں کہی ہیں! پہلی غزل جو نینی تال پہاڑ کی چوٹی پر کہی گئی اور ۱۶- نومبر ۱۹۱۴ء کو بمقام الہ آباد مسلم ہوسٹل کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی اس کا مطلع یہ ہے (ملاحظہ ہو دیوان صفحہ ۱۶۹) ؎

محبت ہو گئی تھی عشق کو اتنی مرے دل سے ۔۔۔ کہ نکلا قاتل و مقتول میں کچھ فرق مشکل سے

یہ غزل مشاعرے میں گل سرسبد تھی۔ دوسری غزل کا مطلع یہ ہے ؎

کس کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہو گا مرے دل سے

یہ وہ غزل ہے جو حامد علی حامد بیرسٹر کے مشاعرہ منعقدہ لکھنؤ ۲- اپریل ۱۹۱۵ء میں میرزا صاحب نے پڑھی تھی (ملاحظہ ہو دیوان صفحہ ۱۷۰) اس مشاعرے کے

متعلق صرف اسقدر کہنا کافی ہے کہ عہد شاہی کا تو ذکر نہیں البتہ انگریزی عمل در آمد ہونے کے بعد سے آج تک لکھنؤ میں ایسی عظیم الشان بزم سخن دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی، یہ آخری معرکہ تھا جس کی فتح کے بعد ارباب سخن نے میرزا کی غزل گوئی کے سامنے سر نیاز خم کر دیا۔

حامد مرحوم اور انکے ادبی خدمات ایک ایسا موضوع ہے جو مستقل تبصرہ اور مطالعہ چاہتا ہے ان صفحات میں اتنی گنجائش کہاں کہ قدرے تفصیل کے ساتھ بھی خامہ فرسائی کی جائے، ہم اس اجمال کی تفصیل کو بکمال حسرت سر بمہر رکھتے ہیں اگر کوئی موقع نصیب ہوا اور لکھنؤ کی آخری بزم شعر وسخن کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کا تذکرہ آیا تو حامد مرحوم کے متعلق دل کھول کے لکھیں گے۔

تیسری غزل مرزا نے ۳۔مئی ۱۹۲۳ء کو کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

اٹھاؤں شمع کو کیا حسرتؔ و ارمانکی محفل سے ترے ناوک کو پہلو سے نکالوں بھی تو کس دل سے

یہ غزل نواب سید عبداللہ خاں صاحب رئیس جانسٹھ ضلع مظفر پور کے مشاعرے میں پڑھی تھی، حسن اتفاق سے جناب میرزا صاحب ہی صدر مشاعرہ اور سکرٹیری سید حسن علی خاں صاحب تھے۔غزل صفحہ ۱۷۱ میں درج ہے۔

۱۹۲۶ء یہ سال میرزا کی زندگی میں یادگار ہے، اوائل فروری میں آپ پر ایک آفت ناگہانی آئی اور ایسی مصیبت پڑی جس نے ایک عرصہ تک دنیا و مافیہا سے بیخبر کر دیا، اسی زمانے میں تین مشاعرے پے در پے منعقد ہوئے جن میں میرزا کو با دست دگرے دست بدست دگرے کشاں کشاں جانا پڑا، ان مشاعروں میں جو غزلیں آپ نے پڑھیں وہ آپ کی قلبی حالت کی آئینہ دار ہیں

پہلا مشاعرہ لکھنؤ میں بمقام امین آباد منعقد ہوا تھا یہ یاد نہیں رہا کہ بانی مشاعرہ کون تھا، میرزا کو فکر غزل کا ہوش کب تھا، اسی صحبت میں بیٹھے بیٹھے چند شعر موزوں کئے اور پڑھ دیئے، اس غزل کا صرف ایک مطلع یاد رہ گیا ہے ؎

جب موت سے ہیں بدتر اوقات زندگی کے
گوشہ لحد کا ڈھونڈیں اب کیا کرینگے جی کے

دوسرا مشاعرہ پرتاب گڑھ میں ہوا تھا بانی مشاعرہ جناب پنڈت رادھے بہاری صاحب مصرا ایڈوکیٹ تھے، اس میں بھی محبی شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری سابق منصرم ججی کے اصرار بلیغ سے میرزا صاحب نے شرکت کی اور غزل بھی پڑھی جو دوران راہ کا نتیجہ فکر تھی ایک شعر جو مشاعرے میں نہایت مقبول ہوا درج ذیل ہے پوری غزل صفحہ ۲۲۳ میں ملاحظہ ہو ؎

جو سر پہ بلا آئی وہ غفلت ہی سے آئی　　بے سوئے ہوئے خواب پریشاں نہیں دیکھا

تیسرا مشاعرہ معیار پارٹی کی طرف سے لکھنؤ میں تھا جسکے سکریٹری محمد صاحب بہار مرحوم تھے، یہ وہ موقع تھا جبکہ افکار و حوادث کا میرزا پر ہجوم تھا، آپ نے احباب کی خاطر شکنی اس حالت غم و اندوہ میں بھی گوارا نہیں کی، مطلع اور دو شعر جو میرزا صاحب کے مصائب کا مرقع کھینچتے ہیں نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ پوری غزل صفحہ ۱۰۷ میں درج دیوان ہے:—

شام فراق کچھ نہیں آتا نظر مجھے　　چھپکر جلائیں کیوں مرے داغ جگر مجھے

چپ رہنا قید غم ہیں مگر میرے ہمصفیر　　کرتے ہیں محو نالہ کشی چھیڑ کر مجھے

قائل ہوں میں کہ محفل تقدیر تھی جواد　　حصہ ملا سبھو نکو خوشی کا مگر مجھے

مطلع غزل میں حسن طلب کا انداز نہایت پرکیف ہے، ہجر محبوب کی اندھیری رات ہے اس تاریکی میں عاشق مہجور کا دم گھٹ رہا ہے، چاہتا ہے کہ کسی صورت تھوڑی سی روشنی پیدا ہو جائے کہ فی الجملہ سکون قلب حاصل ہو چنانچہ کہتا ہے کہ اب تو کسی بات کا خوف و اندیشہ باقی نہیں رہا، میرے جگر کے داغ جو میری نگاہوں سے چھپکر مجھے جلا رہے ہیں، کیوں ڈرتے ہیں؟

سامنے آجائیں اور علانیہ اپنے کام کو انجام دیں کیونکہ رات اسقدر تیرہ و
تار ہے کہ میں کسی شے کو دیکھ نہیں سکتا۔ میرزا صاحب کا یہ مطلع بھی ازیں قبیل ہے

خوش ہو سکا نہ حالِ دلِ زار دیکھکر — جلتا ہے غیر میری شبِ تار دیکھکر

مزید لطف معنوی آخر الذکر شعر میں جو میرزا صاحب کی شوخی طبع کا نتیجہ ہے،
یہ ہے کہ حریف کو خوش ہونے کے مقام پر جلایا ہے۔ چپ رہتا قید غم میں الخ۔
اس شعر میں ان احباب خاص کی طرف اشارہ ہے جو شرکت مشاعرہ کے
لئے مُصر تھے۔

نینی تال میں | اکتوبر ۱۹۱۶ء میں میرزا گیلوسے ہاؤس نینی تال میں خان بہادر
شیخ حبیب اللہ صاحب ایم بی ای، ایم ال سی، منیجر ریاست محمود آباد کے بچوں کے
اتالیق کی حیثیت سے مقیم تھے، حسن اتفاق کہ آپ کے دیرینہ کرم نواز خان بہادر
شیخ متین الزماں صاحب جو اُس زمانے میں اسسٹنٹ مہتمم بندوبست علاقہ بہار
سے تھے اور نینی تال میں مامور تھے اسی کوٹھی کے ایک حصہ میں فروکش تھے، اُنکے
ہمراہ قاضی علی حیدر صاحب عباسی پولٹیکل ممبر ریاست بھوپال اور شیخ اشتیاق احمد
صاحب عباسی بیرسٹر لکھنؤ بھی تھے، اب کیا تھا دن رات شعر و شاعری کا مشغلہ

رہنے لگا۔ ایک رات ابر و باد کا سخت طوفان آیا اور شدید بارش ہوئی، سردی کے مارے رات بھر کسی کی پلک نہیں جھپکی، میرزا نے اس شب کی سرگزشت کو ایک قطعہ میں نظم کیا تھا، قطعہ تو دستیاب نہیں ہوا اتفاق سے مجھی مسٹر عباسی بیرسٹر کو دو شعر یاد رہ گئے تھے جو درج ذیل ہیں ؎

غضب کی رات کو طوفان ژالہ باری تھا — کہ مثل برف کے ٹھنڈے تھے عضو تن سارے
نہ آئی نیند گھڑی بھر نہ پاؤں پھیل سکے — پڑا رہا یونہی بستر پہ ٹھنڈ گری مارے

نینی تال ہی میں میرزا نے خان بہادر شیخ حبیب اللہ صاحب سے کسی وعدے کی یاددہانی میں یہ قطعہ نظم کیا تھا جو ہمکو خان بہادر شیخ متین الزماں صاحب سے حاصل ہوا ہے جسکے لئے ہم ممدوح کے شکرگزار ہیں، وہ قطعہ درج ذیل ہے:-

جنگ ہے احتیاج و غیرت میں — کل سے دونوں میں بول چال نہیں
لب ہلاؤں تو بات جاتی ہے — خامشی بھی مفید حال نہیں
مطلب دل کہا نہیں جاتا — گو دہن میں زبان لال نہیں
اٹھ پہیلیں بتائیے کیونکر — کہ سبب مجھے عادت سوال نہیں
منتظر ہے وفا کا وعدۂ عید — خود بدولت کو کچھ خیال نہیں

دو زرِ سرخ کی حقیقت کیا | دل غنی ہو تو کوئی مال نہیں
لطف منعم کا ہے جو ل جائیں | نہ ملیں تو مجھے ملال نہیں
اپنے حق کا ہے آپ سے اظہار | بے ضرورت یہ قیل و قال نہیں
تند، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہیں | اور مجھ ناتواں میں حال نہیں
بارِ خاطر ہے بادِ سرد جبل | کہ طبیعت میں اعتدال نہیں
تند تیں ہیں یہی جو سردی کی | جان جانے میں احتمال نہیں
ہو میسّر اگر بقدر کفاف | احتیاج سمور و شال نہیں
بہر سرما ہے فکرِ تن پوشی | ورنہ ثاقب حریص مال نہیں

بھوپال میں اگست و ستمبر ۱۹۱۸ء میں میرزا صاحب اپنے دیرینہ کرمفرما خان بہادر معین الملک مولوی شیخ متین الزماں صاحب جو اُس زمانے میں وزیرِ مال ریاست بھوپال تھے مہمان ہوئے، سر سید لیاقت علی خاں صاحب ایم اے سابق مشیر المہام رو بکاری خاص عرصہ سے آپ کے کلام کے شیفتہ اور دلدادہ تھے، اکثر شام کے وقت قیم بنگلہ میں تشریف لاتے اور میرزا صاحب کے کلام سے لطف اندوز ہوتے۔

نواب صمد یار جنگ بہادر (معتمد حیدر آباد دکن) اُس زمانے میں بھوپال کے پولیٹیکل سکریٹری تھے، نواب صاحب میرزا صاحب کے کلام کے اسقدر گرویدہ ہوے کہ پہروں کلام سنتے اور جی نہ بھرتا، آخر کار آپ نے میرزا صاحب کے اعزاز میں ایک پر تکلف ضیافت دی جس میں اعیان ریاست شریک تھے، طعام سے قبل نواب صاحب ممدوح کی صبیۂ شیر خوار، انّا کی گود میں میرزا صاحب کو سلام کرنے کی غرض سے باہر بھیجی گئی اور ساتھ ہی تاریخ ولادت کی بھی فرمائش ہوئی کھانے کے دوران ہی میں میرزا صاحب نے تاریخی مصرعہ کہکر حاضرین کو سنا دیا اور دوسرے دن قطعہ تاریخ مکمل کر کے نواب صاحب کی خدمت میں بھیجدیا بعد کو یہ اصرار ہوا کہ قطعہ میں صاحبزادی کا نام بھی آجاے، اس قطعہ کی بحر میں نام کی گنجایش نہ تھی لہذا اُسی وقت دوسرا قطعہ کہکر پیش کیا گیا، ہر دو قطعات درج ذیل ہیں :-

مبارک ہو یہ دختر آپ کو عبدالصمد صاحب ۔۔۔ خدا رکھے ہے کیسی پیاری پیاری آپ کی لڑکی

سعادتمند ہے اللہ طول عمر دے اس کو ۔۔۔ جہاں میں ہو بڑی اقبال والی آپ کی لڑکی

زکی النفس ہو، صاحب ہنر ہو، خوش سلیقہ ہو ۔۔۔ یہ مانگی لاڈلی، میری بھتیجی آپ کی لڑکی

بڑی منحس مگر بڑی پاکیزہ خو ہو، حسن نظر کہئے ۔۔۔ خود اچھے آپ ہیں، کیوں ہو نہ اچھی آپ کی لڑکی

تاریخ ولادت بزبان کلکِ ثاقب یہ ‏ ‏ دھنی قسمت کی ہو اور نیک آئی آپ کی لڑکی
۱۳۲۶ ہجری

دیگر

یہ دخترِ نیک خو صمد صاحب کی ‏ ‏ ٹکڑا ہے جگر کا دل کا اک پارا ہے
میلاد کا سال ہے مبارک ثاقب ‏ ‏ فرخ سلطان یہ جمال آرا ہے

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری یہ وہ زمانہ تھا کہ اُردو کا فاضل ادیب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ایم اے، پی ایچ ڈی، مولف "دیوان غالب نسخہ حمیدیہ" بقید حیات تھے میرزا کے پہونچتے ہی بھوپال میں دن رات شعر و شاعری کے چرچے ہونے لگے، شام کی ملاقاتیں اکثر بزمِ سخن بن جاتیں لیکن میرزا صاحب کے زمانہ قیام بھوپال میں جتنی شعر و سخن کی صحبتیں ہوئیں ان سب کی روح رواں ڈاکٹر مرحوم ہی تھے۔

میرزا صاحب نے بھوپال میں بہت سی غزلیں اور نظمیں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی فرمائش پر کہیں جو میرزا صاحب کے بیشتر کلام کے ساتھ ضایع ہو گئیں صرف ایک نظم محفوظ رہ گئی ہے جس کا عنوان "صفت الربیع" ہے اور دیوان ہذا کے صفحہ ۲۸ پر ملے گی۔

ایک دن ڈاکٹر مرحوم کی صحبت میں شیخ علی حزیں کا یہ شعر پڑھا گیا ؎

مشکل شد است کار دل از عشق و خوشدلم — شاید رسد بخاطر مشکل پسند تو

میرزا صاحب نے برجستہ اسی خیال کو اردو زبان میں نظم فرما دیا ملاحظہ ہو ؎

گتھیاں جو دل میں تھیں ہم نے دکھایا تھا انہیں — ہر گرہ پر سر جھکایا ناخن تدبیر نے

میرزا دربار بھوپال میں

اسی زمانے میں جنگ عظیم کی فتح کا جشن ہوا، ہر ہائینس علیا بیگم صاحبہ جنت آرام گاہ نے ایک پارٹی دی جس میں ریزیڈنٹ بہادر سیہور بھی شریک ہوئے، میرزا کو بھی شرف باریابی عطا ہوا اور حکم ہوا کہ اس موقع پر ایک نظم بھی پڑھیں، میرزا نے ضیق وقت کے باعث بارہ تیرہ شعر کا ایک قطعہ تاریخ اس فتح عظیم کے متعلق نظم کیا اور ہنگام خواندگی ہز ہائینس مرحومہ کی مدح وثنا میں ایک نظم پڑھکر چند رباعیاں اور وہ قطعہ پڑھا۔ ہز ہائینس اور ریزیڈنٹ بہادر نے متفقہ اظہار مسرت فرمایا بلکہ ریزیڈنٹ بہادر نے تو یہ جملہ نظمیں اور رباعیاں میرزا صاحب سے مانگ ہی لیں افسوس ہے کہ یہ کاینات بھی تلف ہو گئی۔

ہز ہائینس حضرت سکندر صولت افتخار الملک نواب محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر، بی اے (علیگ) جی سی ایس آئی، جی سی آئی ای، کے سی آئی اے، فرمانروائے بھوپال خلد اللہ ملکہ کی مدح میں بھی میرزا نے ایک پرجوش نظم کہی تھی

جو ایک موقع پر نواب صاحب مدظلہ کے حضور میں پڑھی گئی اور پیش کی گئی تھی، کاش یہ نظم بھی دستیاب ہو جاتی۔

کم و بیش دو ماہ تک میرزا کا قیام بھوپال میں رہا کہ ناگاہ آپ کو مرض انفلوئنزا لاحق ہوا اور بادل ناخواستہ بھوپال کو خیر باد کہکر لکھنؤ واپس آئے اور چھ ماہ تک صاحب فراش رہے، پھر مکروہات زندگی نے دوبارہ سواد بھوپال دیکھنے کا موقع نہ دیا۔

کلکتہ میں نواب حیدر یار جنگ بہادر مولٰنا سید علی حیدر طباطبائی مغفور کی آمد پر سفارت خانہ ایران میں ایک مختصر سی بزم سخن منعقد ہوئی جس میں ضیق وقت کے باعث شعرا کو دو دن سے زیادہ فکر غزل کا موقع نہیں ملا، نواب نصیر الممالک میر مشاعرہ تھے اور اُنکے خویش نواب مونس الدولہ بہادر جنگی زبانی یہ واقعہ ہمارے گوش گزار ہوا شریک بزم انشاد تھے۔ مصرع طرح یہ تھا ع دور ساغر نے کیا بزم میں بیہوش مجھے، میرزا صاحب کی غزل جو حاصل مشاعرہ تھی صفحہ ۱۲۸ پر ملاحظہ فرما کر آپ بھی لطف اندوز ہوں، دیوان میں تصنیف غزل کی تاریخ غلط چھپی ہے یہ واقعہ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء کا ہے۔

۲۱ مارچ ۱۹۱۸ء کو جبکہ آپ من جانب سفارتخانہ ایران قصیدہ خوانی

کی صحبت میں بغرض شرکت مدعو کئے گئے تھے، میرزا نے معرکہ آرا قصیدہ کہا تھا جو بیحد مقبول ہوا، اسی موقع پر آپ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کی بزم سخن میں ہنگام غزلخوانی بعض مخصوص شعرائے باکمال کا ذکر ایک رباعی میں کیا ہے جو درج ذیل ہے۔ یہ صحبت محض میرزا کا کلام سننے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ رباعی ملاحظہ ہو۔

دل محوِ ثنائے شانِ کلکتہ ہے　　ممنونِ سخنورانِ کلکتہ ہے

وحشت، حافظ، نشاط، رعب و زجور　　خمسہ یہی روح و جان کلکتہ ہے

بدیہہ گوئی گزشتہ صفحات میں جابجا ایسے مواقع پیش کئے گئے ہیں جن میں میرزا نے اپنی فی البدیہہ قوت نظم کا ثبوت دیا ہے، کہتے ہیں کہ کہنہ مشقی سے زود گوئی حاصل ہوتی ہے، یہ غلط ہے، نظم نام ہے تخیلات کے تسلسل کا، دوسرے الفاظ میں قوتِ متخیلہ پر زود گوئی کا دارو مدار ہے۔ میرزا صاحب کی قوتِ متخیلہ و متصورہ ہر وقت مصروف کار رہتی ہے اور اب اس پیرانہ سالی کا تو ذکر نہیں ابھی چند سال قبل تک تو انکا راستہ چلنا بھی خطرناک تھا، وہ ہر وقت اپنے خیالات میں اسقدر مستغرق رہتے ہیں کہ بعض اوقات جب سڑک پر اُنکے قریب سے موٹر یا کوئی دوسری سواری گزر جاتی ہے تو انکو خبر نہیں ہوتی، ایک دو

مرتبہ نہیں بلکہ متعدد بار انکو حادثات پیش آسے اور صدمات پہونچے، اس امر کے تذکرے سے صرف آنکی زبردست قوت متخیلہ کا اظہار مقصود ہے اور بس۔

دسمبر ۱۸۹۷ء میں ایک دن شب کے وقت بمقام قیصر باغ لکھنؤ حضرت امیر الدولہ راجہ سر محمد امیر حسن خاں بہادر جنت آرام گاہ کے حضور میں، شیخ محمد جان شاد لکھنوی (پیرو میر) غزلسرائی فرما رہے تھے، مطلع غزل یہ تھا۔

نہ جان کر گل بازی بہت اچھال کے پھینک ۔۔۔ یہ دل ہے شیشے سے نازک ذرا سنبھال کے پھینک

میرزا بھی حاضر دربار تھے بیچین ہو گئے، بعد ختم غزل باجازت جناب شاد مرحوم آپنے برجستہ یہ مطلع نظم فرما کر پڑھا جس کو نہ صرف جناب راجہ صاحب خلد آشیاں بلکہ خود حضرت شاد نے بھی بہت پسند فرمایا ؎

لگی ہے آگ تو سینے سے دل نکال کے پھینک ۔۔۔ ادھر بھی لوگوں کی بستی ہے دیکھ بھال کے پھینک

ایک دن کا واقعہ ہے کہ ریاست محمود آباد میں کسی نے یہ مطلع پڑھا ؎

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے ۔۔۔ ہم راتوں کو اٹھکر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

سید غلام عباس صاحب تحصیلدار ریاست کا بیان ہے کہ میں نے میرزا صاحب سے فرمایش کی کہ ایسا ہی کوئی دردناک خیال نظم فرمائیں۔ موصوف نے یہ چار شعر برجستہ

کہکر سناے جو درج ذیل ہیں۔

بند تھیں آنکھیں مگر دل گریہ وزاری میں تھا　　　خواب میں بھی تھا وہی عالم جو بیداری میں تھا

نذر غم دل تھا تو میں کیونکر بچا لیتا جگر　　　درد بھی مہمان مری تقریب بیماری میں تھا

"تقریب بیماری"، یہ ترکیب اضافی بالکل نئی ہے۔

سبزہ گلشن سے کیوں خایف نہ ہوتا باغباں　　　کیا فقط اک آسماں پوشاک زنگاری میں تھا

مارگزیدہ از ریسماں می ترسد کی مشہور مثل کو نظم کیا ہے، میرزا کا یہ شعر بھی اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے ملاحظہ ہو ؎

ڈر گیا ہوں اسقدر ہجراں کی شام تار سے　　　بند کر لیتا ہوں آنکھیں سایہ دیوار سے

رات کا سناٹا اس شعر میں قابل ملاحظہ ہے، جس کو سنکر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ؎

تنہا ہے دعا، شب وہ ڈرانی ہے کہ توبہ!　　　بیٹھا ہے کسی امن کے گوشے میں اثر بھی

ہم نے کب دنیا سے منہ پھیرا نہ یہ کچھ کھل سکا　　　عالم غفلت بھی میرا کیف ہشیاری میں تھا

آخرالذکر شعر نے ہمکو میرزا کا وہ شعر یاد دلایا جو انھوں نے حضرت بیخود دہلوی کے دیوان (گفتار بیخود) کے قطعہ تاریخ طبع میں نظم فرمایا تھا ؎

دل کو اندیشوں نے غفلت میں بھی رکھا ہوشیار　　　رات دن فکر دنیے کی ہے اس چمن کی دیکھ بھال

مکرمی سید ماجد علی صاحب بی اے، اسسٹنٹ گورنمنٹ اڈیٹ و کیٹ الٰہ آباد
کے ہاں ایک رنگین صحبت میں ایک غزل میرزا نے پڑھی تھی جس کا مقطع یہ ہے ؎

ادعائے پارسائی کیا ہوا ثاقبؔ کہ آج
یہ الٰہ آباد یہ رندانہ محفل اور آپ

پروفیسر ناصری مرحوم کی زبانی جس کو تقریباً دس سال کا عرصہ ہوا معلوم ہوا تھا
کہ یہ غزل میرزا نے اسی محفل میں سفے البدیہ کہی تھی جو صفحہ ۷۷ میں درج دیوان ہے
خان بہادر شیخ حبیب اللہ صاحب کی کوٹھی واقع حضرت گنج کے برآمدے
میں چند بارہ سنگوں کے سرہائے بریدہ زیب دیوار ہیں اُنکے منجھلے صاحبزادے شیخ
عنایت حبیب اللہ عرف منجھو صاحب نے اپنے استاد محترم جناب میرزا صاحب
سے کوئی خیال ان سروں کے متعلق نظم میں ظاہر کرنے کی فرمایش کی یہ واقعہ ۱۹۳۴ء
کا ہے آپ نے برجستہ یہ مطلع کہا ؎

کچھ نہ پوچھو حال اپنا کشتۂ تقدیر ہیں
موت نے کھینچا ہے جس کو ہم وہی تصویر ہیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تاسیس تعمیر جدید کے متعلق میرزا نے برجستہ یہ مطلع کہا
تھا جو اکثر ارباب دہلی کے ورد زبان ہے ؎

مکانِ منعم کا سونے سے یہ خون دل سے مبتلا ہے
خس و خاشاک کا گھر بھی بڑی مشکل سے بنتا ہے

ابھی حال میں میرزا صاحب کے مخصوص دوست ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب پروفیسر شعبہ ریسرچ طبیہ کالج قرول باغ دہلی نے انکو تقویت اعضائے رئیسہ کے لئے کوئی نوایجاد دوا دی تھی جسکے شکریہ میں میرزا صاحب نے یہ قطعہ ارشاد فرمایا۔

سلیم الزماں نے دوا دی ہے ثاقب　　جو اکسیر ہے بہرِ عود جوانی

یہاں گوشۂ قبر دل ڈھونڈتا ہے　　کہ ہے تلخ تر موت سے زندگانی

سال گزشتہ کا ذکر ہے کہ چودھری عرفان حسین صاحب ایم اے ال ال بی (علیگ) خلف اکبر چودھری احسان حسین صاحب تعلقدار سبیحہ ضلع بارہ بنکی نے ایک سردتا حسب فرمایش جناب میرزا صاحب کی خدمت میں پیش کیا اسکے شکریہ میں یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ سردتا جو بعد یک مدت　　لائے ثاقب کے واسطے عرفان

تیز اتنا ہے جس نے دم بھر میں　　کاٹ دیں انتظار کی گھڑیاں

نظم بعنوان "غروب آفتاب" جو ماہ جنوری ۱۹۰۹ء میں بعض طلاب مدرستہ العلوم علی گڈھ کے پاس خاطر سے کہی گئی تھی چند گھنٹوں کا نتیجۂ فکر ہے اسیطرح جبکہ میرزا صاحب نومبر ۱۹۱۵ء میں مبتلاے رمد چشم و ثبور الاجفان ہوکر

کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ میں کرنل لسٹر (معالج خصوصی امراض چشم) کے زیر علاج تھے، کرنل موصوف کی فرمایش پر نظم "کحل الجواہر" کرب مرض کی حالت میں کہی تھی جو آئی ڈپارٹمنٹ میں زیب دیوار ہے۔

غزلیات مشمولہ دیوان میں، متدرذیل غزلیں بھی میرزا صاحب کی قلم برداشتہ افکار کے نتائج ہیں جن میں سے اکثر سر مہاراجہ محمود آباد جنت آرام گاہ کے حضور میں حسب فرمایش کہی گئی تھیں۔ ان غزلیات کے مواقع تصانیف کا تذکرہ چونکہ طوالانی ہے لہذا ہم اجمال پر قناعت کرتے ہیں۔

وار تیغ نگہ قہر کا چلتا ہی رہا (صفحہ ۶۳) جاں بلب پا کے مجھے آپ کا غصا اترا (صفحہ ۶۶) خفا کیوں ہو جو پیغام قضا اب تک نہیں آیا (صفحہ ۶۶)۔ آج طرح میں دکو سنا، قافیہ مشروط تھا۔ منت کا آنا برا کیا ہو گیا (صفحہ ۶۸) آئنہ ہے سرنوشت زندگی ہر ہاتھ میں (۱۱۷) آپ اُدھر و عدے کی شب سو رہے (صفحہ ۱۳۳) تیر مجھ پر ہی ستمگر کی چھری ہوتی ہے (صفحہ ۱۳۴) آتا ہے کہ ساون کی گھٹا اور ہی کچھ ہے (صفحہ ۱۳۴) غش بھی آیا مری پرسش کو قضا بھی آئی۔ (صفحہ ۱۴۰)۔ روتے روتے شام ہوئی ہے کب تک اشک بہا ئنگی صفحہ ۱۳۵

تاریخ گوئی | میرزا کو فن تاریخ گوئی میں بھی خاص ملکہ ہے، تاریخ گوئی ایک مستقل آرٹ یعنی فن ہے، اُردو زبان نے ایسے شعرا بھی پیدا کئے ہیں جنھوں نے اپنی تمام عمر فقط تاریخ گوئی میں صرف کر دی، لکھنؤ کے قدیم اسکول شاعری کے بانی شیخ امام بخش ناسخ صنعت تاریخ گوئی کے استاد تھے اور زندگی بھر تاریخیں کہتے رہے، میر کی تاریخ وفات ع واویلا مرد شہہ شاعراں۔ ناسخ ہی نے کہی تھی جو ۱۲۲۵ ہجری
آج تک ضرب المثل ہے۔ ناسخی اسکول کے ہر فرد نے تاریخ گوئی کو من حیث الفن حاصل کیا، اور اس صنف کلام پر مفاخرانہ طبع آزمائیاں کیں، میرزا نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں ہر چھوٹا بڑا شاعر تاریخ گو تھا، میر مونس مرحوم فرماتے ہیں ؎

مرثیہ گو بھی ہوں، شاعر بھی، مورخ بھی ہوں   کیوں نہ چاہوں میں سخنداں میں اعزاز اپنا

فن تاریخ گوئی نے یہاں تک ترقی کی کہ ہر شادی و غم کے موقعوں پر تاریخ کہنے کا دستور عام ہوگیا تھا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

میرزا کی تاریخیں بھی اسی قبیل کی ہیں جن میں سے بعض فے البدیہ اور اُنکے قادر الکلام ہونے کا بیّن ثبوت ہیں، ہم اس سلسلے میں اُن پر بھی ایک سرسری

نظر ڈالیں گے۔

کھگرا اسٹیٹ ملک آسام کے جنگل میں ۲۵ راپریل ۱۹۰۸ء کو میرزا صاحب نواب معین الدین حیدر میرزا بہادر کے ہمراہ رکاب مصروف شکار تھے، نواب صاحب کی گولی سے ایک شیر مارا گیا، میرزا نے برجستہ یہ تاریخ کہی۔

کہئے، نواب فلک قدر نے مارا اک شیر۔ ۲۷ راپریل کو نواب نے پھر
۱۳۲۶ ہجری
ایک شیر مارا، میرزا نے اسی وقت یہ دوسری تاریخ کہی۔

بہادر نے کیا دوسرا شیر مارا
۱۳۲۶ ہجری

سر مہاراجہ محمود آباد جنت آرامگاہ کی خوشنودی مزاج کے خیال سے ایک مولوی صاحب کے دو توام بچے پیدا ہونے کی میرزا نے برجستہ یہ تاریخ کہی جس کو سنکر مرحوم و مغفور بے انتہا خوش ہوے اور میرزا کی ذہانت اور ذکاوت کی تعریف کی۔

دو شاخ شرع بر آمد ز دانہ گندم
۱۹۰۹ عیسوی

سید نذیر حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر کے عقد نکاح کی جو اس زمانے مہاراجہ صاحب اعلے اللہ مقامہ کے پرائیوٹ سکریٹری تھے قلم برداشتہ

یہ تاریخ کہی۔

خوشا نصیب کہ دولھا بنے نذیر حسین | پری نثار اس آئینہ وار چہرے کے
صبا کا دل بھی نچھاور ہوا سنیئے تاریخ | کھلے جو آٹھویں شعبانکو پھول سہرے کے

فرخ آباد کے مشاعرے میں جبکہ شعرا مصروف غزل خوانی تھے، مولوی آغا شہر صاحب ایم اے پروفیسر فارسی و اردو گورنمنٹ کالج جھانسی اور سید افتخار حسین صاحب اڈیشنل جج کی تحریک پر میرزا نے برجستہ ایک نواب صاحب کو خطاب خان بہادر ملنے کی دفعتہً خبر موصول ہونے پر یہ تاریخ کہی۔

ہوا اعزاز نوابی کا ہمسر منصب خانی۔
۱۳۳۶ ہجری

قاری سرفراز حسین مرحوم ذکر فرماتے تھے کہ میرزا نے اپنے محترم دوست حضرت بیخود دہلوی کی فرمائش پر انھیں دنوں ایک چہار سالہ بچے کے وفات کی یادگار تاریخ برجستہ کہی تھی جو نہایت بے تکلف ہے ملاحظہ ہو۔

معصوم محو خواب ہے کنج مزار میں۔
۱۳۳۵ ہجری

سر مہاراجہ محمود آباد جنت آرامگاہ کو نائیٹ کا خطاب ملنے کی تاریخ جو بقول استادی حضرت جالب مرحوم سابق مدیر روزنامہ ہمدم حد اعجاز پر فائز ہے

صفحہ ۲۵۷ میں درج دیوان ہے مصرعہ بہادر حکمراں کو کب ہند یہ تاریخ سہارنپور
میں کہی گئی تھی جبکہ آپ سید جعفر عباس صاحب ایم اے، ال ال بی (علیگ)
کے مہمان تھے اور مرحوم کے بعہدہ ہوم ممبر فائز ہونے کی تاریخ درج ذیل ہے۔

امارت حلّہ پوش کارسازی وزارت ہے
۱۹۲۱ عیسوی

سید وحید الدین احمد خاں بیخود دہلوی کی معرفت میرزا کو مثنوی گلزار اعظم
موصول ہوی، اس مثنوی میں فخر الدولہ کپتان نواب اعزالدین احمد خان بہادر
متخلص اعظم خلد آشیاں رئیس لہارو نے شہنشاہ نورالدین جہانگیر اور نورجہاں
بیگم کی داستان عشق و محبت کے وہ واقعات نظم فرمائے ہیں جو سینہ بسینہ
چلے آتے ہیں میرزا نے اس مثنوی کی رسید اور شکریہ میں یہ قطعہ لکھ بھیجا ملاحظہ ہو

کیجئے گلزار اعظم کے محاسن کیا بیاں   رونمائی میں جو لے ہر قلب سے صبر و شکیب
گلفشاں ہے خامۂ ثاقب پئے تاریخ سال   نوبہارِ حسن ہے یہ مثنوی دلفریب
۱۳۴۴ ہجری

خطیب اعظم شمس العلماء مولٰنا مولوی سید سبط حسن طاب ثراہ کی
ذات والاصفات سے میرزا کو کمال خلوص اور حسن عقیدت تھا مولٰنا کی وفات پر
جو قطعات تاریخ انھوں نے اپنی حالت بیماری میں جبکہ وہ خود صاحب فراش تھے

نظم فرماسے ہیں آنکے مطالعہ سے نہ صرف میرزا کے قلبی اضطراب و کرب کا انعکاس ہوتا ہے بلکہ دیرینہ تپاک و رسم محبت بھی مترشح ہے۔ تاریخیں صفحہ ۲۴۴ میں درج ہیں۔

۱۲ ستمبر ۱۹۳۵ء کو بزم اردو شملہ نے ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا جس میں میرزا کو بھی باوصف گوشہ نشینی اپنے قدیم کرمفرما ملک غلام محمد صاحب ایم اے، ال ال بی (علیگ) ڈپٹی ڈائریکٹر پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف کے اصرار بلیغ سے شرکت کرنا پڑی۔ میرزا صاحب نے ایک قطعہ تاریخ اس بزم سخن کے متعلق برجستہ نظم فرمایا تھا، مشاعرے کی صدارت آنریبل خان بہادر نواب مظفر خاں صاحب سی آئی ای وزیر مال حکومت پنجاب نے کی تھی۔ اس مشاعرے میں میرزا کا کلام اسقدر مقبول ہوا کہ آنریبل نواب صاحب موصوف نے ایک نقرئی تمغا اور عالی جناب بابو رام چندر صاحب سی آئی ای، ایم بی ای، آئی سی ایس، جوائنٹ سکریٹری سررشتۂ تعلیم حکومت ہند نے ایک پارکر فونٹین پن، اور جناب سید احمد حسین صاحب مالک مسرس شیخ حسین بخش اینڈ کمپنی شملہ نے ایک خوش نما ٹی سٹ عطا فرمانے کا اعلان فرمایا۔ عالی جناب خان بہادر مولوی عبدالحکیم صاحب سپرنٹنڈنٹ کمانڈران چیفس ہاؤس ہولڈ شملہ بھی شریک بزم مشاعرہ تھے

جو میرزا کے کلام سے بغایت متاثر ہوئے۔

میرزا دیگر اصناف سخن میں اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ میرزا کی شاعرانہ عظمت کا راز غزل گوئی میں نہاں ہے، لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دیگر اصناف سخن پر قادر نہیں وہ فارسی کے بھی شاعر ہیں اور اُردو کے بھی اس وقت اُنکا فارسی کلام زیر بحث نہیں ہے ہمکو صرف اُنکے اُردو مجموعہ کلام سے غرض ہے، میرزا نے ایک معقول تعداد میں قصائد بھی کہے ہیں جن میں بعض معرکہ آرا ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اُنھوں نے ان قصائد کو زیب دیوان کیوں نہیں فرمایا غالباً اسکی یہ وجہ ہے کہ یہ جملہ قصائد مدح ائمہ واہلبیت میں ہیں اور عقائد میں ڈوبے ہوئے ہیں، رباعیات کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے لیکن دیوان میں ایک رباعی بھی شامل نہیں البتہ ایک قطعہ تاریخ جو رباعی کی بحر میں نظر آتا ہے صفحہ ۲۵۸ میں درج دیوان ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

آں سرِ دَرِ جسم شکوہِ محمود آباد ۔۔۔ شُد پیرِ دِسُنّتِ خلیل یزداں

چند نظمیں جو شامل دیوان ہیں مختلف فرمائشوں پر کہی گئی ہیں اور شاعرانہ نقطہ خیال سے، بلند تخیئل اور لطافت بیان میں امتیازی حیثیت رکھتی ہیں خصوصاً

وہ نظمیں جو "لعل الجواہر"، "ذکر عیش تصف عیش"، اور "غروب آفتاب" کے عنوان پر کہی گئی ہیں۔

"انیس"، اس عنوان پر آپ کی ایک نظم رسالہ ادب میں شائع ہو چکی ہے جو بفرمائش مکرمی سید علی عباس صاحب حسینی ایم اے استاذ تاریخ گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ کہی گئی تھی چونکہ یہ نظم میر انیس مرحوم کی خدمت میں خراج عقیدت کی شان رکھتی ہے لہذا ہم اس کو درج ذیل کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

یہ جو ہے اُردو زبانِ رائج ہندوستاں — ہے رہینِ منتِ نطقِ انیسِ نکتہ داں

چال میں اسکی ہو سب اُس ماہرِ فن کا چلن — یہ زلیخا ہے عزیزِ یوسفِ مصرِ سخن

جتنے وہ زیور ہیں جنپر دل ہیں سب آئے ہوئے — اس زباں میں ہیں اُسی ماہر کے پہنائے ہوئے

صنعتِ رنگیں سے پھولا گلشنِ ہندوستاں — نغمہ صوت ہزار ایک اور یہ اُردو زباں

مر چکے ہیں وہ مگر دل شاد کرتی ہے انھیں — جب نکھرتی ہے کبھی تو یاد کرتی ہے انھیں

پھول چھوڑے ہیں بہت دامن میں بھرنے کیلئے — راستہ ہو صاف رہرو کے گزرنے کے لئے

جس کو آتا ہی تہ ہو چلنا وہ منزل کیا چلے — جو زباں چلتی ہو وہ پہچانکر رستا چلے

دم بخود تا ریگ میدانوں میں ہمکو چھوڑکر — خضر آگے بڑھ گیا نقشِ قدم کو چھوڑکر

گورنمنٹ کالج فیض آباد کے مشاعرہ منعقدہ ۱۱ر جنوری ۱۹۳۶ء کے لئے بحالت شدائد امراض، میرزا صاحب نے دوران راہ میں جو طرحی غزل اور چند متفرق اشعار کہے اور مشاعرے میں پڑھے تھے درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

عیاں ہو رنگ روئے خستہ جاں سے | وہ کیفِ غم جو باہر ہے بیاں سے
جہاں میں حادثات ناگہاں سے | کہیں خود بھی خطر میں ہے مکاں سے
یکایک دل پہ بجلی سی گری تھی | اٹھا تھا کچھ دھواں جب آشیاں سے
مرا سر زیرِ خنجر تھا کہ اُس نے | خود اپنا ہاتھ کھینچا امتحاں سے
نہیں سنتے وہ میرا قصۂ غم | مگر ہاں اُس میری کی زباں سے
فسونِ عشق پھونکا گوشِ دل میں | ستمگر نے ادائے جانستاں سے
اضافہ کچھ نہ ہو اپنے یقیں میں | اگر اُٹھ جائے پردہ درمیاں سے
جب اُن پر دل کی حالت آئنہ ہے | تو خاموشی ہی بہتر ہے فغاں سے
یہاں دم بھر کا جینا بھی ہے دوبھر | کوئی خوش ہو گا عمرِ جاوداں سے
خلافِ عقل ہے اس غمکدے میں | توقع عافیت کی آسماں سے
وہ مے جس سے منور ہو گیا دل | اُٹھے پیکر خراباتِ مغاں سے

بہت شانہ ہلایا حادثوں نے — مگر چونکے نہ ہم خواب گراں سے
کسی کے سامنے کیونکر کہا جائے — خود اپنا حال دل اپنی زباں سے
سراسر دفترِ عالم ہے رنگیں — فقط میری تمہاری داستاں سے
بہے بہتے ہوے دریا کی آواز — وہیں جانا ہے آئے تھے جہاں سے

ہوی رشکِ گلستاں بزم احباب
کلام ثاقبِ رنگیں بیاں سے

شیام گور کم کہوں کہانی — گرا نیُن ، نین بن بانی
ترجمہ۔ میں سانولا یا گورا کیونکر کہوں — زباں بے آنکھ اور آنکھ بے زبان ہے

یہ ہندی زبان کا ایک مشہور و معروف دوہا ہے جس کا مفہوم اس خمسہ میں میرزا صاحب نے بہ تعمیل ارشاد عالی جناب کنور سید حسن مہدی صاحب خلد اللہ العالی خلف الصدق حضرت سر راجہ سید ابو جعفر صاحب بہادر جنت آرامگاہ والی ریاست پیرپور ضلع فیض آباد نظم فرمایا ہے ملاحظہ ہو۔

بصارت فطرۃً عاجز بیاں سے — زباں نور بصر لاے کہاں سے
اگر دل ہاتھ اٹھائے درمیاں سے — بیاں آنکھوں کے دیکھے گا زباں سے

نہیں ممکن ہے پوچھو نکتہ داں سے

اس کے نیرنگ کا تماشا ہوں — جز فریبِ نگاہ میں کیا ہوں

عشق میں دل گنوا کے حال یہ ہے — کچھ میں کھویا ہوا سا رہتا ہوں

پرسشِ حال اس نے کی تو مجھے — یہی کہتے بنا کہ اچھا ہوں

دل تھا غم کا فسانہ خواں نہ رہا — اب کوئی لطفِ داستاں نہ رہا

ہم کہیں کس سے اور سمجھے کون — جب کوئی اپنا ہم زباں نہ رہا

ماہ جنوری ۱۹۳۶ء میں میرزا صاحب نے برادر معظم مولوی سید محمد حسین صاحب ایم اے، ال ال بی، (علیگ) لکچرر شعبہ فارسی وارد و لکھنؤ یونیورسٹی کی فرمائش پر میر و غالب کے بعض اشعار کی تخمیس فرمائی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ موضوع کے تحت میں یہ جواہر پارے نظر انداز نہ کیئے جائیں۔

دلِ شوریدہ و حزیں اپنا — دشمنِ جاں ہے بالیقیں اپنا

قصہ کوتاہ ہو کہیں اپنا — حالِ بد گفتنی نہیں اپنا

تم نے پوچھا تو مہربانی کی

بیاں میں کیفِ دردِ غم کا آنا　　بہت مشکل ہے قائل ہے زمانا
مجھے اتنا ہی تمکو ہے سنانا　　مصائب اور تھے اب دل کا جانا

عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

ذوقِ الفت خطا نہ تھی دل کی　　آپ ہی نے خبر نہ لی دل کی
"حسن منزل" اُجڑ گئی دل کی　　دیدنی ہے شکستگی دل کی

گیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

دامِ بلائے غم کے گرفتار مر گئے　　جانباز، سرفروش، وفادار مر گئے
سب رفتہ رفتہ عاقبت کار مر گئے　　تھا جنکو جنکو عشق کا آزار مر گئے

اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

قطعہ

دورِ فلک مرقع عبرت دکھا گیا　　جامِ جہاں نما میں سرِ راہ پا گیا
یہ واقعہ حیات کا حاصل بتا گیا　　کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا

یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

سودائے کبر و ناز سے خالی تھا مغز　　تھا رہرووں کی ٹھوکروں میں فرقِ تاجور

آخر زبانِ حال ہوئی خود ہی پردہ در	کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر!

میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

خوے غم دوستی عداوت تھی	نہ رہیں خوش مزاجیاں باقی

گئی وہ رات اور وہ بات گئی	آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی

اب کسی بات پر نہیں آتی

عالمِ غم کی پُر آشوب فضا سے چھوٹوں	گلشنِ دھر کی ناساز ہوا سے چھوٹوں

اپنی ہستی کو مٹا دوں تو بلا سے چھوٹوں	میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں

وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ماہ مارچ ۱۹۳۶ء میں میرزا صاحب نے یہ قطعہ تاریخ بحالت آشوب چشم اپنے آقازادہ اور مربی و محسن حضرت مہاراج کنور محمد امیر حیدر خاں بہادر مدظلہ العالی کہیں برادر جناب راجہ صاحب محمود آباد دام اقبالہ کی خدمت میں بہ تقریب تہنیت ولادت فرزند ارجمند پیش کیا تھا جو درج ذیل ہے۔

جلوہ معنی صبح آرزو شد آشکار

۱۳۵۴ ہجری

وہ مایۂ نازِ آفرینش	عنقا ہے جہاں میں جس کا ہمتا

سچ یہ ہے کہ ہے امیر حیدر — حیدر کا غلام ہیرا آقا
ممدوحِ زمانہ محسنِ خلق — خیرالاقران، فخرِ آبا
بخشا ہے خدا نے اُس کو فرزند — یوسف تمثال، ماہِ سیما
ماں باپ کے ظلِ عاطفت میں — پائے وہ حیاتِ خضر و عیسیٰ
اقبال قدم یہ جبہ سا ہو — سر پر رہے پنجتن کا سایہ
ثاقبؔ ہوا گلفشاں "تاریخ — تازہ گلِ گلشنِ تمنا
۱۳۵۴ ہجری

بفرمائش جناب سید حسن علی خاں صاحب رئیس جانسٹھ ضلع مظفر نگر۔

۲۷۔ مئی۔ ۱۹۳۶ء

یہ دونوں متحد شکلیں ہیں حسن و عشقِ کامل کی — پریشانی تری زلفوں کی حیرانی مرے دل کی
شہیدِ ناز ہو، کیا بات ایسے باوفا دل کی — خوشا وہ آنکھ جس میں کھنچ گئی تصویر قاتل کی
نہ مطلب سننے والوں سے نہ پروا رنگِ محفل کی — جہاں بیٹھے وہیں ہم نے کہانی چھیڑ دی دل کی
طریقِ عشق میں چلنے کو ہمت چاہیے دل کی — یہاں ناکامیاں ہوتی ہیں خضرِ راہ منزل کی
ازل سے دہر کا ہر خشک و تر رہنِ حوادث ہے — موافق ہیں نہ دریا کی ہوائیں اور نہ ساحل کی
خدا جانے اسیرِ غم کی حالت کیا ہے زنداں میں — بہت چپ چپ سی ہیں کچھ آتے ہیں کڑیاں سلاسل کی

کھنچا جاتا ہوں لفت میں حریم دوست کی جانب
کہ جذبِ عشقِ کامل رہبری کرتا ہے منزل کی

مرادوں کی ہزاروں کھیتیاں جلتے ہوئے دیکھیں
کبھی کشتِ تمنا سے نہ رکھ امید حاصل کی

ازل کا سوختہ ساماں تھا میں جسکو محبت نے
بنا کر شمعِ غم رونق بڑھائی اپنی محفل کی

سماں مقتل کا بعدِ قتل بھی آنکھوں میں پھرتا ہے
صفائی دیدہ کے قابل تھی دستِ نازِ قاتل کی

عجب لذت ہے بحرِ غم کی موجوں کے تلاطم میں
رہینِ منتِ ساحل نہیں کشتی مرے دل کی

اب افسردہ دلی کا رنگ ہے پیشِ نظر ثاقب
ان آنکھوں نے بہت سرگرمیاں دیکھی ہیں محفل کی

بفرمائش جناب میرزا اکرار حسن صاحب ایم۔ اے ال ال بی (علیگ) ضلع ایٹہ

۲۸۔ مئی ۱۹۳۶ء

جان کا کھیل جو اب تک نہیں دیکھا دیکھیں
تم مجھے ذبح کرو لوگ تماشا دیکھیں

دلِ غم عشق میں اٹھا ہے تماشا دیکھیں
آؤ آنکھوں سے یہ بہتا ہوا دریا دیکھیں

اک جھلک سی نظر آجاتی ہے گاہے گاہے
جب وہ صورت ہی نہ دکھلائیں تو ہم کیا دیکھیں

وہ نہ مانیں نہ سہی بات نہ کہنے کو رہے
میرے غمخوار پھر اکبار انھیں سمجھا دیکھیں

چشمِ عبرت نہیں کھلتی ہے کہ غفلت والے
موت آتی ہوئی جاتی ہوئی دنیا دیکھیں

زندگی نام اسی آفتِ تقدیر کا ہے — کہ جئیں اور عذابِ غمِ فردا دیکھیں

ظلم سے جی نہ بھرا ہو تو وہ کیوں رحم کریں — کچھ دنوں اور مجھے ہجر میں تڑپا دیکھیں

بند ہوتے ہیں دریچے نگراں آنکھوں کے — کب تک اے بھولنے والے ترا رستا دیکھیں

دیکھنے والے نشانِ کفِ پا کے تیرے — غور سے نقش مری لوحِ جبیں کا دیکھیں

کبھی مل جاتا ہے قسمت سے یہ موقع ثاقب
چند احباب کو بیٹھے ہوئے یکجا دیکھیں

میرزا کا تغزل | اُردو شاعری اور بالخصوص اُردو غزل گوئی بھی بہت بدنصیب تھی اُسکے عروج کا آفتاب نصف النہار ترقی پر اسوقت پہونچا جب سلطنت مغلیہ کے خلعت حکومت کی دھجیاں اُڑ چکی تھیں، چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستیں جو اپنے کاندھوں سے مغلوں کے جوے کو پھینک کر خود مختار و مطلق العناں ہوگئی تھیں انتزاع کے عالم نزع میں تھیں، اُنکے شیرازے بکھر چکے تھے، اُنکے اعضا و جوارح جواب دیئے تھے، انکی شان و شوکت اور کر و فر رخصت ہو چکا تھا، جس عہد میں میر نے اقلیم سخن پر کامرانی شروع

کی وہ زمانہ وہ تھا کہ دلّی اُجڑ چکی تھی غالب کے دور تک سلطنت اودھ کا ٹمٹماتا چراغ بھی گل ہوگیا تھا اور عیش پرستی، آرام طلبی، عزم وحوصلہ کی کمی، اسراف ونمائش کی زیادتی، توہم پرستی، غلامانہ ذہنیت، عمل سے اجتناب، تدبیر سے انحراف، ذہنی پستی، اخلاقی تنزل ہماری قوم کی خلقت میں داخل ہوگیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ہمارے شعرا میں سوفیانہ مذاق خیالات میں پستی، زبان میں ہلکاپن پیدا ہوگیا تھا، کم وبیش ایک صدی تک اس ابتذال کی گھٹا ہماری شاعری پر چھائی رہی، البتہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوستان کے ذہنی انقلاب کی داغ بیل پڑنا شروع ہوی اور ہمارے علوم و فنون نے جو گمنامی کی گہری نیند سو رہے تھے کروٹ لی شاعری نے بھی چولا بدلا اور اسکے ساتھ ہمارے تغزل میں بھی کیف پیدا ہونا شروع ہوا، مضامین میں آورد کے ساتھ آمد، تخئیل کے ساتھ بلند پروازی، زبان کے ساتھ سوز وگداز، سوقیت کے بجائے متانت اور سنجیدگی، عریانی کے عوض میں تہذیب نظر آنے لگی، اس انقلاب نے غزل میں ایک چیز کا اور اضافہ کیا یعنی قومی تحریکات کا اثر شاعری کی ہر صنف پر پڑا اور اس نے حسن وعشق کی حسّیات کے ساتھ جذبہ وطنیت بھی داخل کردیا جس سے قدیم اسکول شاعری کے پرستار بھی متاثر ہوے

بغیر نہ رہ سکے استادعظیم آبادی، علامہ نظم طباطبائی، ہزاکسیلنسی شاد مدظلہ وغیرہم سب کے کلام میں جدید رنگ تغزل جھلکنے لگا، ہمارے میرزا کے تغزل نے جیسا کہ ہم مقدمہ کے آغاز میں اشارہ کرچکے ہیں قدیم اسکول شاعری کے آغوش میں نشو ونما پائی تھی اور آنکھیں کھولی تھیں تو اسیر، داغ، امیر، جلال وغیرہم کو اپنی اپنی اقلیم سخن میں کامرانی کرتے دیکھا تھا لیکن انھوں نے ہماری خوش قسمتی سے عہد حاضر بھی پایا اور اپنی شاعری کے شباب کو جدید اسکول کی فضائے روح پرور میں گزارا، لہذا انکو قدیم وجدید اسکول شاعری دونوں سے گہرا تعلق رہا۔

کسی شاعر کے خصوصیات کلام کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ نکتہ ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ جو خیال کلام کے ذریعہ سے ظاہر کیا جاتا ہے وہ دو عناصر پر مشتمل ہوتا ہے ایک خارجی (انٹلکچوئل) دوسرا حقیقی یا روحانی، دماغی عنصر کو ادراک اسکی اصلی ہیئت اور متعین صورت میں ہمارے روبرو پیش کرتا ہے، لیکن روحانی عنصر دماغی عنصر سے بالاتر ہے جو ہمکو امر مظہرہ کی حقیقت کی گہرائیوں تک پہونچا دیتا ہے مثال کے لئے کسی جذبے کو فرض

کر لیجئے، چونکہ شاعر نہ صرف جذبات کی مصوری کرتا ہے بلکہ اسکی حقیقت کا بھی جویا رہتا ہے، شاعر صداقت کا متجسس اور حسن کا خواہاں ہے، لہذا صداقت وحسن کی ہم آہنگی جو غیر فانی مسرت کا مظہر ہوتی ہے شاعر کی منزل مقصود ہر اور اسکی روح کو اپنی اندرونی گہرائیوں کے ابھارنے میں سرور حاصل ہوتا ہے، جب شاعر تخئیل کے افلاک پر پرواز کرنا شروع کرتا ہے تو آخرالذکر یعنی روحانی عنصر کا سواد منزل اسکی آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے، شاعری کے کمال کا مبدا یہی بلند پروازیاں ہیں اور انہی بلند پروازیوں کی بدولت وہ انسانی زندگی کے حقیقی مطالعہ پر قادر ہو جاتا ہے۔

لیکن تخئیل کی رفعتوں کے ساتھ زبان کی سحر طرازیوں کی بھی ضرورت ہے کیونکہ جب اُسکی روح اپنی تجلی خیز اور تجلی ریز نگاہوں سے کسی چیز کا مشاہدہ کر لیتی ہے تو اُسکے دل میں اضطراب کا ایک دریا موجزن ہو جاتا ہے اور وہ بغیر اس کا اظہار کئے نہیں رہ سکتا، ادائے مطلب کے لئے زبان ہونا چاہئے اور زبان کے لئے جادو بھرے الفاظ اور الفاظ کے لئے قوت بیان وطرز ادا جو قلب سامع کو مسحور کر دے، جب یہ سب باتیں مجتمع ہو جائنگی

اسوقت کلام کا معیار ضرور بلند ہوگا، ورنہ اگر تخئیل نے صعود بھی کیا اور وہ کسی جذبہ کی جلوہ گاہ میں پہونچی بھی مگر شاعر اداے مطلب سے قاصر رہا تو وہ کلام یقیناً ناقص اور پست رہیگا اور شاعر اس سے بقائے دوام کا خلعت نہیں حاصل کرسکتا۔

اب میرزا کے کلام کا مطالعہ مذکورۂ بالا مشاہدات کی روشنی میں کیجئے اور دیکھئے کہ میرزا نے تخئیل کی بلند پروازیوں اور زبان کی سحر کاریوں پر کتنی قدرت حاصل کی ہے :-

جلوہ حسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا — میں نہیں سمجھا مگر ہاں، دل تڑپ کر رہ گیا

حادثوں کے زلزلوں سے جام دل چھلکا کیا — ایک چلّو خون ہی کیا، بہتے بہتے بہہ گیا

کونسی آتش ہوا میں جاکے ڈھونڈوں میں کہ دل — یا دھواں ہوکر اُڑا، یا اشک بنکر بہہ گیا

مجھکو یقین وعدۂ فردا ضرور تھا — مشکل یہ آپڑی تھی، کہ دل ناصبور تھا

معشوق کے وعدے کا یقین نکرنا اسے معاذ اللہ! مذہب عشق میں گناہ عظیم ہے قائل کہتا ہے کہ مجھے محبوب کے وعدے کا یقین واثق تھا مگر دل کی بیچینیوں اور بے صبریوں نے عجب کشمکش میں ڈال دیا کہ سکون و قرار کی حالت

قائم نہ رہی اور اس قلیل مدت ہجر کا صدمہ قابل برداشت نہو سکا جس کا انجام
یہ ہوا کہ مجھے دوسرا دن دیکھنا نصیب ہی نہ ہوا۔ اس مطلب کو ایک فارسی شاعر
نے بھی خوب کہا ہے۔ عجب نہیں کہ میرزا کا خیال اسی شعر سے مستنبط ہو ؎

وعدۂ وصل بفردا دہی و می دانی　　ہر کہ امروز ترا دید بفردا نرسد

اے آہ سرد اس میں ترا کیا قصور تھا　　ٹھنڈا ہو دل یہ سوز محبت سے دور تھا

ابتداءً یہ مطلع اس صورت میں کہا گیا تھا ؎

کافور کا نہ شمع کا کوئی قصور تھا　　ٹھنڈا ہو دل یہ سوز محبت سے دور تھا

شمع جسکو موم تبی بھی کہتے ہیں موم اور کافور سے مرکب ہی کافور کا مزاج
چوتھے درجہ میں سرد ہے اسکی خاصیت ہے کہ جلنے کی حالت میں خود بھی ٹھنڈا رہتا ہی
اور اپنے ساتھ جلنے والی چیز کو بھی ٹھنڈا رکھتا ہی۔ اس صورت میں موم پر یہ الزام عائد ہوتا ہی کہ اُس نے
ہنگام سوزش کافور کی برودت کا اثر کیوں قبول نہیں کیا اور کافور پر یہ الزام ہی کہ اس نے اپنی
فطری خاصیت یعنی ٹھنڈک سے کیوں کام نہیں لیا مگر حقیقت میں دونوں بے قصور ہیں جیسا کہ
شاعر نے اس مطلب کیطرف اشارہ کیا ہی پس لامحالہ دونوں کو ایک حالت میں جلنا پڑا اور کافور کا
سرد مزاج کچھ کام نہ آیا۔ احباب کے اختلاف رائے سے کہ معنی بعید الفہم ہیں میرزا کو یہ مصرع

مجبوراً بدلنا پڑا جس سے جدت ادا مفقود ہوگئی اور یہ پُر مغز مطلع ایک سطحی خیال اور
معمولی سی بات ہوکر رہ گیا۔

مری داستانِ غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں ۔۔۔ کچھ انھیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا

دل پارہ پارہ مجھکو کوئی یوں تو دفن کرتا ۔۔۔ وہ جدھر نگاہ کرتے اُدھر اک مزار ہوتا

خوش ہے صیاد نشیمن مرا جل جانے سے ۔۔۔ مجھکو بتلاے وہ آباد جو ویران نہوا

ایک صیاد کسی طائر کا آشیانہ پھونک کر خوش ہو رہا ہے اور اظہار مسرت
کر رہا ہے، بے زبان جانور اپنی کمزوری اور بے لبسی کے باعث انتقام کی
قدرت نہیں رکھتا۔ چاہتا ہے کہ ظالم کو آیندہ اس ظلم سے باز رکھنے کے لئے
تہدید کرے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ حسب قانون معینہ قدرت گھر تو بگڑنے کے لئے
بنایا ہی جاتا ہے۔ یہ حادثہ دنیا میں کوئی نئی بات نہیں ہے، جو آیا ہے سو جائیگا
اور جو بنا ہے وہ ایک دن بگڑ کر رہیگا مگر میری خانہ خرابی پر صیاد کا ہنسنا اور
خوش ہونا فعل عبث و بے معنی ہے کیا وہ کسی ایسی لبستی کا نشان دے سکتا ہے جو
کبھی ویران نہوئی ہو۔ کیا اچھی اور کسی قدر سچی بات کہی گئی ہے۔ در پردہ جسکے
یہ معنی بھی ہیں کہ جس طرح میرا گھر اجڑا ہے صیاد کا گھر بھی اسی طرح ویران اور برباد

ہوجائیگا" کہ کر دنیا فت "، مشہور مثل ہے۔ یہ شعر فلسفہ اخلاق کا درس آموز ہے
شریک قید تھے جذبات دل گریہ کا   قفس تھا ایسا کہ نالوں کو راستا نہ ملا
قائل کہتا ہے کہ میرے لئے قید خانہ اس وضع کا بنایا گیا تھا کہ میں تو کیا
میری آواز بھی اسکے باہر نہ جا سکے پس وہ تمام و کمال جذبات جو ضروری الاظہار تھے
میرے دل ہی میں رہ گئے اور دنیا اُن سے مستفید نہ ہو سکی، یہ شعر اپنی نوعیت
میں منفرد اور اثرات میں ڈوبا ہوا ہے بیچارے سقراط کے ساتھ تو یہ سلوک روا
رکھا گیا تھا کہ اس نے تا دم مرگ تعلیم و تلقین کا سلسلہ جاری رکھا و اسے یہ حال
اس بدنصیب قیدی کے حس کو اتنا موقع بھی نہیں دیا گیا کہ وہ اپنے دلی خیالات
اہل دنیا پر ظاہر کر سکتا۔

دل سے میں کہہ رہا ہوں تجھ پر ہوا فدا میں   دل تجھ سے کہہ رہا ہے، او بیخبر! جلا میں
تڑپا دیا ہے دل کو شاباش ہمصفیرو!   یونہی پھر اک صدا دو، ٹوٹا قفس، چلا میں!
وہ نزع کی خموشی، جام جہاں نما تھی   اک عمر کی کہانی، دم بھر میں کہہ گیا میں
پھر اور کس طرح سے اجڑے مکاں کو سجتا   قصر لحد میں آکر تصویر ہو گیا میں
قوت غم دیکھ، زور ناتوانی پر، نہ جا   زلزلے عالم میں تھے، جب دل مرا بیتاب تھا

یہ شعر میرزا کا شاہکار ہے، کسی کمزور یا ناتوان مظلوم کو دیکھکر یہ سمجھ لینا کہ وہ ظلم کرنے والے کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، خدا کی قدرت کاملہ اور اسکی جلالت قدر کا انکار کرتا ہے، اس کا فلسفہ یہ ہے کہ بے بسی اور مجبوری کی حالتوں میں ستم رسیدہ کی قوت متخیلہ اسی ایک سب سے بڑی قوت کی طرف منجر ہو جاتی ہے جسکے تحت عمل میں کائنات عالم کا ہر جز و کل ہے، مظلوم جس قدر زیادہ کمزور اور بے بس ہوگا اسی قدر اسکی قوت ارادی زور دار اور اس کا نالہ با اثر ہوگا جیسا کہ اس مشہور شعر سے مترشح ہے سے

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن اجابت از در حق بہر استقبال می آید

دل تو داغوں کے لئے ہوتا ہی لیکن غم یہ ہے ہوکے داغی کس لئے ملبوس رعنائی رہا

اس شعر میں جدت معنی سے کام لیا گیا ہے، تکمیل حسن دل کے لئے بغیر داغ عشق اٹھائے ہوئے ممکن نہیں ہے جس قدر کثیر تعداد میں عشق کے داغ دل پر نمودار ہونگے اسی قدر اس کا حسن پایۂ تکمیل کو پہونچیگا۔ چنانچہ قائل اسی مفہوم پر برنبائے مذاق طبع زمانہ روشنی ڈالکر اظہار تاسف کرتا ہے، کہتا ہے کہ ملبوس رعنائی یعنی حسن کی پوشاک کو داغدار نہ ہونا چاہئے تھا؛ کیونکہ دھبے دار لباس

تومعیوب سمجھا جاتا ہے نہ کہ مستحسن، اس ضمن میں اہل عرب کی ایک رسم یاد آگئی جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

حسن بھی انسان کے لئے وجہ آلام و مصائب ہوا کرتا ہے، عرب کا عہد جہالت اپنے گوناگوں واقعات کی بنا پر تاریخی دلچسپیوں سے خالی نہیں ہے، کہتے ہیں کہ قدیم الایام میں عرب کی حسین عورتیں اپنے حسن و جمال کی وجہ سے گرفتار کرلی جاتی تھیں، وحشی اور نفس پرست قبائل کے ظالمانہ حملوں اور چیرہ دستیوں سے انکو محفوظ رکھنے کے لئے سوائے اسکے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ انکے خوبصورت چہروں کو گود کر حسن کی دلکشی کم کردی جائے، اسطرح حسین چہروں کو داغی بنانے کی رسم جاری ہوئی انجام کار یہی داغ عصمت و عفت کے ضامن و شاہد ہو گئے اور داغدار چہرہ والی عورتیں قابل احترام اور حسین سمجھی جانے لگیں، اب اسی شعر کو پھر ایک مرتبہ پڑھکر لطف اندوز ہوجئے۔

مٹا جو کوئی ٹکڑا اس چرخ زبرجد میں پیوند لگا دیتا ہیں نفس مجسر دیر

یہ خیال میرزا صاحب کا طبع زاد اور بالکل اچھوتا ہے، جو اسوقت تک نظر سے نہیں گزرا، فرماتے ہیں کہ میرا نفس ناطقہ اسقدر عالی حوصلہ اور بلند ہمت ہے کہ

کہ وہ زمین کی مادی چیزوں سے رشتہ جوڑنا پسند نہیں کرتا بلکہ عالم بالا کے کسی روحانی
جزو کا متمنی ہے اگر وہ مل جائے تو اُس سے رشتہ قایم کرے مگر عالم امکان میں
کہیں اس کا جوڑ نظر نہیں آتا۔

یہ ایک وادیِ پُر خارِ عشق تھی ثاقب   اُلجھ کے رہگئی ہر دل میں گفتگو میری

رموزِ عشق کو سمجھنا فہم و ادراکِ بشری سے باہر ہے، عشق کا مقام خاصتہً دل
ہے، قائل اپنی پیچیدہ تقریر کو "وادی پُرخار عشق" سے تعبیر کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اربابِ
دانش بھی میرے کلام کی غایت اور اُسکی تہ تک نہ پہونچ سکے جو اُنکے دلوں میں
اسطرح چبھکر رہگیا ہے جسکی خلش اُنکو ہر وقت بیچین رکھتی ہے وہ بار بار میری
باتوں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہر مرتبہ قاصر رہتے ہیں، قریب قریب
اسی مفہوم کو میرزا غالب مرحوم نے اس شعر میں نظم فرمایا ہے ؎

آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے   مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

ہاتھ اُٹھے تھے مجھی پر اسے اب سمجھا ہیں   روح کو کھینچ لیا ہے تری انگڑائی نے

دل نازک متحمل نہیں غم ہو کہ سرور   پھول مقتول ہے خود اپنی ہی رعنائی کا

میں تو ہوں مارا ہوا دل کا اگر شک ہو تو آپ   اور اسی صورت کا اک بیمار پیدا کیجیے

یہ شعر میرزا صاحب کے آیات کمال میں سے ہے، خیال اسقدر بے مثیل اور اچھوتا ہے کہ جیّد اساتذہ کے دواوین اسکے جواب سے خالی نظر آتے ہیں! محبوب کو اپنے کمال حُسن پر غرّہ ہے، عاشق صادق اس خیال کو اسکے دل سے دور کرنا چاہتا ہے، محبوب پر اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے ایک ایسا عجیب و غریب پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے جو دنیائے شاعری میں خود اپنی مثال ہے۔ اثرات حسن ہر قلب پر یکساں نہیں ہوا کرتے اس مطلب کو میرزا نے یوں کہا ہے ؎

جو ایک طرح تھی تاثیر حسن دوست تو کیوں ۔۔۔ تمام بزم میں میرا ہی دل تپاں ہوتا

جو آنکھ ہو تو دیکھئے، نہ پوچھیے کہ کیا کیا ۔۔۔ چراغ بزم ہو گیا، جلا کیا، ہنسا کیا

اسکی رحمت پہ گرے پڑتے ہیں عصیاں والے ۔۔۔ حشر کا ہے کو ہے، اک جلسۂ رندانہ ہے

روز محشر کے اجالے میں کھلا میرا لہو ۔۔۔ تم تو تم دھبا ہے دامان شب فرقت پہ بھی

یہ شعر بھی میرزا کا شاہکار ہے اور بالکل انوکھی بات کہی گئی ہے۔ شب فراق کے وسیع دامن پر خون بیگناہ کے داغ اور دھبّے نظر آنا سوائے صبح محشر کے اجالے کے ممکن ہی نہیں تھا۔ ندرت خیال کی تعریف حد توصیف سے باہر ہے، محبوب پر اگر قتل کا الزام عائد ہے تو شب ہجر بھی اسی لپیٹ میں آئی

جاتی ہے اور اعانت مجرمانہ کی مرتکب قرار پاتی ہے۔

بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا   مکان وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لئے

یہ شعر سہل ممتنع ہے "تھوڑی سی روشنی کے لئے" یہ فقرہ جو حقیقت میں دل کے لئے نشتر و خنجر کا کام دیتا ہے، شاعر کے اعجاز نما کمال فن پر دال ہے قائل ارباب ذی ہمت اور اہل کرم سے ہے، کہتا ہے کہ دنیا بڑی ناقدر شناس ہے میری عمر بھر کی محنت کا سرمایہ اسقدر بے حقیقت سمجھا گیا کہ نہایت حقیر کام کو انجام دینے کے لئے بیدریغ تلف کر دیا گیا۔ اگر یہ متاع گرانمایہ کسی اہم اور بڑے کام میں صرف کی جاتی تو مجھے اپنی خانہ بربادی کا افسوس نہ ہوتا۔ جیسا کہ میرزا صاحب مندرجۂ ذیل شعر میں زیادہ وضاحت کے ساتھ اسی مطلب کو ادا فرماتے ہیں ؎

گلہ نہ ہوتا مجھے آگ کے لگانے سے   چراغ خانۂ دشمن جو آشیاں ہوتا

دیکھ میرے دل کو تو اے منکر اعجاز عشق!   گر نہیں سکتا ہے بادہ اور شیشہ چور ہے

خود اسکا حسن میری یاد خواہی ان سے کرتا ہے   وہ آئینہ لئے ہیں اور مجھکو یاد کرتے ہیں

یہ جادہ ہائے عشق ہیں انھیں کا میں اسیر ہوں   نہ حال پوچھئے مرا، لکیر کا فقیر ہوں

محاورے کے بامحل صرف نے مفہوم شعر کو آسمان پر پہونچا دیا، گویا محاورہ

اسی جگہ کے لئے وضع کیا گیا تھا۔

صدائیں دیکے ہم نے ایک دنیا آزما دیکھی — یہی سنتے چلے آئے بڑھو آگے یہاں کیا ہے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

یہ شعر اس غزل کا ہے جسکے متعلق حضرت نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب حسرت شروانی مدظلہ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بھرے مشاعرے میں جبکہ وہ صدر محفل تھے یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے کہ

میرزا صاحب اس غزل کی بدولت آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں — ابر سیاہ، جانب گلزار دیکھ کر

پتھر نہیں، کہ طور کے وار آزمائے جائیں — اے برق حسن! حال دل زار دیکھ کر

کہتے ہیں دل لگی، مری شام فراق کو — اچھا یونہی سہی مگر اکبار دیکھ کر

قید غم بھی دل لگی ہے ہنسنے والوں کیلئے — عندلیب آکر قفس میں اک تماشا ہو گئی

کس کو شوق دید بیتابی نہیں — دل نہ ٹھہرا اک تماشا ہو گیا

وہی رات میری وہی رات انکی — کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے

یہ شعر سہل ممتنع ہے جسکے طرز ادا پر میر صاحب کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔

لوٹنے والے ہماری نیند کے   رات بھر کس چین سے سوتے رہے

یہ بھی سہل ممتنع ہے، ایک تو خود محبوب کا خواب جوانی دوسرے
عاشق کے لوٹے ہوئے مال غنیمت کا اس پر اضافہ ان دونوں نے باہم
مل جل کر محبوب کو رات بھر محو خواب شیریں کر دیا اور عاشق کے حال زار
سے بیخبر رکھا بھلا اس گہری نیند میں نالہ و فریاد کی آواز کیونکر کانوں تک پہونچتی۔

اندھیرے میں وہ سوجھی یہ نہ سوجھی   تری شب ہے، مری شب کچھ نہیں ہے

نہایت بلیغ اور پر لطف شعر ہے، قائل کہتا ہے کہ شب کی تاریکی میں تجھے
اپنی ہی رات نظر آئی میری رات نہیں سوجھی یعنی تجھے اپنے آرام و آسایش کا تو
احساس ہو مگر میری تکلیفوں کا جو تیری مفارقت میں مجھے رات بھر جھیلنا
پڑینگی کچھ بھی خیال نہ آیا، تاریکی میں دو ہمرنگ اور ہم شکل چیزوں میں سے ایک کا
نظر آنا اور دوسری کا نظر نہ آنا نہایت بدیع بات ہے، مثل مشہور ہر کہ اپنے مطلب پر سب
کی نظر ہوتی ہے۔

غم زندگی جابجا ہو رہا ہے   ارے مرنے والو یہ کیا ہو رہا ہے

عشق میں دل گنوا کے حال یہ ہے   کچھ میں کھویا ہوا سا رہتا ہوں

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ... ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ہچکیوں سے راز الفت کھل گیا ... آگئی منھ پر جو دل میں بات تھی

یہ ہے بہتے ہوئے دریا کی آواز ... وہیں جانا ہے آئے تھے جہاں سے

سراسر دفترِ عالم ہے رنگیں ... فقط میری تمھاری داستاں سے

سو گیا بالائے بستر جاگ کر ... خواب میں قسمت مری بیدار تھی

ملا کے دست دعا ظرف اک بنایا ہے ... لئے ہوں ہاتھ میں کاسہ، خدا کرے بھر جائے

دونوں ہاتھوں کو ملا کر کیا خوب کاسۂ گدائی کی صورت بنائی ہے جو ہمارے خیال میں بالکل انوکھی اور نئی ہے۔ اور حسن تعلیل کی صنعت انھیں مواقع پر لطف دیجاتی ہے۔

بڑھائی جس نے تری نیند مجھکو تڑپا کے ... وہ میری عمر گزشتہ نہ تھی کہانی تھی

زندگی کا استعارہ افسانے سے تو کوئی نئی بات نہیں ہے مگر انداز بیاں کے ساتھ حسن تعلیل قابل تعریف ہے، قائل کہتا ہے کہ میری عمر گزشتہ ایک افسانہ تھی جس نے مجھے ہر لحظہ بیتاب اور بیقرار رکھا اور محبوب کی نیند میں اضافہ کر کے اسکے لئے راحت و آرام کا سبب ہوئی جس سے وہ ہمیشہ میری طرف سے

غافل رہا، اس شعر میں جو کیفیت سوز و گداز انداز بیان کی جدت اور لطف زبان کی سحر کاریاں ہیں اس سے دل بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔

خوف محشر کس لئے آنکھوں کو دھوکا ہوگیا — ایک ہی صورت کے ہونگے میرا قاتل اور آپ

مجمع حشر میں ایک مقتول اپنے قاتل کو پہچانکر دامنگیر ہوتا ہے، قاتل کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں اور خوف باز پرس سے لرزہ براندام ہوجاتا ہے، کہتا ہے کہ خدا کے واسطے کیوں مجھے اس مجمع عام میں رسوا اور بدنام کرنا چاہتے ہو، میں تمھارا قاتل نہیں ہوں کوئی دوسرا ہوگا تمھاری نگاہ چوک گئی اور اس نے دھوکا کھایا، مقتول اسکے جواب میں عرض کرتا ہے کہ اچھا تو پھر آپ ڈرتے کیوں میں یہی سہی کہ میرا قاتل آپ کا ہم شبیہ ہوگا۔

کہنے کو مشت پر کی اسیری تو تھی مگر — خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا

بولتا ہوا چمن محاورے میں داخل نہیں۔ جناب میرزا صاحب کا تصرف ہے قائل کہتا ہے کہ دیکھنے میں تو میں ایک چھوٹا سا حقیر جانور ہوں لیکن میری قدر اور عظمت کا اندازہ اس وقت ہوا جبکہ میں گرفتار دام ہوگیا اور میرے بعد وہ چہل پہل جو میری نغمہ سرائیوں کی بدولت گلشن میں رہتی تھی یک قلم

موقوف ہو گئی اور ہر طرف سناٹا نظر آنے لگا، قدر ہر نعمت است بعد زوال مشہور مثل ہے

میں زوز ا ہوا ج دل کو تو بکسی کے لئے وگر نہ موت تو دنیا میں ہو سبھی کے لئے

حادثہ مرگ ہر متنفس کے لیئے ناگزیر ہے، مرنے والے پر آہ وزاری اور نوحہ و ماتم کا اصلی سبب اُن اغراض و مفاد کا فوت ہو جانا ہے جو متوفی کی ذات سے اسکی حیات میں حاصل تھے، اسی فلسفہ کو میرزا صاحب نے مذکورۂ بالا شعر میں نظم فرمایا ہے۔

دامن یوسف جنھوں نے مصر میں دیکھا نہ تھا کیا نظر آیا جو اُسکی دھجیاں دیکھا کئے

زمانے کا دستور ہے کہ نیکیاں دبائی جاتی ہیں اور برائیاں اُبھاری جاتی ہیں جب تک حضرت یوسف پر کوئی الزام نہ تھا اور انکا دامن عصمت صحیح و سالم تھا تو کسی کو اسکے دیکھنے کا شوق پیدا نہوا لیکن جب وہ زلیخا کے ہاتھوں چاک ہو گیا تو ایک دنیا تماشائی نظر آنے لگی۔

فرقت کا بزم الفت پر کچھ اثر نہیں ہے او جانے والے! دل ہی! یہ رہگزر نہیں ہے

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ مرور زمان اور تمادی ایام مسرت و غم کو بھلا دیتے

ہیں مگر معاملہ عشق اس قاعدے سے مستثنیٰ ہے چنانچہ اس شعر میں بھی یہی اصول ذکر کیا گیا ہے کہ عشق و محبت کا اثر جو دل عاشق پر ہوتا ہے اس کا نقش ایسا دائمی ہے کہ ہجر و مفارقت اسے کسی طرح مٹا نہیں سکتی، دوسرے مصرعہ میں ہجران نصیب عاشق اپنے معشوق سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ دل عاشق کوئی رہگزر نہیں ہے کہ انسان جب راہ سے نکل گیا تو تھوڑے عرصہ کے بعد نقش پا کا بھی پتہ نہیں چلتا بلکہ نقوش محبت دل عاشق پر ایسے پائدار ہوتے ہیں کہ جو مٹائے نہیں مٹ سکتے محصل کلام یہ ہے کہ عاشق صادق معشوق پر اس امر کو ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ جب تو میرے دل میں سما گیا تو اب نکل نہیں سکتا یہاں حضوری غیبت ایک حکم میں ہیں۔

چراغ عقل بھی گل ہو شب غم کی سیاہی سے ۔۔۔ نہیں معلوم ہوتا ہوں نہ تو معلوم ہوتا ہے

یہ کتنے زخم تھے گھٹنے پہ جنکو داغ کہتے ہیں ۔۔۔ ہر اک جا دامن دل پر رفو معلوم ہوتا ہے

اک نیا دل ظلم سہنے کو بنانا چاہیئے ۔۔۔ ہو تو سکتا ہے مگر اس کو ترمانا چاہیئے

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی ۔۔۔ میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

اب کچھ نہیں بن پڑتا مانگوں کہ نہ مانگوں میں ۔۔۔ بےحس ہوا جاتا ہے دل جنبش ساغر سے

میرزا کے خصوصیات میرزا کے کلام کے پُرسکون مطالعہ کے بعد جو مقناطیسی یا جاذبانہ قوتیں نظر جوہر شناس کی جولانیوں کے راستے کو روک کر اپنی طرف کھینچتی ہیں وہ انکے کلام کی متانت، سادگی، صداقت اور بالخصوص جدت ادا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شعر جب تک تصنع کے بے اصل اور نمائشی بناوسنگار سے مبرا نہو گا اس میں کیف واثر پیدا ہی نہیں ہو سکتا، میرزا جو کچھ کہتے ہیں بے تکلف کہتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ اُنکا کلام سامع کے قلب پر اپنا پورا پورا اثر کرکے رہتا ہے، اس سادگی میں جو چیز سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے وہ سلاست اور روانی ہے جس سے موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ شعر کیا ہے ایک دریا بہتا ہوا چلا آتا ہے فلسفیانہ حقایق کی گتھیاں لکھنؤ کے سلیس روزمرہ اور اس پر لطف یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے عام فہم دلکش الفاظ میں اسطرح حل ہوتی چلی جاتی ہیں گویا کوئی عقدہ یا الجھاؤ تھا ہی نہیں، بیشتر اشعار اس حد اعجاز پر فایز ہیں کہ نظم و نثر میں امتیاز بھی آسان نہیں اور اسی کو سہل ممتنع کہتے ہیں۔

زبان پر قدرت بلاشبہہ کمال فن ہے لیکن اس میں تصرفات کرکے اُسکے

دامن کو وسیع کر دیا اور پھر اُن تصرفات کو قبولیت کا شرف بخشنا کمال ہی کمال ہے، میرزا کی جدت پسند طبیعت صرف محاورات ہی میں رنگینیاں نہیں پیدا کرتی بلکہ کسی خیال کو ادا کرنے میں جو لطافتیں اور نزاکتیں انکا ذہن رسا ایجاد کرتا ہے اس سے شعر میں کچھ اور ہی کیف پیدا ہو جاتا ہے۔

شاعر کا نفسیات پر عبور اسکے معراج کمال پر پہونچنے کے لئے ایک زینہ ہے میرزا نفسیات کے بحر ناپیدا کنار کے غواص ہیں قریب قریب پورے دیوان کے صدف میں نفسیات کے سچے موتی بکثرت ملیں گے۔

لکھنؤ کے قدیم اسکول شاعری کے شعرا کا کلام رنگین ضرور ہے لیکن اس میں کوئی چاشنی نہیں اور اگر کہیں کہیں ہے بھی تو پھیکی، میرزا کی شاعری کا آفتاب اسی افق سے طلوع ہوا لیکن اس میں وہ ضیا تھی جس نے مطلع شعر و سخن کو منور کر دیا، اُنکے کلام میں صرف کیف ہی نہیں بلکہ ایک تڑپ ہے، یہی نہیں بلکہ وہ سوز و گداز ہے کہ سامع کا دل بغیر بیقرار ہوئے نہیں رہ سکتا" اس اعتبار سے میرزا امیر عصر کہے جانے کے مستحق ہیں۔

تخئیل کی بلند پروازیاں شاعر کو مجاز سے جلوہ گاہ حقیقت میں پہونچا

دیتی ہیں، میرزا کا طائر فکر بھی تخئیل کے ان افلاک پر پرواز کرتا ہے جو منزل عرفان کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہیں، اس لحاظ سے ثاقب میرزا غالب کے حقیقی پیرو ہیں۔ مگر میرزا کا کمال صرف میر و غالب کی تقلید ہی میں مضمر نہیں بلکہ حقیقی کمال یہ ہے کہ انھوں نے میر و غالب کے دو مختلف رنگوں کو سمو کر اسطرح ایک کر دیا ہے کہ ایک ہی شعر سوز و گداز سے بھری ہوئی زبان (میر کے مخصوص طرز ادا) اور ارفع تخئیل (غالب کے مخصوص کمال) کا حامل ہو۔ یہ وہ عدیم المثال کمال ہے جو انکی کم وبیش نصف صدی کی مشق سخن اور جگر کاویوں کا نتیجہ ہے اور جس میں وہ منفرد نظر آتے ہیں۔

میرزا کے بعض اشعار بلاشبہ دقیق ہیں اور عام فہم نہیں، یہ کیوں؟ شاید اس وجہ سے کہ آپ نے بھی اردو شاعری میں میرزا بیدل کی تقلید کرکے ابہام کے ذریعہ سے کلام میں لطافت و نزاکت معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جہاں نکتہ سنج کی عقل جب تک کہ وہ غور و خوض نہ کرے معمّا کام نہیں کرتی۔

توارد خیال اس بحث کے تحت میں ایک قابل افسوس فرد گزاشت ہوگی اگر ہم میرزا کے دیوان زیر نظر میں سے ان اشعار کا تذکرہ نہ کریں

جن میں شعرائے متقدمین اور ہمارے مایۂ ناز شاعر سے توارد خیال ہوتا ہے۔ میرزا ہر شعر میں جدت خیال (اوریجینیلٹی) کے مدعی نہیں ہیں، لیکن انکو اپنے طرز ادا پر ضرور ناز ہے اور یہ ایسا افتخار ہے جس میں وہ حق بجانب ہیں، حقیقت یہ ہے کہ طرز ادا ہی ایسی چیز ہے جو ایک فرسودہ خیال میں تنوع پیدا کر سکتی ہے، ایسا تنوع جو (اوریجنل) اصلی خیال کے قالب میں روح پیدا کر کے ناظم کی ملکیت بن جاتا ہے، ذیل میں ہم میرزا کے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جن میں ہمارے نزدیک متقدمین کے اشعار سے توارد خیال واقع ہوا ہے، مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

سلمان آوازہ جمالت تا در جہاں فتادہ — خلقے بجستجویت سر در جہاں نہادہ

ثاقب ڈھونڈتے ہیں سب تجلی گاہ دوست — قمریوں کی ورنہ کو کو کس لئے

خواجو منزل یار یار قریں است چہ دوزخ چہ بہشت — سجدہ گر بہ نیاز است، چہ مسجد چہ کنشت

ثاقب چشم و جبیں میں باہم کیوں ہو نزاع بیجا — مطلب نیاز سے ہے، در ہو کہ آستاں ہو

کمال از چشم نیم خواب تو امروز روشن است — آن نالہا کہ در غم تو دوش کردہ ایم

ثاقب ہنسنے والا رو رہا ہے آفریں اے وقت نزع — کچھ کہا شاید مری ڈوبی ہوی آواز نے

سعدی خبر ما برسانید بمرغان چمن — کہ ہم آواز شما در قفسے افتاد است

ثاقب گلشن کیطرف منھ کئے بیٹھا ہوں قفس میں — شاید کوئی دمساز نکل آسکے ادھر بھی

سعدی زمن مپرس کہ از دست او دلم چون است — از و بپرس کہ انگشتہاش تر بخون است

ثاقب عبرت سے دیکھ پنجۂ قاتل رنگا ہوا — رہگیروں سے نہ پوچھ کہ دل میرا کیا ہوا

سعدی فریاد دوستاں ہمہ از دست دشمن است — فریاد سعدی از دل نامہربان دوست

ثاقب عدو کے مارے ہوؤں سے زمانہ مملو ہے — قتیل دوست جہاں میں مرے سوا نہ ملا

سعدی گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم — چہ بگویم کہ غم از دل برود چون تو بیائی

میر کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — یہ کہنے کی باتیں تھیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

ثاقب بیان حال کا نیرنگ عشق دشمن ہے — ادھر وہ سامنے آئے اُدھر گلا نہ رہا

سعدی دریغا کہ عہد جوانی گزشت — جوانی مگو زندگانی گزشت

ثاقب کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے — جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

حافظ مجو درستی عہد از جہان سست نہاد — کہ این عجوزہ عروس ہزار داماد است

در زینت و زیب زنان باد مبارک بہ زناں — ساز دنیا نہ کند ہمت مردانۂ ما

ثاقب عروس دہر کو دل دیکے آزماؤں کیا — سنوارنے میں جو بگڑے اُسے بناؤں کیا

درد: بے تو حالے بہم رسید مرا — گریہ سر کرد ہر کہ دید مرا

ثاقب: نہیں معلوم میں کس حال میں ہوں باغ عالم میں — قفس والے بھی مجھکو دیکھکر فریاد کرتے ہیں

درد: بخت برگشتہ من ہیں کہ یکجا کیا از دو — درد چوں دید مرا، یار زرہ بر گردید

ثاقب: نہیں معلوم پائے سعی میں کانٹے کہاں ٹکے ہیں — مرادیں ہٹ کے چلتی ہیں نکلتا ہوں جدھر ہوکر

درد: اتہام اختیاری نیز برمن می کنند — درحقیقت درد، گو بے اختیارم کردہ اند

ثاقب: مختار ہے بندہ، کوئی مجبور نہیں ہے — پھر کیا ہے جو دل پر مرا مقدور نہیں ہے

درد: ز یاراں گاہ پاس خاطر کس را نمی باشد — ندادم گرچہ من از دست پاس آشنائی را

ثاقب: برگشتہ ہوئی دنیا ہم دردِ الفت سے — اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

درد: اے درد ہیچ اصلاً ظاہر نہ گشت برما — فی الواقع ایم ایں جا یا دیدہ ایم خوابے

ثاقب: سچ ہے کہ خواب دیکھتا ہوں قید خانے میں — سناٹا میرے دل کی طرح ہے زمانے میں

درد: عالم صورت اگر دو روئے معنی را حجاب — پردہ گر ہست گوئی مثل فانوس است و بس

ثاقب: تاب آئے رہیگی شمع کس طرح حجاب میں — یہ کیا سمجھ کے حسن کو چھپا دیا نقاب میں

دلہ: فروغِ حسن آنکھوں میں ہے پھر چھپنے سے کیا حاصل — ذرا سی اوٹ باقی ہے نہ حائل ہے نہ پردا ہے

درد: دوستاں گرد ند جمع و زندگی باقی نماند — درد مجلس گرم شد وقتے کہ ما برخاستیم

ثاقبؔ مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن — زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

دردؔ زندگانی بود از بس باعثِ آزارِ ما — گشت آساں در نظرہا مُردنِ دشوارِ ما

ثاقبؔ تھا اشتباہ درد، کھٹک زندگی کی تھی — اے دم ترے نکلتے ہی آرام ہو گیا

دردؔ من چساں در رہِ نظارہ قدم پیش نہم — اشک در دیدہ ز دل قطرہ زناں می آید

ثاقبؔ کیا دیکھتا آثارِ سحر میں شبِ فرقت — وہ جوش پہ آنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

دردؔ در سیرگاہِ عشق تو چوں مردمانِ چشم — از فیضِ گریہ، برلبِ دریا نشستہ ایم

ثاقبؔ چشمِ گریاں سے اتر کر سیرِ دل فرمائیے — مدتوں دیکھا، کہ دریا اور ساحل اور آپ

والہؔ ہم نے تو کبھی مردمکِ چشم سے پہلے — اشکوں میں جو ڈوبا ہو وہ انساں نہیں دیکھا

دردؔ اندریں بزمِ خراب از ابتدا تا وقتِ مرگ — شمع ساں باید ہمیں خنداں و گریاں زیستن

ثاقبؔ جو آنکھ ہو تو دیکھئے نہ پوچھئے کہ کیا کیا — چراغِ بزم ہو گیا، جلا کیا، ہنسا کیا

دردؔ شمعِ بزمِ عاشقی آہِ شرر بارِ من است — ہر کجا گل می کند داغے زگلزارِ من است

ثاقبؔ دل کی نگاہِ عشق ہے ایسی کچھ اپنے داغ پر — جب نظر آ گیا کہیں، ٹوٹ پڑا چراغ پر

دردؔ می رود دردؔ باز در کوشش — چہ کند اضطرار ہا دارد

میرؔ چلا نہ اٹھ کے وہیں پھر تو چپکے چپکے میرؔ — ابھی تو اسکی گلی سے پکار لایا ہوں

ثاقب بارہا لپٹا ہوں انکے در سے بے نیلِ مرام — جی میں ہے پھر آج قسمت آزمانا چاہیے

درد فردا اقرار آمدنش بود بعد عمر — بے صبریم چہ کرد شبے ہم بسر نہ کرد

ثاقب مجھکو یقین وعدہ فردا ضرور تھا — مشکل یہ آپڑی تھی کہ دل ناصبور تھا

درد ہر کجا نقش قدم از تو با نقش جبیں — جادہ راہ تو باشد ہمہ سجادۂ ما

ثاقب سجدے کا کام آج نہ لینگے جبیں سے ہم — نقش قدم اٹھائینگے انکے زمیں سے ہم

درد رستم کجا بزور ضعیفی ما رسید — کوہ غم است وکاہ دل ناتوان ما

ثاقب پھول سا قلب ہے اور صبر کی سل رکھتا ہوں — جب تو کہتا ہے زمانہ کہ ہیں دل رکھتا ہوں

ولہ قوتِ غم دیکھ، زورِ ناتوانی پہ نہ جا — زلزلے عالم میں تھے جب دل مرا بیتاب تھا

درد تا سر زلف تو دارد دسترس — می تواں بوسید دست شانہ را

ثاقب شکر شانے کا کروں یا صبر کو ڈھونڈوں کہیں — زلف تو سمٹی مگر یاں دل پریشاں ہو گیا

درد اکنوں نہ غم چہ سود کہ حالا شناختی — اے بیوفا زاہل وفا بودہ ایم ما

ثاقب لحد پہ تاسف کے معنی نہ سمجھا — یہ کاہیکا رونا ہے جب میں برا تھا

درد پارہ چند زدل قطرہ چندے از خوں — کردہ ام نذر غمت آنچہ میسر گردید

ثاقب نذر غم دل تھا تو میں کیونکر بچا لیتا جگر — درد بھی مہماں مری تقریب بیماری میں تھا

درد معنی حرف کن اگر فہمی — ہستی جملہ خلق یک سخن است

ثاقب مطلب شاید دی الم کن میں نہاں ازل سے تھا — عالم حسن و عشق بھی جلوہ نون و کاف ہے

ولہ اس دفتر ہستی میں تعلیم بہت کم ہے — دو حرف نظر آئے دیباچہ ابجد میں

درد چرا تصدیع باید داد دیگر غمگساراں را — کند غمخواری ما گر دل اندوہگین ما

ثاقب جانبری ہے عشق سے ممکن موافق ہو جو دل — ہاں مگر آپس میں جھگڑا ہو تو پھر کیونکر بنے

درد زیادہ تو ظہوری و درد مدہوش است — بہوش باش کہ بیہوش کردہ مارا

ثاقب مدہوش تیری یاد میں کب دل نہیں رہا — تھی بیخودی، مگر کبھی غافل نہیں رہا

درد نالہ ام تا بفلک رفت ولے — تا بگوش تو رسیدن باقی ست

ثاقب ناداں بھی ہو گئے مرے نالوں سے ہوشیار — اب آپ کے سوا کوئی غافل نہیں رہا

درد غمہا ہمہ عیش است کہ با غم است دل ما — شادیم کہ در قید فراغ است دل ما

ثاقب صحن زنداں و چمن میری نظر میں ایک ہیں — قید سے گھبرائے وہ جو رنج سے آزاد تھا

ولہ جواب زخم جگر دے رہا ہے ہنس ہنس کر — وہی تو دل ہے کہ جو خوش رہے مصیبت میں

جامی بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی — ہر کہ می آید نظر از دور پندارم توئی

درد غیر او در ہر دو عالم ہیچ ننماید مرا — ہر کجا من می روم او پیش می آید مرا

ثاقب جز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

درد ہر زماں خواب غفلت افزاید
زندگانی ما فسانۂ ماست

ثاقب بڑھائی جس نے تری نیند مجھکو تڑپا کے
وہ میری عمر گزشتہ نہ تھی کہانی تھی

درد ہے بعدِ مرگ بھی وہی آہ و فغاں ہنوز
لگتی نہیں ہے تالو سے اپنی زباں ہنوز

ثاقب دل کے ہونے بھی کہیں درد جدا ہوتا ہے
اک فقط موت کے آجانے سے کیا ہوتا ہے

درد ہنس قبر پہ میری کھلکھلا کر
یہ پھول چڑھا کبھی تو آکر

ثاقب کم سے کم آج راضی ہیں شہیدونکے مزار
آپ ہنس دینگے تو سمجھینگے چراغاں ہوگیا

درد پڑی ہی خاک پر یہ لاش اُس رشکِ شہیداں کی
لہو کے آنسوؤں رویا ہو جسکو دیکھکر خونی

ثاقب ہماری داستانِ غم رُلاتی ہو زمانے کو
وہ ہم ہیں جو زبانِ غیر سے فریاد کرتے ہیں

درد اشک نے میرے ملائے کتنے ہی دریا کے پاٹ
دامن صحرا میں ورنہ اسقدر کب گھیر تھا

ثاقب وہ کانٹے جنکو چن لایا ہوں میں وادیِ وحشت سے
نکالوں گا اگر وسعت ہوئی صحرا کے دامن میں

درد بعد مرنے کے بھی وہ بات نہیں آتی نظر
جس توقع پہ کہ ہم اب تئیں یاں جیتے ہیں

ثاقب پردۂ حشر اٹھا پھر بھی تمنا ہے بعید
کام مشکل تھا تو مرنے پہ بھی آساں نہ ہوا

درد یہ چاہتی ہے تو تپش دل کہ بعد مرگ
کنجِ مزار میں بھی نہیں آرمیدہ ہوں

ثاقب خبر نہیں یہ جاگنا ہے زیست تک کہ بعد بھی — جو ساتھ دل رہا ہی تو میں لحد میں سو چکا

درد کب تک آنسو کوئی پیے جائے — اس محبت نے جی بہت کھایا

ثاقب جب جنون میں ہے جوش تو پی جائے کیونکر — زخموں کا لہو بادۂ انگور نہیں ہے

درد نزع میں ہوں پہ وہی نالے کیے جاتا ہوں — مرتے مرتے بھی ترے غم کو لیے جاتا ہوں

ثاقب نزع اک عید ہے روتے ہوئے وہ آئے ہیں — اے دل زار یہی وقت ہے مرجانے کا

درد آ گئے جو بلا آئی تھی سو دل پہ ٹلی تھی — ابکی تو مری جان ہی پر آن بنی ہے

ثاقب یا الٰہی کون سی بجلی گری تھی باغ میں — جو نشیمن سے سرک کر میرے دل پر آ گئی

ولہ شب فراق میں دل پھونک کر سحر کی تھی — شب مزار تو وہ بھی نہیں جلاؤں کیا

درد ماتم کدۂ جہاں میں جوں ابر — اپنے تئیں آپ رو گئے ہم

ثاقب عدم سے آ کے اس دار فنا میں خوب پچھتایا — یہ اک ماتم کدہ نکلا میں سمجھا تھا کہ محفل ہے

درد چشم عبرت سے دیکھ ادھر — نقش لوح مزار ہیں ہم

ثاقب فائدہ یوں خاک کے ڈھیر پہ آنے کا نہیں — دیکھ قبروں کو مگر چشم اولوالابصار سے

درد نزع میں تو ہوں مگر تیرا گلا کرتا نہیں — دل میں ہر دم ہی وفا پر دم وفا کرتا نہیں

ثاقب منتظر نزع میں چپ ہے تو اسے چپ نہ سمجھ — دم کا رک رک کے نکلنا بھی گلا ہوتا ہے

درد سو سو طرح کی ہجر میں ہوتی ہے جانکنی — مرتا نہیں ہوں تو بھی تو ہیں سخت جاں ہنوز

ثاقب تم نے شب فراق میں دیکھی نہیں جو حالتیں — آج وہ آ کے دیکھ لو عالم احتضار میں

درد بعد مرنیکے مرے ہوگی مرے دلکی قدر — تب کہا کیجیے گا تو کدھر گئے وہ برساتیں کہاں

ثاقب مٹ چکے یہ دل تو پھر پوچھیں مزاج حسن دوست — صید ہی نابود ہو تو کس لئے صیاد ہو

غالب ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے — آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

ثاقب آگ یہ کیسی لگی ہے سینۂ دلگیر میں — چھالے آتے ہیں نظر آئینۂ تقدیر میں

غالب بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

ثاقب ویرانہ ہی اچھا ہے کہ ویراں تو نہ ہوگا — گھر ہو تو نہ دیوار رہو اُس گھر میں نہ در ہو

ناسخ مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہو گیا — آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا

ثاقب آسمانکو دیکھکر سمجھا میں طول شام غم — صبح اتنی دور جا پہونچی کہ تارا ہو گئی

ناسخ دل ہمارا اسقدر سوزش طلب پروانہ ہے — شمع سے بھاگے جو اُس میں میل ہو کافور کا

ثاقب سرد آہوں سے علاج سوز دل ہوتا نہیں — یہ ہے ویسی ہی کہ جیسے شمع میں کافور ہے

میر بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں — طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں

مصحفی شاہد رہیو تو اے شب ہجر — جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

ثاقب عمر بھر جلتا رہا دل اور خاموشی کے ساتھ / شمع کو اک رات کے سوزِ دلی پہ ناز تھا

ولہ سحر کو بھی مری محفل میں برہمی نہ ہوئی / تمام رات ہوئی درد میں کمی نہ ہوئی

ولہ بیداری فرقت میں تھا رمز قیامت کا / جاگا ہوں کہ نیند آئے تاریکی مرقد میں

میر آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن / ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں تھا

ثاقب نگاہ واپسیں بھی اب مجھے جواب دے چکی / میں اپنے گھر سدھارئیے فسانہ ختم ہو چکا

میر حال بد گفتنی نہیں اپنا / تم نے پوچھا تو مہربانی کی

ثاقب پرسش حال اسنے کی تو مجھے / یہی کہتے بنا کہ اچھا ہوں

مونس شب جو زنداں میں ہوئی تازہ گرفتاروں کو / سر پٹکا اسے کہ در کر دیا دیواروں کو

ثاقب شب کو زنداں میں مرا سر پھوٹنا اچھا ہوا / آج کچھ کچھ روشنی آنے لگی دیوار سے

نفیس اپنے ہی اعضا نے کی آخر کو ہم سے دشمنی / دوستوں کی دوستی کا حال ہم پر کھل گیا

ثاقب باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے / جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

غالب سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال / کہ یہ کہے کہ سرِ رہگزر ہے کیا کہئے

ثاقب کب اس نے کی ہے پرسشِ غمہائے جانگسل / جب حال دل بیان کے قابل نہیں رہا

ولہ وہ وقت ہے کہ ہے مشکل مزاج پرسی دوست / جہاں کا کھویا ہوا دل ملا قیامت میں

درد وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیئے — پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیئے

ثاقب شب غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو — جدھر دیکھتا تھا خدا ہی خدا تھا

ولی اضافہ کچھ نہ ہوا اپنے یقیں میں — اگر اٹھ جائے پردہ درمیاں سے

درد پوچھ مت قافلہ عشق کدھر جاتا ہے — راہرو آپ سے اس رہ میں گزر جاتا ہے

ثاقب اے گرد کار عشق اکدھر جا رہا ہوں میں — ہر سمت یہ صدا ہے کہ دیوانہ ہو گیا

درد جگر پہ داغ نے میرے یہ گلفشانی کی — کہ اس نے آپ تماشے کو مہربانی کی

ثاقب نہ آنکھ بند کروں میں تو کیا کروں یا رب — وہ آ رہے ہیں تماشائے جانکنی کے لیے

درد ہر آہ شرربار ہے جوں سرو چراغاں — کیا آگ الٰہی مرے سینے میں بھری ہے

ثاقب سینۂ سوزاں میں ثاقب گھٹ رہا ہے وہ دھواں — اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

درد دیکھا تو یہ شورش من و ما — ہنگامہ وصل جان و تن ہے

ثاقب خواہش دنیا سے عشق و حسن ہے — ورنہ پھر میں کس لئے تو کس لئے

درد کھل گیا جو کچھ کہ تھا اسے نیستی — ہستی موہوم کا یاں افترا

ثاقب اُس کے نیرنگ کا تماشا ہوں — جز فریب نگاہ میں کیا ہوں

درد زبس درد جدائی نے ترے بند بند توڑا ہے — کہ جو آزار بھی ہوتا ہے وہ وجع مفاصل ہے

تاقیامت ہجر نے کونسا پیوند لگا رکھا تھا   راستہ مل گیا خنجر کو گزر جانے کا

محاکمہ آخر میں اس امر کا اعتراف ناگزیر ہے کہ میرزا کے کلام کا کوئی نقاد یا مبصر یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ دیوان زیر نظر تسامحات و نقایص سے یکسر مبرا اور لغزشوں سے بالکل پاک وصاف ہے۔ لیکن یہ بھی بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ فراوانی محاسن حسن شناس نگاہوں کو اپنے جلووں میں جذب کرلیتی ہے اور مبصرین کو اتنا موقع نہیں دیتی کہ وہ شاعر کی ان کوتاہیوں کو جو مقتضائے بشریت ہیں نظر انداز نہ ہونے دیں۔

دیوان کے پرسکون مطالعہ کے بعد یہ محاکمہ بھی مقتضائے انصاف ہے کہ اگر تخیل کی بلند پروازی اور زبان کی سحر طرازی باکمال شاعر کا طرۂ امتیاز ہے تو قدیم اسکول شاعری کے قرن آخری اور جدید اسکول کے قرن حاضرہ کا احسن اور ممتاز غزل گو میرزا ہی ہے، میرزا نے لکھنؤ میں عہد مہد سے نشوونما پائی اور لکھنؤ کے آسمان شعر و سخن پر چمک کر اُنکے آفتاب شاعری کی نور بار شعاعوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں ضوفشانیاں کیں لہذا لکھنؤ کی خاک کو جس قدر بھی اُس پر افتخار ہو کم ہے، حقیقت یہ ہے کہ آج سے کم و بیش

سو سال پہلے لکھنؤ کے تغزل کی آبرو خواجہ آتش مرحوم نے رکھی اسکے بعد پھر
کون انکار کریگا کہ گزشتہ صدی کے ابتذال کے ختم ہوتے ہی لکھنؤ کی خاک نے
جو چند غزل گو پیدا کئے اُن میں میرزا ثاقب ہی بقائے دوام کا خلعت پہنے نظر
آتے ہیں۔

یہ داستان پُر لطف ہنوز شرح و بسط کی متقاضی تھی، لیکن بھلا ہو
اپنی بے بضاعتی کے خوف اور اہل ذوق کی نزاکت طبع کے اندیشے کا جس نے
اس کو تشنہ تکمیل ہی رکھا! یار زندہ و صحبت باقی۔

شہنشاہ حسین رضوی ایڈووکیٹ لکھنؤ

غزلیات

تتمہ صحت نامہ

صفحہ	۵	سطر	۲	مصرع ثانی	مجھکو معلوم ہے شعلے کا ہوا ہو جانا
〃	۵	〃	۱۴	〃 اوّل	اپنی قسمت سے بگڑ جاؤں کہ دورِ چرخ سے
〃	۱۰	〃	۶	〃 اوّل	موت ہی اچھّی کہ بر آئی مرادِ اہلِ ہجر
〃	۱۶	〃	۱۴	〃 ثانی	صد چاک اِسی خیال سے ہر شانہ ہوگیا
〃	۲۳	〃	۳	〃 ثانی	آپ کو بھولا نہیں تھا، دل بھی مجھ کو یاد تھا
〃	۲۸	〃	۱	〃 ثانی	دل لبِ خاموش تھا اور قطرۂ خوں راز تھا
〃	۳۱	〃	۶	〃 اوّل	نزہتِ ایامِ عشرت پر ہیں نازاں کیوں حسیں
〃	۳۳	〃	۸	〃 ثانی	ہاں سچ ہے ابھی کوچۂ جاناں نہیں دیکھا
〃	۳۹	〃	۸	〃 ثانی	اب اس سے زیادہ کیا اظہارِ جفا ہوتا
〃	۴۵	〃	۱۰	〃 ثانی	ہے وہ گھاٹے میں جو محنت کا خریدار نہ تھا
〃	۵۰	〃	۷	〃 ثانی	دُنیا ہے، ایک آتا تھا، ایک جا رہا تھا
〃	۵۳	〃	۵	〃 اوّل	اِدھر پھولوں کے مجمعے تھے اُدھر شورِ عنادل تھا
〃	۵۸	〃	۱	〃 ثانی	مجھکو بتلائے وہ آباد جو ویراں نہ ہوا

صفحہ		سطر		مصرع	
صفحہ	٦٠	سطر	١١	مصرع ثانی	فتح بابِ اثرِ نالہ و فریاد کیا
″	٦٢	″	٥	″ ثانی	یہ وقتِ بد تھا کہ ساغر رہا سبو نہ رہا
″	٦٣	″	٤	″ اوّل	کب اُس نے کی ہے پرسشِ غمہائے جانگسل
″	٧٣	″	٥	″ اوّل	اب کٹی شہ رگ کہ جب دُنیا کی کڑیاں جھیل لیں
″	٧٦	″	٨	″ اوّل	اُن آنکھوں میں جن میں وفا لامکاں ہے
″	٨٠	″	٣	″ اوّل	کیا جانے میکدے سے گئے کب نجھے آئے کب
″	٨٤	″	٥	″ ثانی	آفتاب ایسا ہی چمکا تھا عنب کی تاک پر
″	١١٢	″	١٢	″ اوّل	نازشِ دیر و کلیسا بد حواسی سے بڑھی
″	١١٥	″	٨	″ اوّل	دل نے رگ رگ سے چھپا رکھا ہے تیرا رازِ عشق
″	١١٧	″	٨	″ ثانی	آج وہ آکے دیکھ لو عالمِ احتضار میں
″	١١٩	″	٣	″ ثانی	ہم تو وہ ہیں جو تھک گئے دو تین گام میں
″	١٢٨	″	٧	″ اوّل	دل کا پہلو سے نکل جانا سمجھتا ہوں مگر
″	١٣١	″	٧	″ اول	ہے کہاں وہ ساقیِ تُند خو، کہ ہے میکدے میں یہ ہاو ہو
″	١٣٧	″	١٠	″ ثانی	ثاقب ثاقب اپنی دعائیں کھنچ کے اُن کو لائینگی
″	١٣٨	″	٦	″ اول	آفتِ عشق میں مرنا بھی ہوں جینا بھی ہوں،

صفحہ		سطر		مصرع	
صفحہ	۱۳۸	سطر	۶	مصرع ثانی	کاوشِ غم سے ہے کبھی نیش کبھی نوش مجھے
〃	۱۶۲	〃	۱۳	〃 ثانی	مقصد ہے جو دشوار تو منزل بھی کڑی ہے
〃	۱۸۲	〃	۱۱	〃 ثانی	مرگیا شاید جو راضی ہوگیا ذلّت پہ بھی
〃	۱۸۲	〃	۱۳	〃 اوّل	بات کہتے ہیں دکھا دیتی ہے یہ رنگیں چمن
〃	۱۸۷	〃	۸	〃 ثانی	چھپ کر جلائیں کیوں مرے داغِ جگر مجھے
〃	۱۸۷	〃	۱۲	〃 ثانی	بیجا ہے یہ خیال اُدھر اُن کو ادھر مجھے
〃	۱۸۹	〃	۱۱	〃 ثانی	نہ کھلا مر کے بھی یہ راز کہ مارا کس نے
〃	۱۸۹	〃	۱۳	〃 ثانی	زندگی چھوڑ کے کی موت گوارا کس نے
〃	۱۹۲	〃	۲	〃 اوّل	وہی سکوت میں اک عمر کاٹنے والا
〃	۲۰۱	〃	۸	〃 اوّل	مرگئی ہیں حسرتیں لاکھوں مرے مرنے کے ساتھ
〃	۲۰۲	〃	۱۱	〃 ثانی	بات جب بگڑی نہ ہو تو کیوں بنانا چاہیے
〃	۲۰۴	〃	۱	〃 اول	بھاگتا کیا ہے حوادث ہی میں ہے پا رگنج عروج
〃	۲۲۲		۱۰	〃 ثانی	یہ تارا ٹوٹتا ہے جب تو دل کو یاد کرنا ہے
〃	۲۲۳	〃	۲	〃 اول	ہنسنے والا رو رہا ہے آخریں لے وقتِ نزع
〃	۲۴۰	〃	۷	〃 اوّل	اُس رخِ آتشیں کی آب دیکھ کے میری آنکھ دیکھ

صفحہ ۲۴۰	سطر ۷	مصرع ثانی	آب ہے ایک ہی طرف ایک طرف سراب ہے
" ۲۵۰	" ۲	" ثانی	مہر طالع مطلع دیہر مصرع سالم ہلال
" ۳۸۹	" ۱۳	" اول	بلا ہے عشق لیکن ہر بشر قابل نہیں ہوتا
" ۳۹۶	" ۲	" ثانی	بات جب بگڑی نہ ہو تو کیوں بنانا چاہیے
" ۴۱۴	" ۶	" ثانی	کوئی تو ہو جو کبھی دل کے روبرو آئے
" ۴۲۰	" ۱۴	" ثانی	لگی تھی آگ ہی ایسی کہ ہم بجھا نہ سکے

مقدمۂ دیوان

صفحہ ۵۰	سطر ۱۰	مصرع ثانی	عذر کیا چاہیے جھوٹوں کو مکرنے کیلیے
" ۹۸	" ۱۴	" اول	میں تو ہوں مارا ہوا دل کا اگر شک ہو تو آپ
" ۱۰۰	" ۱۳	" اول	یہ جادہائے عشق ہیں انھیں کا میں اسیر ہوں
" ۱۰۲	" ۱	" ثانی	رات بھر کس چین سے سوتے رہے
" ۱۱۳	" ۷	" اول	چشم گریاں سے اتر کر سیر دل فرمائیے

"عرض حال" صفحہ ۱۰، سطر ۸ میں بجائے ۳۱ جون کے ۲۱ جون ۱۹۳۶ء ہونا چاہئے
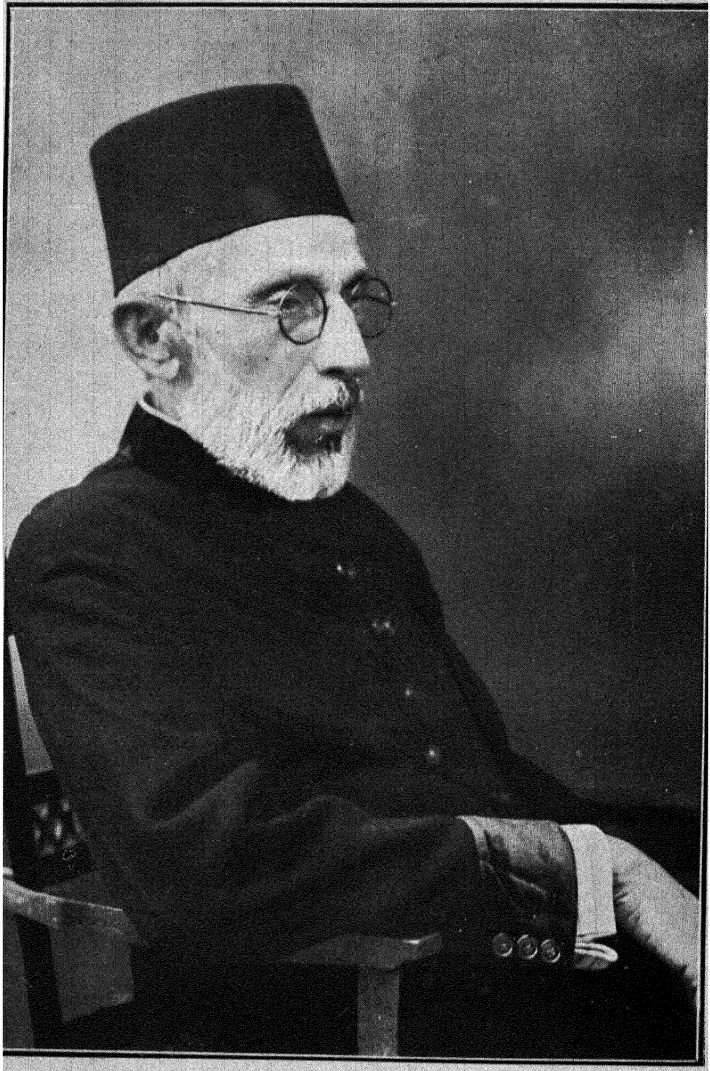
تو اگر چاہے کہ معنی محبت جان لے　　غور سے دیکھ آئنے کو اور مجھے پہچان لے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۷۔ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء

اک لبِ خاموش بنکر شوقِ گویائی رہا
حمد کرتا کون عالم محوِ یکتائی رہا

ہو نہ ہو یا جرمِ بازو یا خطا خنجر کی ہے
سر تو ایسا تھا کہ جو صرفِ جبیں سائی رہا

داستانِ ہجر سے کب دل کو فرصت تھی مگر
وصل کی اُمید پر ذکرِ شکیبائی رہا

چشمِ دنیا میں پھرایا حسرتِ دیدار نے
طور کے سُرمے کو پھر بھی شوقِ بینائی رہا

ایک اُنپر کیا زمانے پر ہے میرا بارِ خوں
ذبح میں ہوتا گیا عالم تماشائی رہا

ہم مریضانِ ستم تو دہر سے گزرے مگر
کس طرح عالم میں دعوائے مسیحائی رہا

آئینہ باقی ہے ٹکڑے دل کے ملتے بھی نہیں
ایک عالم مٹ گیا شوقِ خود آرائی رہا

دل تو داغوں کے لئے ہوتا ہے لیکن غم یہ ہے
ہو کے داغی کس لئے ملبوسِ رعنائی رہا

خلوتِ وحدت سے نکلا کیوں کہ بھولا یادِ دوست
وہ مبارک دل ہے جو ممنونِ تنہائی رہا

اُنسے الفت کر کے بعدِ مرگ بھی سویا نہیں
بنکے اک تصویرِ محشر خوفِ رسوائی رہا

ابتری خواہِ زمانہ جب مزاجِ حسن تھا — کس لئے پھر عشق صرفِ مجلس آرائی رہا

اُلفتِ کعبہ پہ کیوں مجھ سے خفا ہیں اہلِ دیر
پھر کسی کو کیا اگر ثاقبؔ تولّائی رہا

۴-جون ۱۹۱۳ء

روشن چراغ تھے نہ ستارہ میں نور تھا — فرقت میں آہِ دل کا اثر دور دور تھا
مجھکو یقینِ وعدۂ فردا ضرور تھا — مشکل یہ آپڑی تھی کہ دل ناصبور تھا
اے آہِ سرد اس میں ترا کیا قصور تھا — ٹھنڈا ہو دل یہ سوزِ محبت سے دور تھا
کیا چیز ہے حیات کہ مرنیکے بعد بھی — جو چُپ ہوا وہ گوش بر آوازِ صور تھا
پیدا ہوا ہے جو مری ہستی سے انقلاب — دل کا کیا دھرا ہے مجھے کیا شعور تھا
برسونگی آگ جسمیں ہو اس دل کو کیا کہوں — جلتا جو دفعتًہ، تو سمجھتا کہ طور تھا
دل کھنچ کے جذبِ شوق میں خنجر تک آگیا — پہلو کا فاصلہ رگِ گردن سے دور تھا
گلشن بہار پر تھا نشیمن بنالیا — میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا
دیکھو تو سر جھکاکے یہ کس کا مزار ہے — شاید وہی ہو جس پہ تمھارا غرور تھا
کھنچتے تھے ہاتھ پاؤں کہ دم توڑتا تھا میں — ناآشنا، یہ بحرِ فنا کا عبور تھا

پیدا کیے ہیں دل کے تعلق نے راستے
نزدیک تھا جہان میں کوئی نہ دور تھا

دل بھر چلا عدم پہ ٹھٹھکتا تھا وقتِ نزع
وہ آ سکے تھے تو مجھکو ٹھہرنا ضرور تھا

میں تھا اسیرِ دامِ بلا ہنس رہے تھے پھول
سمجھا میں اب یہ عشق نہیں تھا قصور تھا

بستر سے ایک ساتھ کب اُٹھتے تھے اہلِ دہر
کتنا عجیب جلوۂ صبحِ نشور تھا

ڈھونڈا دل جو سامنے سے ہٹی ظلمتِ لحد
کچھ کچھ ہے مجھکو یاد کہ آنکھوں میں نور تھا

کیا ربط اشتراک سے مجھے ہوتا کہ دہر میں
خوش قسمتی سے دل وہ ملا جو غیور تھا

گلچیں تجھے ہوا کیا جو یہ تنکے جلا دیئے
تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا

جلوہ فروغِ حسن کا **ثاقب** کے دل میں ہے
ملتا ہوا اسی سے جو بالائے طور تھا

یکم۔ اپریل ۱۹۱۲ء

دل کو تاکیدِ وفا ہے کہ فنا ہو جانا
درد کو حکمِ قضا ہے کہ دوا ہو جانا

کم سمجھتا ہے محبت میں فنا ہو جانا
دل کی قسمت میں ہے کیا جانئے کیا ہو جانا

میں سمجھتا ہوں مگر تم نہ خفا ہو جانا
موت کے ہاتھ میں ہے میری دوا ہو جانا

جانچتے ہیں وہ مرا حالِ دل از نالۂ غم
تو بھی ٹوٹے ہوئے شیشے کی صدا ہو جانا

عادتِ شانہ کشی زلفِ گرہ گیر میں ہے   فرض ہے روز اسیروں پہ جفا ہو جانا

شمع ساں منتظرِ صبح نہ رہنا اے دل   شبِ فرقت کو دعا دیکے فنا ہو جانا

خمِ گیسو سے نکلنا مرے دل کا، توبہ   وہ گرہ ہے جسے آتا نہیں وا ہو جانا

دامِ اُلفت نے قفس مجھکو دکھایا آخر   خوف کہتا تھا کہ گلشن سے ہوا ہو جانا

فائدہ دیتی ہے کیا چادرِ قبرِ منعم   ہاں، مگر، بوجھ پہ اک بوجھ سوا ہو جانا

کیا قفس میں کوئی در ہے، یہ بتا اے صیاد   کس سے پوچھوں، کسے کہتے ہیں رہا ہو جانا

دل کو دیکھے وہ، کہ ہے مقتلِ شوق و حسرت   جس نے دیکھا نہ ہو کعبے کا منا ہو جانا

زندگی ہے ترے بڑھنے ہی تک اے زلفِ دراز   چوم کر اُنکے قدم میری بلا ہو جانا

ڈھونڈتا ہے چمنِ عشق میں کیا فصلِ بہار   خون رُلوائیگا زخموں کا ہرا ہو جانا

جیتے جی قید سے چھٹتے نہیں زلفوں کے اسیر   نام ہے دم کے نکلنے کا رہا ہو جانا

خونِ بلبل ہے سرِ گل، کہ نہیں ممکن ہے   چاک ہو جانے سے یوسفؑ کی قبا ہو جانا

تم چلے آؤ، تو لوحِ سرِ تربت بن جائے   خوب ہے قبر پہ نقشِ کفِ پا ہو جانا

تہنیت موت کو دیتا ہے مرے دل کا مرض   عید ہے، ماتمِ حسرت کا بپا ہو جانا

طشت از بام ہوا رازِ وفا غم یہ ہے   ورنہ کچھ بات نہ تھی سر کا جدا ہو جانا

حیلۂ صبر ہے آساں جو تمھیں یاد رہے — ہمکو دم توڑتے دیکھو تو خفا ہو جانا

خاک بھی اِس دلِ سوزاں کی ملیگی نہ کہیں — مجھے معلوم ہے شعلے کا ہوا ہو جانا

لطفِ آزادیِ دل، اُنکی اسیری میں ہے — اِک نئی قید ہے زنداں سے رہا ہو جانا

کِس دوراہے میں کھڑا ہوں متحیّر کی طرح — کہ بقا ہے مجھے ممکن نہ فنا ہو جانا

آ دو نظارۂ عبرت کو یہاں کچھ نہ سہی — کیا بُرا ہو گا مزاروں کا بھلا ہو جانا

پھول کو توڑ کے دیکھو اثرِ وصل و فراق — موت ہے چاہنے والوں سے جدا ہو جانا

کچھ نہ کچھ ہو ہی گیا عشق میں اے موت مگر — میں نے چاہا تھا کچھ اِس سے بھی سوا ہو جانا

آئے ہو گورِ غریباں میں تو باتیں نہ کرو — ذرّے کچھ کہتے ہیں خاموش ذرا ہو جانا

جیتے جی آئے قیامت تو مزہ ہے ثاقب

دیکھ لیں وعدۂ فردا کا وفا ہو جانا

۱۳ ستمبر ۱۹۱۵ء

کیا تعجب گر کوئی غمخوار دنیا میں نہ تھا — درد میرے دل میں تھا اور میرے اعضا میں نہ تھا

غیر کی امداد سے چمکے نہیں اہلِ کمال — نام کو روغن چراغِ طورِ سینا میں نہ تھا

کِس سے بگڑوں، اپنی قسمت سے، کہ دورِ چرخ سے — میں تو وہ ڈھونڈا کیا جو جیبِ دنیا میں نہ تھا

یوں تو مشتِ خاک تھا دل خون ہو کر بہہ گیا
لیکن اس قطرہ میں وہ کچھ تھا جو دریا میں نہ تھا

تیرگی قسمت کی بھی ہے اور شبِ فرقت کی بھی
سر میں تھا سودا مرے الفت کا تو سودا میں نہ تھا

اہلِ باطل ڈالتے ہیں تفرقہ اے چشمِ حق
ورنہ کعبے میں وہ کیا تھا جو کلیسا میں نہ تھا

عشق کی صورت جو دل میں چھپکے رہتا تھا مدام
کوئی کانٹا اِس طرح کا باغ و صحرا میں نہ تھا

حُسنِ ظاہر ہو گیا تھا سدِ بابِ معرفت
قلبِ یوسف تھا مگر چشمِ زلیخا میں نہ تھا

کچھ ہنسی آئی تھی اُسکو حسرتِ دیدار پر
ورنہ غصے کا اثر برقِ تجلّی میں نہ تھا

کام اپنا کر چکا تھا عشقِ جانگیر اے اجل
تیرے آنے سے بہت پہلے میں دنیا میں نہ تھا

پرورش کیا چیز ہے جو کچھ ہے استعداد ہے
خشک ہی گوہر کہ جیسے قعرِ دریا میں نہ تھا

کیا خبر کیوں کھپ گیا آنکھوں میں اہلِ ظلم کی
رنگ کوئی بھی مرے خونِ تمنا میں نہ تھا

وہ تو وہ ہیں راہ چلنے میں نظر ڈالی تھی کل
آپ میں ذرہ کوئی نقشِ کفِ پا میں نہ تھا

بخت سے کچھ رشتۂ اُلفت کا بس چلتا نہیں
قیس کو جو مل گیا تقدیرِ لیلیٰ میں نہ تھا

دل یہ کہتا ہے کہ نالے بے اثر تھے شامِ غم
میں یہ کہتا ہوں کہ اُس شب کوئی دنیا میں نہ تھا

جو اندھیرا دیدۂ ثاقبؔ نے دیکھا شامِ ہجر
بختِ واژوں میں نہ تھا، زلفِ چلیپا میں نہ تھا

۸- ستمبر ۱۹۱۷ء

تیرگی نام ہے دل والو نکلے اُٹھ جانے کا — جس کو شب کہتے ہیں مقتل ہے وہ پروانے کا

چل بیاباں کی طرف، جی نہیں گھبرانے کا — روحِ مجنوں سے گھر آباد ہے ویرانے کا

دیدۂ دوست، تری چشم نمائی کی قسم — میں تو سمجھا تھا کہ در کھل گیا میخانے کا

دمِ آخر کی ملاقات، میں کیا تم سے کہوں — وقت ہے تنگ بہت ہجر کے افسانے کا

دامنِ شمع پہ دھبا نہ رہا، واہ رے عشق — خون اب تک نظر آیا نہیں پروانے کا

تنگ ہے صحنِ جہاں ساتھ نہ لے بارِ الم — راستہ ملتا ہے مشکل سے گزر جانے کا

گل و آہو، چمن و دشت میں کہہ جاتے ہیں کچھ — کہیں موقع نہیں اے دل ترے بہلانے کا

روکے جاتے ہیں رہِ دوست کے چلنے والے — وہی دشمن ہے جو ہمدرد ہے دیوانے کا

قبر والے ہوئے ممنونِ زیارت لیکن — نام بدنام کیا آپ نے ویرانے کا

ہجر نے کون سا پیوند لگا رکھا تھا — راستہ لگ گیا خنجر کو گزر جانے کا

تو شبِ غم کو نہ سمجھا ہو تو میں سمجھا دوں — وہی میدان تھا دست ترے پروانے کا

قصۂ باغ ہے اور میری مسرت کی اُمید — ڈھنگ آتا نہیں صیاد کو بہلانے کا

بزمِ رنگیں میں تری، ذکرِ غم آیا تو سہی — خوش رہے چھیڑنے والا مرے افسانے کا

آشیاں آبلۂ باغ ہے اے سوختہ دل — اک نشاں چھوڑ چلا ہوں ترے جل جانے کا

عبرتِ عقل ہے وارفتگیِ اہلِ مذاق — ہوش والوں میں ہے چرچا ترے دیوانے کا

حسبِ فرمائشِ گردش ہیں غریبوں کے مزار — آسماں دوست ہے منظر مرے ویرانے کا

حصۂ بخت کا مانع ہے یہی دورِ فلک — بڑھ گیا گھوم کے رستہ مرے پیمانے کا

ہو گیا غرق سرِ شعلۂ شمعِ محفل — خون اونچا ہوا اتنا کسی پروانے کا

نزع کے وقت جو کہتا ہوں وہ سمجھے کہ نہیں — بابِ دل تو یہیں ختم ہے افسانے کا

اے پریشانیِ دل اب ہے تری عمر دراز — وقت کھنچنے لگا زلفوں کے سنور جانے کا

چوٹ کھانے سے نئی آگ ابھر آئی ہے — رنگ بدلا ہے مرے دل نے صنم خانے کا

داغِ دل قبر کی ظلمت میں ہے بے نور ایسا — جیسے دیکھا ہو چراغ آپ نے ویرانے کا

حسن اور عشق کے نیرنگ خدا ہی جانے — شمع جلتی ہے کہ دل جلتا ہے پروانے کا

دیکھ خونِ سرِ فرہاد کا رنگیں پتھر — یہ نگینہ ہے بنایا ہوا دیوانے کا

نزع اک عید ہے روتے ہوئے وہ آئے ہیں — اے دلِ زار یہی وقت ہے مر جانے کا

اہلِ دل جاگتے سوتے میں تمنا کرتے ہیں
وقت کوئی نہیں ثاقب مرے افسانے کا

۲۵- اگست ۱۹۱۱ء

تمام عمر کی غفلت کے بعد خواب آیا — اُٹھا جو پردۂ ہستی، مجھے حجاب آیا

اجل نصیب تھا، شامِ وصال خواب آیا — وہ بے حجاب ہوئے تو مجھے حجاب آیا

بلا ہے، عہدِ جوانی سے خوش نہ ہو اے دل — سنبھل، کہ عمر کی دنیا میں انقلاب آیا

بڑھائے حوصلے دریا دلی نے ساقی کی — زرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا

کوئی صدا نہیں آتی کہ کون ہے، کیا ہے — کہاں بھٹک کے دلِ خانماں خراب آیا

اُمید و بیم میں رکھا تمام رات مجھے — کبھی نقاب اُٹھائی کبھی حجاب آیا

زمانے والوں کو پہچاننے دیا نہ کبھی — بدل بدل کے لباس اپنے انقلاب آیا

سوائے یاس نہ کچھ گنبدِ فلک سے مِلا — صدا بھی دی تو پلٹ کر وہی جواب آیا

اُڑا کے ہوش ہوا ہو گئی تجلّیِ طور — سبھوں سے آنکھ چراتا ہوا حجاب آیا

حریفِ مے نہیں سمجھا تو کیوں مری جانب — لہو کے گھونٹ پیئے ساغرِ شراب آیا

ہٹے نہ اپنی طبیعت سے حسن و عشق کبھی — ہزار بار زمانے میں اِنقلاب آیا

سُنائیں کیا تمھیں نیرنگِ عشق کا قصّہ — تمام عُمر نہ آنکھیں کھُلیں نہ خواب آیا

کھٹک وہ دل میں ہے پیدا جو آج تک نہ ہوئی — سمجھ رہا ہوں کہ طفلی گئی شباب آیا

کفن پہنا دیا تھا تب صنم پرستی نے
خدا کے سامنے جاتے ہوئے حجاب آیا

۶- جولائی سنہ ۱۹۱۲ء

تیر اُس سے چھپکے پھر کیوں سمٹ کر رہ گیا
اے شبِ وصلت یہ کیسا داغ دل پر رہ گیا

خون کا دھبہ سا سرِ لوحِ مقدر رہ گیا
کھینچ کر خطِ شہادت اُنکا خنجر رہ گیا

موت ہی اچھی کہ آئی تو مرادِ اہلِ ہجر
میری شہ رگ سے لپٹ کر اُنکا خنجر رہ گیا

عشق کی دو چار راہیں ہیں تو دل کو ڈھونڈ لوں
مجھکو کیا معلوم کس کوچے میں مر کر رہ گیا

رات بھر نقش و نگارِ حُسن دل میں تھی نمود
صبح کے ہوتے ہی سادہ ہو کے دفتر رہ گیا

بنکے عبرت کی زباں کہتا رہیگا کچھ نہ کچھ
صحنِ گلشن میں اگر میرا کوئی پر رہ گیا

ایک دم میں ہاتھ سے جاتا رہا میں منزلیں
عالمِ محسوس میں پل بھر کے خنجر رہ گیا

مرنے والوں کو نہ پوچھ اے کشتۂ نیرنگِ دہر
بس اُسی کی زندگی ہے جو تڑپ کر رہ گیا

ایک ساغر باقی ہے اُس پہ بھی ہے قاتل کی نگاہ
عمر بھر ہم اور تیرا ساتھ دم بھر کر رہ گیا

خوب سنبھلا ہیں نگاہِ مستِ ساقی کے حضور
کانپتے ہاتھوں سے گرتے گرتے ساغر رہ گیا

میں نہیں ہوں لیکن مرا افسانہ اُنکے دل میں ہے
جانتا ہوں میں کہ کس رگ میں نشتر رہ گیا

سر فروشِ مے ہیں ہم، ساقی رہے اتنا خیال — خون اُبلے گا جو خالی کوئی ساغر رہ گیا

امتحاں گاہِ جہاں میں انتخاب اتنا ہوا — اک مرا سر ایک قاتل ایک خنجر رہ گیا

انکی بزمِ ناز میں تو سانس بھی دل نے لی — نالہ کش برسوں کا اک تصویر بنکر رہ گیا

رات دن کرتے ہیں ثاقبؔ دوست کے گھر کا طواف
کچھ ملے ہی گا جو گردش میں مقدر رہ گیا

۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء

دل کہاں افسوس ذکرِ دل زباں پر رہ گیا — خنجر اُنکے پاس میرے دوش پر سر رہ گیا

آشیانے کے تنزل سے بہت خوش ہیں کہ وہ — اسقدر اُترا کہ پھولوں کے برابر رہ گیا

شام ہونیکے لئے کافی ہے بزمِ دہر میں — وہ جگر کا داغ جو آنکھوں کے اندر رہ گیا

دنگ ہے صیاد دستکر کے شہپر لئے قفس — عمر جو گزری چمن میں اُس کا دفتر رہ گیا

قصۂ طوفاں کو ڈھونڈھونگا دلوں سے ایکدن — گر شبِ فرقت رہی اور دیدۂ تر رہ گیا

آبِ خنجر سے بجھائی تم نے برسوں کی لگی — خون کی ٹھنڈک ذرا دیکھو کہ جم کر رہ گیا

مرنیوالوں نے بڑی حسرت سے کھولی تھی زبان — آپکے آگے کہاں وہ شورِ محشر رہ گیا

در پہ لینے کے لئے آیا تھا، کچھ دینا پڑا — اُٹھ گیا میں سنگِ در پہ جب مرا سر رہ گیا

ضعف میں تھکر کہیں بیٹھا تو اُٹھنا ہی محال ۔۔۔ نقشِ پا ہوں رہگیا جس سر زمیں پر رہگیا

صبر کی سِل رکھکے دل پر پھر کوئی اُٹھا نہیں ۔۔۔ لوحِ تربت بنکے سینے پر یہ پتھر رہگیا

دِل کے نالے سدِّ راہِ صبح تھے شامِ فراق ۔۔۔ ہوکے اُونچا نعرۂ اللہ اکبر رہگیا

توڑ کر پھینک اِسکو میرا خونِ ناحق پوچھکر ۔۔۔ رات دِن تجھکو رُلائے گا جو خنجر رہگیا

شکوہ کیا بی سے دل کو زیبا ہو تو کیوں ۔۔۔ دیکھکر ساقی کا مُنھ محفل میں ساغر رہگیا

دستِ بُردِ چرخ سے بچنا کسی کا تھا محال

دردِ دل ثاقب مرے سینے میں کیونکر رہگیا

۸ - مئی ۱۹۱۵ء

راحتوں میں بھی جنوں کا وہی ساماں ہوتا ۔۔۔ پھیلتا بھی دلِ عاشق تو بیاباں ہوتا

دیکھتا حسن کا عالم، جو نہ حیراں ہوتا ۔۔۔ خیر یوں بھی سہی، دل تو نہ پریشاں ہوتا

ہے بڑے کام کی گم گشتگیِ ہوش و حواس ۔۔۔ آئینہ سنگ سے کم تھا جو نہ حیراں ہوتا

جیتے جی سایۂ دیوار چمن تک نہ گیا ۔۔۔ مرکے کیا پھول کا شرمندۂ احساں ہوتا

گردشیں تھیں جو مقدر میں تو اس کام آتیں ۔۔۔ ایک چھوٹا سا طوافِ درِ جاناں ہوتا

آبِ شمشیر گذرتا مرے سر سے، توبہ ۔۔۔ ہاں، مگر قلزمِ خوں تا بہ گریباں ہوتا

پھر بھڑک اٹھتے ذرا بجھ کے خاموش چراغ | انکے ہاتھوں جو مزارِ دلِ ق چراغاں ہوتا
تختۂ مشقِ حوادث تھا، اکیلا ہی رہا | دل بھی وہ گھر تھا کہ جس میں کوئی مہماں ہوتا
خونِ دل رنگ بدلتا نہ اگر اشکوں کا | یہ سمندر مرے زخموں کو نمکداں ہوتا
سہل میرے لئے جمعیتِ دل تھی لیکن | کوئی ہوتا، جو مری طرح پریشاں ہوتا
نبض و دل ڈوب گئے ہجر میں روتے روتے | اور کیا چاہئے ہو، نوح کا طوفاں ہوتا
دیکھتا وسعتِ دنیا کا تماشا میں بھی | دل کا عالم جو زمانے میں نمایاں ہوتا
کشتۂ آفتِ تقدیر ہے ہر شمع و چراغ | آگ لگتی نہ، تو پھر کیوں کوئی عریاں ہوتا
دشمنِ زینتِ محبوب نہیں آہِ رسا | انکا گیسو، مرا دل تھا، جو پریشاں ہوتا
میں نہ جی اٹھتا، مگر قبر پہ آتے تو کبھی | کچھ نہ ہوتا، تو یہ کیا کم تھا کہ احساں ہوتا
جھگڑے آپس کے ہیں، دل کہتا ہے بس وحشت بس | ہاتھ کہتے ہیں کہ گریباں پہ گریباں ہوتا
آفتِ جاں تھے شبِ غم کے ڈرانے انداز | دل تو دل ہی تھا، کہاں تک نہ پریشاں ہوتا

وائے قسمت کہ مرا خاک شدہ دل ثاقب
جل نہ جاتا تو چراغِ شبِ ہجراں ہوتا

۹۔ مئی سنہ ۱۹۱۴ء

خطا نہیں ہے جو دلِ حسن آشنا نہ رہا — مرا قصور کہ پہلو کو دیکھتا نہ رہا

گلہ رہا مگر الفت کا حوصلہ نہ رہا — جنون کا بھی کوئی ٹھیک ہی رہا نہ رہا

بیانِ حال کا نیرنگِ عشق دشمن ہے — اِدھر وہ سامنے آئے اُدھر گلا نہ رہا

شبِ فراق میں دل سے بھی بات کہہ نہ سکا — وہ تخلیہ تھا کہ کوئی مرے سوا نہ رہا

تلاشِ دوست میں تھا پھر لحد میں کیوں ٹھہرا — میں تھک گیا ہوں کہ اب آگے راستا نہ رہا

اُٹھانے والوں نے پہونچا دیا سرِ منزل — شہیدِ ناز بغیر آپ کے پڑا نہ رہا

فغاں سے کچھ تو بہلتا دل اے اسیرِ بلا — قفس میں کس لیے کمبخت بولتا نہ رہا

یہ تلخکامیِ حسرت فنا سے بدتر ہے — ثمرِ حیات کا کیا جب کوئی مزا نہ رہا

شبِ فراق میں شکوے ہزار دل میں تھے ثاقب
یہ کیا کہ صبح ہوئی اور کوئی گلا نہ رہا

۲۱- جون ۱۹۱۳ء

سر تھا وہ نذرِ عشوۂ جانانہ ہو گیا — سودا رہا وہ عشق کا افسانہ ہو گیا

دل مرکزِ امید جہاں تھا پر اب کہاں — جو شمع تھا کبھی وہی پروانہ ہو گیا

کہتی تھی جس کو بیٹھ کے پہروں شبِ فراق — مرتے ہی میرے ختم وہ افسانہ ہو گیا

میری قضا تھی برقِ تجلّی کا کیا قصور
بدنام مفت جلوۂ جانانہ ہو گیا

کہہ ڈالی حرصِ مے نے گدائی کی داستان
کشکول [illegible] ہاتھ میں پیمانہ ہو گیا

ہے بیخودی میں بھی وہی خود مطلبی دل
ناصح یہ آنکھ پڑتے ہی دیوانہ ہو گیا

کچھ موت ہی پہ حصر نہیں زندگی میں کچھ
جو آنکھ سے چھپا وہی افسانہ ہو گیا

وارفتہ زلف کا نہیں پابندِ فصلِ گل
جب دل میں لہر آ گئی دیوانہ ہو گیا

خوش کر سکا نہ میکدۂ دہر دل مرا
چھوٹا سا ایک جلسۂ رندانہ ہو گیا

زادِ حیات دے نہ سکا قصدِ دل کا ساتھ
اُس در پہ جاتے جاتے میں افسانہ ہو گیا

طوفانِ خواہشِ بشری اُٹھ کے ہر طرف
دُنیا میں جا بجا بُت و بتخانہ ہو گیا

چھڑوائی میکشی بھی صفائے شراب نے
ساغر کو دیکھتا ہوں کہ میخانہ ہو گیا

صیاد چھیڑ چھیڑ کے سن مجھ سے ذکرِ گل
جو دل کا مدعا تھا وہ افسانہ ہو گیا

خالی ہے جامِ زیست مگر کہہ رہی ہے موت
لبریز تیری عمر کا پیمانہ ہو گیا

وہ حسنِ دوست اور مرے دل کا ماجرا
تصویرِ شمعِ محفل و پروانہ ہو گیا

ثاقبؔ سیاہ خانۂ دل میں یہ داغِ عشق
اِک چاند ہے کہ زینتِ کاشانہ ہو گیا

۲۶-جون ۱۹۱۳ء

بے پردہ شب جو عارضِ جانانہ ہو گیا — محفل میں جو چراغ تھا پروانہ ہو گیا

میری دو روزہ عمر نے کچھ کام کر لیا — تیار آپ کے لیے افسانہ ہو گیا

جو پائے مَے وہ کیوں ہیں جنھیں اشتیاق ہیں — جو در کھلا ملا درِ میخانہ ہو گیا

منّت پذیرِ گردشِ افلاک کیوں نہیں — دل پس کے خاکِ کوچۂ جانانہ ہو گیا

غفلت کی نیند خوب نہیں باغِ دہر میں — سبزہ ذرا سے خواب میں بیگانہ ہو گیا

آساں نہیں ہے خانۂ الفت کی بود و باش — دل کچھ سمجھ کے عشق میں دیوانہ ہو گیا

ساقی نے کیا پلا دیا اے پاک دل تجھے — آزاد ہو کے بندۂ میخانہ ہو گیا

پہلو سے جانے والے پلٹ آ کسی طرح — اے دل وہی ہوں میں تو ہی بیگانہ ہو گیا

اے گرد گارِ عشق کدھر جا رہا ہوں میں — ہر سمت یہ صدا ہے کہ دیوانہ ہو گیا

وحشت کے راز کھول دیئے ذکرِ عشق نے — نشتر رگِ جنوں کو یہ افسانہ ہو گیا

ہر دم ہے اب نئی خلشِ غم کہ دل مرا — صورت نمائے جلوۂ جانانہ ہو گیا

غربت دلا رہی ہے مجھے اپنے گھر کی یاد — لیکن یہی کہ مٹ گیا ویرانہ ہو گیا

آساں نہیں ہے بگڑے ہوؤں کا سنوارنا — صد چاک اسی خیال میں ہر شانہ ہو گیا

جینے کا اب مزہ نہیں ثاقب کہ عشق میں
جو دل تھا حرزِ جاں وہی دیوانہ ہو گیا

۶- جولائی ۱۹۱۶ء

ایک مقتولِ جفا و ظلم کے قابل نہ تھا
ورنہ دل کا مارنا آسان تھا مشکل نہ تھا

شوقِ آزادی میں تڑپوں اس پہ راضی دل نہ تھا
ورنہ بنیا ہی سلامت چھوٹنا مشکل نہ تھا

حشر میں وہ سر جھکائے ہیں میں شکوہ کیا کروں
جانے والی جان تھی میرا کوئی قاتل نہ تھا

اب سلیمانی کسے کہتے ہیں بتلا دے مجھے
ایک عالم تھا تری مٹھی میں میرا دل نہ تھا

دے صدا اے دل مگر نقشِ قدم کو دیکھ کر
ایسے بھی در ہیں کبھی جن پر کوئی سائل نہ تھا

خاص وقتِ یادِ گلشن اور میرا چھیڑنا
شب کو بھی صیاد میرے نغمے سے غافل نہ تھا

صبح و شامِ غم نے دامن بھر کے بھیجا دہر سے
ورنہ اِس عمرِ دو روزہ کا کوئی حاصل نہ تھا

اُنکی قدرت ناتوانوں کو بھی دیتا ہے عروج
آسماں کے سر چڑھے نالہ تو اِس قابل نہ تھا

تیرے نقشے نے بھی فرقت میں نہ بہلایا مجھے
شامِ غم جب آ گئی گردوں پہ مہِ کامل نہ تھا

دیکھ لیتے دو قدم چل کر کہ مطلب تھا یہی
در پہ جو آیا تھا وہ بیمار تھا سائل نہ تھا

قلبِ سوزاں اور یہی دھوکا نہ کھانا دہر میں
رہ گیا جو آگ دیکر سنگ تھا وہ دل نہ تھا

کچھ سنبھل جاتا، اگر کروٹ بدل جاتے مری
یہ مجھے دشوار تھا، اُنکے لیے مشکل نہ تھا

ڈوبتا تھا دل، شبِ وصل آچکی تھی تا سحر
ایک تنکے کا سہارا ابھی لبِ ساحل نہ تھا

اس دلِ گم گشتہ مطلب کے سبب سے دہر میں
کون سا دن تھا کہ میں آوارہ منزل نہ تھا

ایک جلتی شمع اُٹھوا دی، بہت اچھا کیا
سوختہ دل تھا میں، کوئی رونقِ محفل نہ تھا

شامِ غم جس میں رہے، بس وہاں کیا عید ہو
وہ تو آجاتے، مگر یہ دل ہی اس قابل نہ تھا

جز فریبِ حُسن اور اُلفت کو ثاقب کیا کہوں
زندگی سی شے کبھی اس پر بھی دل مائل نہ تھا

۲۰- جون ۱۹۱۱ء

سوالِ دید پہ منظور ہے اُنکو سزا دینا
ذرا برقِ تجلی بیچ سے پردہ اُٹھا دینا

ستارے ٹوٹکر فرقت کی شب کا حال کہتے ہیں
یہ کیا سوجھا مرے نالوں کو گردوں کا ہلا دینا

سمجھ اے سوزِ دل میری لحد کو اپنی تربت
ہوا جب گل کرے شمعیں تو خود بجھکر جلا دینا

چلا ہوں کوچۂ قاتل کو میں کیوں راہ کھوٹی ہو
ہجومِ یاس ہٹ اسے نامرادی راستا دینا

بھلا ہو عشق کا، اب تو یہی اپنا وظیفہ ہے
بُرا ہیلے سمجھتے تھے کسی در پر صدا دینا

ہوائے کوے جاناں کام لینا جوشِ ہمت سے
دلِ ناکام تھک کر جس جگہ بیٹھے اُٹھا دینا

دلِ زخمی بتا آہوں کی ہاتھوں تجھ پہ کیا گزری
سنا کرتے ہیں کلیوں کا ہوا سے مسکرا دینا

مرا دل بیکس کر چھوڑ آئے یونہی کوچۂ الفت میں
ذرا سی بات تھی ٹھوکر سے مٹی میں ملا دینا

دکھانا صورتِ مظلوم و ظالم میری تربت پہ
جلا کر شمع اک پھولوں کی چادر بھی چڑھا دینا

ہوائے طور بن اے آہِ مجنوں راہِ لیلیٰ میں
ذرا محمل کے پردے کو اٹھا کر پھر گرا دینا

شبِ فرقت حجابِ جسم باقی رکھ نہیں سکتی
یہ مانا کارِ شامِ وصل ہے پردہ اٹھا دینا

جو سر کٹوا کے سوئے تھے وہ دعویدار اٹھے ہیں
قیامت آ رہی ہے حشر والو راستا دینا

تجھے اوروں کی خاطر چھوڑے جاتا ہوں نہیں ہے عبرت
مرے بعد آنے والوں کو مرا قصہ سنا دینا

ہزاروں داغ ہیں دل میں کہیں پردہ نہ کھل جائے
ادھر آنا تو پہلے ان چراغوں کو بجھا دینا

تجلی چھن چکی جب پھر حجاب اے دل نشیں کیسا
مری جاں اب تمھیں خود چل کے پردہ اٹھا دینا

پسینا آ گیا مجھکو گناہوں کی ندامت سے
ذرا اے ابرِ رحمت اپنے دامن کی ہوا دینا

جو اچھا کر نہیں سکتے تو کیوں تڑپوں میں بستر پر
دعا دینا نہیں آتا تو سیکھو بددعا دینا

دلِ ناداں کبھی ناکامیاں بھی کام آتی ہیں
جدھر سے کچھ نہیں ملتا ادھر بھی اک صدا دینا

مرا دل محرمِ اسرارِ حسن و عشق تھا ثاقب
قرینِ مصلحت تھا مجھکو دیوانہ بنا دینا

۱۲- نومبر ۱۹۱۱ء

وہ نہیں ہوں میں کہ جس پر کوئی اشکبار ہوتا
کبھی شمع بھی نہ روتی جو مرا مزار ہوتا

شبِ غم میں زندگی کا کِسے اعتبار ہوتا
مری جان جا چکی تھی جو نہ انتظار ہوتا

مری داستانِ غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں
کچھ انہیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا

یہی سوزِ عشق جس کو میں ہمیشہ راز سمجھا
جو حجابِ دل نہ جلتا تو نہ آشکار ہوتا

میں شکایتِ زمانہ جو کروں تو کیا سمجھ کر
نہ یہ دورِ چرخ ہوتا نہ یہ روزگار ہوتا

دلِ پارہ پارہ تجھکو کوئی یوں تو دفن کرتا
وہ جدھر نگاہ کرتے اُدھر اِک مزار ہوتا

مے عشق جوش زن ہے یہ انہیں کو نہیں
مرا نشہ کیوں اُترتا مجھے کیوں خمار ہوتا

میرے دل نے بڑھ کے روکا تری تیرِ جانستاں کو
جو یہ بیچ میں نہ پڑتا تو جگر کے پار ہوتا

وہ لحد پہ اُنکا آنا وہ قدم قدم پہ محشر
مری نیند کیوں اُچٹتی اگر ایک بار ہوتا

شبِ ہجر بعد میرے اگر اس جہاں میں رہتی
تو یہی سیاہ دفتر مرا یادگار ہوتا

جو ہمارے دیکھنے کو کبھی آپ آنکلتے
وہی آنکھ در پہ ہوتی وہی انتظار ہوتا

وہ شباب کے فسانے جو میں سن رہا ہوں دل سے
اگر اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

یہ زمانہ بڑھ رہا ہے فقط اضطرابِ دل سے
شبِ غم نہ یوں ٹھہرتی جو مجھے قرار ہوتا

وہ جہاں میں آگ لگتی کہ بجھائے سے نہ بجھتی
مرے دودِ دل میں ثاقبؔ جو کوئی شرار ہوتا

۱۶- ستمبر سنہ ۱۹۱۷ء

رو کر حریفِ گنبدِ خود کام ہو گیا
نالہ کیا تو جنگ کا پیغام ہو گیا

آتے ہی وقفِ کاہشِ انجام ہو گیا
دنیا میں زندگی کا فقط نام ہو گیا

اچھی تھی مرگِ عشق یہ بدنام ہو گیا
میرے ہی سر وفا کا بھی الزام ہو گیا

مینائے مے ہوا مجھے ہر خوشۂ عنب
جس پھول پر نگاہ پڑی جام ہو گیا

عزت سے بزمِ گل میں رہا آشیاں مرا
تنکوں کی کیا بساط مگر نام ہو گیا

دن بھر کا ضبط آگ لگائے نہ کیا کرے
آخر کو دل چراغِ سرِ شام ہو گیا

تھا اشتباہِ درد کھٹک زندگی کی تھی
اے دم ترے نکلتے ہی آرام ہو گیا

دن ڈھل چکا شباب کا آخر ہے سوز بھی
دل جل کے آفتابِ لبِ بام ہو گیا

اے عشق زندہ باش مٹا میں تو کیا ہوا
جو کچھ ہوا ہوا یہ ترا کام ہو گیا

اک میرا آشیاں ہے کہ جل کر ہے بے نشاں
اک طور ہے کہ جب سے جلا نام ہو گیا

مر کر جہاں نما ہے سرِ جم کہ ٹوٹ کر
عبرت کی مے کے واسطے اک جام ہو گیا

صحرانورد ہو کے ہے محفل پسندِ حسن — وحشی مزاج دل تھا مگر رام ہو گیا

حلقہ بگوشِ خانہ خرابی ہے عشق میں — لو اب تو کام کا دلِ ناکام ہو گیا

خلوت پسند حشر سے خوش ہو کے کیا کریں — وعدے کا روز جلوہ گہِ عام ہو گیا

میں قید میں تھا چپ مگر آخر نہ چھپ سکا — مشہور قصۂ قفس و دام ہو گیا

خوش گوئیاں مخالفِ طبعِ زمانہ تھیں
ثاقب انھیں گنوں سے تو بدنام ہو گیا

۴- جون ۱۹۱۸ء

آڑ میں کوئی چھپا ہو گا بس اتنا یاد تھا — پتّا پتّا باغ کا میرے لیے صیّاد تھا

ابتدائے کار حسن نے کی وہی اُستاد تھا — آئینہ تعلیم گاہِ مانی و بہزاد تھا

اپنی بربادی سے دشمن کا مکان آباد تھا — رات تھی میں تھا مری فریاد تھی صیاد تھا

ں بہت نازاں عروجِ بخت پر صیاد تھا — بات اتنی تھی کہ میں تھا قید وہ آزاد تھا

اور کچھ کھو بیٹھتا ہوں ہوش ہوں وہ یاد ہے — جب وہ پہلو ڈھونڈتا ہوں جو کبھی آباد تھا

قیدِ تنہائی نے پھر زندگی بھر کا ملال — میں جو بھولا تھا چمن میں وہ قفس میں یاد تھا

دل کی جانب کس کو دعوت دوں بلاؤں کس لیے — اب تو ویرانہ ہے گو پہلے کبھی آباد تھا

ہٹ گیا دل مجھکو روتا دیکھکر اچھا کیا — قصرِ خاکی کا بھروسا کیا کہ بے بنیاد تھا

زندگی بھر درد کی اِک روح پھونکا ہی کیا — جو نفس میرا تھا جانِ عالمِ ایجاد تھا

ایک شب میں دو شبیں فرقت کی جیتا کس طرح — آپ کا بھی منتظر تھا، دل بھی مجھکو یاد تھا

دیکھکر مجھکو جنوں میں، دوست دشمن ہو گئے — جسم کا ہر رونگٹا اک نشترِ فصّاد تھا

ہمعنانِ خونِ دل آہن بھی تھا ہنگامِ ذبح — وہ رواں خنجر نہ تھا، بہتا ہوا فولاد تھا

یوں بدل دیں خون نے سارے جہاں کی صورتیں — کھول کر آنکھیں جدھر دیکھا اُدھر صیّاد تھا

رات کو آتی تھی، اک عالم کے رونے کی صدا — جو دہانِ زخمِ دل تھا، اِک لبِ فریاد تھا

وصل کی شب آتے ہی **ثاقب** سحر طالع ہوئی
کوئی کیا کرتا کہ گردوں بر سرِ بیداد تھا

۱۴۔جون سنہ ۱۹۱۸ء

بھولنے والوں کو بھی یہ مٹنے والا یاد تھا — ہم نہ سمجھے تھے کہ اس قابل دلِ ناشاد تھا

ایک دن آباد تھا، تو ایک دن برباد تھا — دل مرا صورت نما کے عالمِ ایجاد تھا

کس ہجومِ نامرادی میں دلِ ناشاد تھا — بیچ میں تھا میں اُدھر گلچیں اُدھر صیاد تھا

حشر میں میرا لہو چھپتا تو آخر کس طرح — آپ بھی بھولے نہ تھے، مجھکو بھی کچھ کچھ یاد تھا

اس زمیں سے اُٹھ چلوں دل کا ارادہ تھا یہی　　رات گردوں سے بلند آوازۂ فریاد تھا

کچھ مرے نالوں کو سمجھا نغمہ ہے یا داستان　　وجد کے عالم میں تھا یا نیند میں صیاد تھا

واہ ری ہمت کہ حسنِ نکتہ بیں بھی تھا خموش　　عشق گو دل کے لئے اک کارِ بے اُستاد تھا

صحنِ زنداں و چمن میری نظر میں ایک ہیں　　قید سے گھبرائے وہ جو رنج سے آزاد تھا

اشکِ غم آنکھوں میں جب نایاب ہم سے تھے　　دل کے زخموں میں بہم شورِ مبارکباد تھا

کچھ کہیں لیکن یہ ہے اُنھیں کا جرم ہے　　ہاتھ رک جاتے تو عاجز خنجرِ فولاد تھا

دل کہ جسکی خانہ ویرانی کا تم کو غم نہیں　　کیا بتائیں ہم تمھیں اس گھر میں کون آباد تھا

نغمہ سنجانِ گلستاں پر یہ شب کیسی کٹی　　صبحدم تا دور شورِ نالہ و فریاد تھا

ذرّے ذرّے سے عیاں ہے داستانِ اہلِ دل　　غازۂ سنگ ایک دن خونِ سرِ فرہاد تھا

کیا دھرا ہے اب یہاں بس ایک سناٹا سا ہے　　ہاں چمن کو دیکھتے جب آشیاں آباد تھا

موت کی خواہش نہ تھی اُنکو رُلانے کے لئے
یہ بھی ثاقب اک علاجِ خاطرِ ناشاد تھا

۲۲- دسمبر ۱۹۱۵ء

اُنکی آرائش سے میرے کام بن جائینگے کیا　　دل کی گتھی شانہ ہائے زلف سلجھائینگے کیا

وصل کے وعدے سے خوش ہو کر نہ مر جائینگے کیا — نامہ بر ہنستا ہوا آتا ہے خود آئینگے کیا

قیدیِ غم تر ہیں تو نہیں، اور اُنکو یہ خیال — کاٹنے میں اک شبِ فرقت کے مر جائینگے کیا

کام اپنا کر چکے اہلِ وفا، شک ہو تو ہو — سر نہیں باقی شہیدوں کے قسم کھائینگے کیا

عرضِ مطلب کے لئے اے دل زباں کھلتی نہیں — کچھ اشارے میں کرونگا، وہ سمجھ جائینگے کیا

ہاتھ اُدھر اُٹھتا نہیں ہے تار ادھر باقی نہیں — دینگے وہ کیا اور ہم دامن کو پھیلائینگے کیا

قصۂ فرہاد و مجنوں کیوں سناتے ہو ہمیں — جب پریشانی سے مطلب ہے تو گھبرائینگے کیا

میہمانِ کوئے جاناں ہو کے دل بیتاب ہے — میں تو سمجھاتا نہیں، وہ بھی نہ سمجھائینگے کیا

مست رہتے ہیں ہمیشہ مے فروشانِ جمال — ہم تو مانگینگے کوئی ساغر، وہ فرمائینگے کیا

کیوں نہ چپ بیٹھوں قفس میں دو رہی فصلِ بہار — آہ و زاری سے مری موسم بدل جائینگے کیا

تنکے تنکے کا خدا حافظ، چلے ہم باغ سے — الوداع اے آشیاں اب جا کے پھر آئینگے کیا

دل کی بیماری کا عقدہ کھولنا دشوار ہے
جو نہیں سمجھے وہ ثاقب مجھکو سمجھائینگے کیا

۲۳- فروری ۱۹۲۵ء

آتشِ دل کا نور ہے فیض ہے التہاب کا — جلوۂ داغِ عشق ہے نام ہے آفتاب کا

فاتحہ کچھ برا نہ تھا قبرِ شہیدِ ناز پر — پرورشِ وفا بھی تھی کام بھی تھا ثواب کا

تیرے ہی اضطراب سے کچھ نہ رہا حیات میں — جنبشِ دل سے پلٹ گیا رخ مرے جامِ آب کا

خار کوئی چبھا نہیں اس پہ یہ رنگ ہے سبب — زخم مرے بہت ہنسے دیکھکے منھ گلاب کا

دونوں کا ایک کام ہے جب تو یہ فرق کیا ضرور — کیوں نہ شبِ فراق ہو نام تری نقاب کا

فصلِ غم اب بدل چکی حصے میں آ گیا مرے — ہجر ہے جو سدِ باب ہے کشورِ انقلاب کا

کر کے سپید موے سر صبح اگر ہوئی تو کیا — طولِ شبِ فراق میں عہد کٹا شباب کا

دل بھی تو آبگینہ تھا جس پہ سپھر پھٹ پڑا — ایک ذرا سی چوٹ میں سر اٹھا حباب کا

تارِ نفس ہیں ہم نوا نوحۂ دل کے رات دن — بزم میں میری ذکر کیا چنگ کا یا رباب کا

دل کو چھپاؤں کس طرح جسمیں ہیں لاکھوں مشعلیں — دہر میں ایک داغ سے نام ہے ماہتاب کا

مجھ سے نہ پوچھ حالِ دل جو رہے جور چرخ سے — اس پہ ہر ایک پارہ ہے اک ورقِ انقلاب کا

آتشِ عشق کا اثر دل پہ اگر ہوا تو کیا — تار کوئی جلا نہیں جامۂ اضطراب کا

دیکھیے عشق سوزِ غم پوچھ رہا ہے دل مرا — میکدہ کس طرف کو ہے ساغرِ آفتاب کا

دل میں ہے ثاقب آرزو آئے وہ دن خدا کرے

مجھکو طواف ہو نصیب روضۂ بوتراب کا

۱۷- جون ۱۹۱۹ء

صفحۂ دل داغِ حسرت کا رہینِ ناز تھا — صبح تھی اور صبح پر خورشید نور انداز تھا

ساتھ رہ کر وہ نہ آئے کام جن پر ناز تھا — قید میں سر در گریباں ہر پرِ پرواز تھا

اک مرض ہی عالمِ ہستی میں آنا روح کا — جب سے میں پیدا ہوا دردِ دلی دمساز تھا

صبح کو ڈھونڈا کچھ اتنا آپ نے شامِ وصال — جو ستارہ تھا وہ اک داغِ نگاہِ ناز تھا

خاک سے خلقت ہوئی ہی جب مرا غم نہ پوچھ — شمع کا انجام تھا جو وہ مرا آغاز تھا

الفتِ غم نے نہ رکھا امتیازِ صبح و شام — جس نے جب فریاد کی میں اُس کا ہم آواز تھا

تیرے کوچے کی صدا کل شب مجھے تڑپا گئی — دل کا میں کیوں نام لوں لیکن وہی انداز تھا

پھوٹ ڈالی دشمنوں نے ورنہ پہلے عشق کے — دل کو مجھ پر ناز تھا اور مجھکو دل پر ناز تھا

میرے پہلو سے اگر نکلا تو میرا کیا گیا — گم شدہ دل آپ ہی کا ایک مخفی راز تھا

اک مری فریاد سے دنیا کی آتی تھی صدا — تنکا تنکا آشیانے کا جو ہم آواز تھا

لڑکھڑاتے کیوں قدم گر راہ چلتے دیکھ کر — زیرِ پا شاید مزارِ سرفروشِ ناز تھا

دل میں جتنے رنگ تھے نغموں نے وہ سب بھر دیئے — باغ کے پھولوں سے میرا آشیاں ممتاز تھا

گردشِ چشمِ فسوں ساز اور عیسیٰ کا گماں — یہ وہ جادو تھا کہ جو صورت کشِ اعجاز تھا

میں لہو روتا تو کیونکر نالے کرتا کس طرح، دل لبِ خاموش تھا، ہر قطرۂ خوں راز تھا

ضد دلاتا تھا اُنھیں ہنسکر مقامِ صبر میں اس دلِ صدچاک میں جو زخم تھا غمّاز تھا

عمر بھر جلتا رہا دل اور خاموشی کے ساتھ شمع کو اک رات کے سوزِ دلی پر ناز تھا

پردہ در صدہا زبانیں پتّیوں کی ہو گئیں

تخم زیرِ خاک ثاقب ایک مخفی راز تھا

یکم مارچ سنہ ۱۹۱۷ء

جلوۂ حسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا میں نہیں سمجھا مگر ہاں، دل تڑپ کر رہ گیا

ہم مذاقِ دل اگر تھا بھی تو اک طورِ کلیم ہو گیا سرمہ، مگر بارِ تجلّی سہہ گیا

ہوش ہی مجھکو نہ تھا جب پہلوؤں میں لوٹتی تھی مجھکو کیا معلوم، کیا جاتا رہا کیا رہ گیا

کون سی آب و ہوا میں جا کے ڈھونڈوں میں کہ دل یا دھواں ہو کر اُڑا، یا اشک بنکر بہہ گیا

زخم جو خونبار تھے وہ روتے روتے ہنس دیئے کچھ نہ کچھ ناوک ترا قلبِ جگر میں سے کہہ گیا

وقتِ بد تھا مل رہے تھے قطرہ ہائے خون آب کیا خبر آنسو گرا یا دل پگھل کر بہہ گیا

دور کی بھی آنچ ہے ان خشک تنکوں کو بہت کیوں جلے گلچیں اگر میرا نشیمن رہ گیا

حادثوں کے زلزلوں سے جامِ دل چھلکا کیا ایک چلو خون ہی کیا، بہتے بہتے بہہ گیا

وادیِ غربت میں کس سے ہو رفاقت کی امید ۔۔۔ کون دیگا ساتھ جب نقشِ کفِ پا رہگیا

آبلوں میں دل کے شاید خون ہی باقی نہیں ۔۔۔ کھینچکر جب سانس لی دریا لہو کا بہگیا

ذکرِ گلشن کرنے دیتا کون وہ بھی قید میں ۔۔۔ پردۂ فریاد میں جو کچھ تھا کہنا کہگیا

زندگی اچھی سہی، لیکن اسے سمجھے تو کون ۔۔۔ دل نہیں، تو عالمِ ایجاد میں کیا رہگیا

صبح سمجھے تھے کسے ثاقب شبِ غم ہی طویل

دل کا کوئی داغ ہوگا جو چمک کر رہگیا

۲۲-جنوری ۱۹۱۸ء

بس اے فلک نشاطِ دل کا انتقام ہو چکا ۔۔۔ ہنسا تھا جسقدر کبھی زیادہ اُس سے رو چکا

نہ ذکرِ انبساط کر کہ دورِ عیش ہو چکا ۔۔۔ خوشی کی فکر کسلئے، وہ دل کہاں جو کھو چکا

یہ خندۂ طرب نما مبارک اہلِ دہر کو ۔۔۔ بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا

وفا جو زندگی میں تھی وہی ہی بعدِ مرگ بھی ۔۔۔ یہ امتحان رہگیا وہ امتحان ہو چکا

نہ دم ملے اسے سرشکِ غم تجھے قسم ہے عشق کی ۔۔۔ فلک کو چھوڑتا ہے کیوں اگر مجھے ڈبو چکا

رہے وہ دل میں تو مگر سنبھل سکا نہیں ۔۔۔ مزاجِ حسن و عشق کو بہت دنوں سمو چکا

یہ آشیانہ ستم چمن میں ہو تو خوب ہے ۔۔۔ یہ جی میں ہے کہ لے اُڑوں قفس تو میرا ہو چکا

خبر نہیں یہ جاگنا ہے زیست تک کے بعد بھی — جو ساتھ دل رہا یہی تو میں لحد میں سو چکا
نکل کے راہِ عشق سے کسی طرف چلوں تو کیا — کہاں سے لاؤں جان و دل یہ دے چکا وہ کھو چکا
یہ تو نہیں کہ وعدۂ وفا کو روندتا پھرے — یہ میں ہوں سرفروشِ دل جو کہہ دیا وہ ہو چکا

یہ ثاقبؔ ایک سلک ہے خزانہ ہائے راز کی
گہر وہ شاہوار ہیں جنہیں میں یوں پرو چکا

۳۱ - جنوری ۱۹۱۸ء

طلوعِ صبح ہے نہ رو جو کچھ ہوا وہ ہو چکا — اب اور کیا خیال ہے سوادِ شب تو دھو چکا
چمن ہے زیرِ آسماں نہ بھول اس بہار پر — بنا لے آشیاں مگر سمجھ کہ قید ہو چکا
نہ ڈھونڈ اہلِ دل کو اب کہ جوشِ قلزمِ فنا — متاعِ درد جنمیں تھی وہ کشتیاں ڈبو چکا
کہاں سے لاؤں ڈھونڈ کر میں اُنکے تیرِ ناز کو — جہان میں کیا ملیگا وہ جو دل کے پار ہو چکا
شہیدِ غم کی لاش پر نہ سر جھکا کے روئیے — وہ آنسو انکو کیا کرے جو منہ لہو سے دھو چکا
جفا کے ساتھ قصۂ وفا اگر رہا تو بس — تمہیں زمانہ ہنس چکا مجھے زمانہ رو چکا
یہ ذرہ ہائے کوئے دوست راہزن ہیں شوق کے — ابھی ابھی یہیں کہیں میں اپنے دل کو کھو چکا
نگاہِ واپسیں بھی اب مجھے جواب دے چکی — بس اپنے گھر سدھاریئے فسانہ ختم ہو چکا

ذرا کمی نہیں ہوئی وہی ہے حالِ سوزِ دل
ہزار ثاقبؔ آستین و جیب کو بھگو چکا

۱۱- دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء

ہر طرف گو اشکِ غم سے اک جہانِ آب تھا
موت آ پہنچی کہ بحرِ زندگی پایاب تھا

حلقۂ دامِ بلا میں پھنس کے پھر نکلا نہ میں
زندگی بھر جو نہ ٹوٹا یہ وہی گرداب تھا

نُزہتِ ایامِ عشرت پر ہیں نازاں کیوں حسیں
جو نظر آیا انھیں، وہ میرا دیکھا خواب تھا

غافلوں کو صاف دکھلائی نہ دی تصویرِ موت
پاس تھا آئینۂ ہستی مگر بے آب تھا

فہمِ عالم سے کہیں بالا تھا دل کا اضطراب
جسکو پہچانا جہاں نے وہ فقط سیماب تھا

قوتِ غم دیکھ، زورِ ناتوانی پر نہ جا
زلزلے عالم میں تھے جب دل مرا بیتاب تھا

بے جرس چلتا نہیں ہے کاروانِ اشکِ غم
نالۂ شبگیر اک آوازۂ سیلاب تھا

یا مرے رونے سے یا تصویرِ عالم تھی یہی
جب کھلیں آنکھیں تو عالم دیدۂ پُرآب تھا

منفعل ہوں میں کہ ٹکڑے ہو گیا دامانِ صبر
اِک ذرا مشکل مداوائے دلِ بیتاب تھا

تختۂ مشقِ ستم ہو کر بھی محرم ہی رہا
بے سبب آزردہ مجھ سے عالمِ اسباب تھا

ظلمِ دشمن سے طبیعت دیکھتے ہی ہٹ گئی
خون چلّو میں لئے جامِ شرابِ ناب تھا

اضطرابِ دل بہت ممکن ہے ہمت چاہیئے | کیوں رہیں حسرتِ صورت کشی سیماب تھا
عام اثر تھا امتحان گاہِ وفا میں ظلم کا | میری آنکھوں کی طرح خنجر ترا پُر آب تھا
آج تک نکلا نہ میرے کام کا کوئی سبب | میں نہ مانونگا کہ عالم عالمِ اسباب تھا
ہمتِ مشکل پسند، التزامِ قسمت کو نہ دے | دل کا ہر ارمان قفلِ حلقۂ ابواب تھا
اپنے ہی دل کی وفا سے چھپ گئی تکلیفِ ذبح | خونِ گردن عیب پوشِ خنجرِ بے آب تھا
زینۂ رفعت تواضع سے بہم ہے دہر میں | کس قدر پُر مغز وعظِ منبر و محراب تھا
میں نہ روتا گر تو عمرِ ہجر کیوں ہوتی دراز | مانعِ دیدارِ وصلت یہ حجابِ آب تھا

جلوۂ مقصد نظر آیا کہ دیکھی شکلِ دوست
وقتِ نزعِ روحِ ثاقبؔ روزِ فتح الباب تھا

۱۸۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء

معلوم تھا، یہ رسمِ دنیا نباہتا تھا | کہتا تھا میں کہ کیا ہی جب دل کراہتا تھا
برباد کرکے چھوڑا آپس کے مفسدوں نے | جو کچھ میں چاہتا تھا، وہ دل نہ چاہتا تھا
کیا ضبطِ درد کرتا دل کا علاج لیکن | جو کچھ میں کہہ چکا تھا اُسکو نباہتا تھا
بیگانہ وار اپنے خوش تھے مری فنا سے | اُنکی بھی تھی یہ مرضی گردوں بھی چاہتا تھا

پوچھو نہ ہم سے جو کچھ بیمارِ غم پہ گزری ذرے تڑپ رہے تھے جس جا کراہتا تھا
ہر قلب معترف تھا جانبازیوں کا میری خاموش اک تمہیں تھے عالم سراہتا تھا
بے التفاتیوں سے دل مر گیا ہے ورنہ کیا کیا نہ تھیں مرادیں کیا جی نہ چاہتا تھا
کوئی تو داد دیتا اس دردِ دل کی آخر جب تم نہ بولتے تھے تب میں کراہتا تھا

اب تک نہ سمجھی دنیا اس طولِ زندگی پر
تم سے فلک سے ثاقب کیونکر نباہتا تھا

۱۳- مارچ ۱۹۲۰ء

دل کہتا ہے غم کا کوئی ساماں نہیں دیکھا ہاں سچ ہے ابھی کوچۂ جاناں نہیں دیکھا
محویتِ نافہم پہ غمزہ نہیں زیبا کس چہرے سے آئینے کو حیراں نہیں دیکھا
ٹھہرو میں تو کیا، قافلۂ غم کو لئے ہوں جس میں یہ سمائے وہ بیاباں نہیں دیکھا
بھولا ہے عبث دیکھ کے داماںِ جراحت اس دل نے مرا چاکِ گریباں نہیں دیکھا
پہلے خلشِ دل کے گماں پاس تھی اُنکے ہاں خون میں ڈوبا ہوا پیکاں نہیں دیکھا
کیوں رشک مسرت کو نہ ہو مجلسِ غم پر اس بزم کو عالم میں پریشاں نہیں دیکھا
ہاتھوں کی خطا ہو کہ مقدر کی جفا ہو جو چاک نہ ہوتا، وہ گریباں نہیں دیکھا

چھٹتے نہ، پر اُمیدِ رہائی تو نہ جاتی — کھلتے ہوئے لیکن درِ زنداں نہیں دیکھا

ہم نے تو کبھی مردمکِ چشم سے پہلے — اشکو میں جو ڈوبا ہو وہ انساں نہیں دیکھا

جو سر پہ بلا آئی وہ غفلت ہی سے آئی — بے سوئے ہوئے خوابِ پریشاں نہیں دیکھا

ثاقب اُنھیں کیا یاد کریں ہم کہ جنھوں نے
بھولے سے سوئے گورِ غریباں نہیں دیکھا

۱۳۔ نومبر ۱۹۱۹ء

آنکھ پڑتے ہی نہ تھا نامِ شکیبائی کا — درِ میخانہ تھا نقشہ تری انگڑائی کا

ماسوا اسکے نہیں جس کا کوئی اور شریک — کون بتلائیگا عالم مری تنہائی کا

پاکدامانیِ یوسفؑ تھی زلیخا کی سزا — راستہ چاک سے پیدا ہوا رسوائی کا

سختیاں، ہمتِ دل ہو تو بدل جاتی ہیں — موت، اک کھیل ہے لیکن ترے شیدائی کا

ہمکو اس میکدۂ دہر سے اُمید نہیں — ساغر اُلٹا ہوا ہے گنبدِ مینائی کا

تارِ ملبوس میں تھی یا خطِ تقدیر میں تھی — حال کھلتا نہیں یعقوب کی بینائی کا

آنے دے نیند تو سب سوئیں مگر اے توبہ — نالہ عاشق کا اور اُس پر شبِ تنہائی کا

دلِ نازک متحمل نہیں غم ہو کہ سرور — پھول مقتول ہے خود اپنی ہی رعنائی کا

نہ ہوا وصلِ تمنا، نہ گھٹی وحشتِ دل — کیا نتیجہ تھا مری بادیہ پیمائی کا

وہ نہ آئیں سرِ بالیں کہ میں بچنے کا نہیں — دم نہ ٹوٹے مرے ساتھ اُنکی مسیحائی کا

آئنہ جس میں سدا ڈوب کے اُبھرا کیا حسن — ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا

ساتھ دینے کا تو احسان ہی مجھ پر لیکن — شمع نے نام ڈبویا مری تنہائی کا

حُسن کے ہاتھ بندھے تو، وہ زرا دیر سہی — مجھ پہ احسان تری آئی ہوئی انگڑائی کا

اسکے سُننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر — رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

شوقِ پابوسیِ محبوب تھا ورنہ ثاقب
سنگِ در پر کوئی موقع تھا جبیں سائی کا

۲۰- مئی ۱۷ء

کیا کہوں، یہ ہی خوشی کا وقت یا فریاد کا — سر جھکائے ہوئے ہیں، ہاتھ اٹھتا نہیں جلاد کا

جنبش انکو دے چلی تھی، جوششِ فصلِ بہار — میرے بازو رہ گئے منھ دیکھکر صیاد کا

مطلبِ دل ہی کہ اُن سے ربط کچھ باقی رہے — وہ سمجھتے ہیں، کہ اس کو عشق ہی بیداد کا

حُسن تھا وہ آگیا جو پردۂ تصویر میں — دل کا نقشہ تھا، جہاں کا نیا قلم بہزاد کا

قید کرتا مجھکو لیکن جب گذر لیتی بہار — کیا بگڑ جاتا ذرا سی دیر میں صیاد کا

دشمنِ اہلِ وفا ہے، یہ تماشا گاہِ دہر — بے ستوں مشتاق تھا خونِ سرِ فرہاد کا

چوٹ دیکر، آزماتے ہو دلِ عاشق کا صبر — کام، شیشے سے نہیں لیتا کوئی فولاد کا

میں تو تھا مجبور رہنے پر کہ تھا پابندِ عشق — کوئی پوچھے، باغ میں کیا کام تھا صیاد کا

دیکھیے تھمتے ہیں کب تک اشک و آہِ اہلِ درد — کشتیِ دل، اور یہ طوفان ابر و باد کا

صبح گو ہوتی نہ تھی، کیوں کی مؤذن نے کمی — ہجر کی شب وقت اچھا تھا خدا کی یاد کا

اب کمی اچھی نہیں، اے نالۂ شبگیرِ دل — کچھ نہ کچھ بستر سے پہلو ہٹ چلا صیاد کا

کام کر جاتے ہیں بے حس بھی اگر حسنِ سعی ہو تو دیکھ — نام تصویروں نے رکھا مانی و بہزاد کا

نیند میں صیاد ہے اور میں چمن کی یاد میں — درد اٹھا ہے مگر موقع نہیں فریاد کا

سرخیِ خوں دیکھیے، پیش آمدِ تقدیر سے — ہوگیا روزِ سیہ، سودائے سرِ فرہاد کا

چار دن کی اس بلندی میں بھی تھی پستی نہاں — آشیانے سے نظر آتا تھا گھر صیاد کا

زیست کے کمزور رشتے، ٹوٹتے رہتے ہیں خود — کن رگوں کے واسطے خنجر بنا فولاد کا

کوئی دنیا میں نہ پایا ہم نے جز طبعِ سلیم
یوں تو ثاقبؔ نام سنتے آتے ہیں اُستاد کا

۱۸ - جولائی سنہ ۱۹۱۹ء

اہلِ غم سے عشرتِ عالم کا ساماں ہو گیا
جب زمیں پر داغ ابھر آئے گلستاں ہو گیا

اپنی حد سے بڑھ کے جاتا کس طرف کوئی دل مرا
جان پڑتے ہی یہ مشتِ خاک بیجاں ہو گیا

عشق کی بعد اب حوادث کی ضرورت کیا رہی
آسماں دم لے کہ میرے مرنے کا ساماں ہو گیا

حشر میں پہچان کر قاتل کا منہ تکنے لگا
جب ضرورت ہوش کی دیکھی تو حیراں ہو گیا

خفتگانِ خاک کتنے بے محل سوئے کہ اب
مجمعِ احباب اک خوابِ پریشاں ہو گیا

انقلاب آ کر مدد دیتے ہیں استعداد کو
کروٹیں بدلیں ہوئے اور انساں ہو گیا

راستہ وحشت کو آخر مل گیا تنگی میں بھی
یہ گریباں تھا جو دو ہاتھوں میں داماں ہو گیا

وسعتِ صحنِ جہاں کچھ کم نہ تھی اے عشقِ دوست
کیوں گھٹا اتنا کہ دل والوں کو زنداں ہو گیا

باغباں کی رائے میں سب بے حقیقت تھے مگر
بعد میرے آشیاں داغِ گلستاں ہو گیا

رک چلا ہے بیچ میں خنجر الٰہی خیر ہو
دم نہ نکلے گا اگر قاتل پشیماں ہو گیا

ایک قطرہ بحرِ عصیاں کا تھا جو یوں سر چڑھا
بہتے بہتے دامنِ عالم میں طوفاں ہو گیا

جب کوئی آنسو مژہ پر آ کے چمکا شامِ غم
میں یہ سمجھا صبح کا تارا نمایاں ہو گیا

شکر شانے کا کروں یا صبر ڈھونڈوں کیا سبب
زلف تو سلجھی مگر ہاں دل پریشاں ہو گیا

کم سے کم پر آج راضی ہیں شہیدوں کے مزار
آپ ہنس دیں گے تو سمجھیں گے چراغاں ہو گیا

جس میں لاکھوں پھول تھے ثاقبؔ وہ باغِ دلکشا
ایک ہی گردش میں گردوں کی بیاباں ہو گیا

۶- مارچ ۱۹۲۶ء

اہلِ دل تھا میں کہ بے جیب و گریباں ہو گیا — آئینہ پتھر تھا، کیا دیکھا، جو حیراں ہو گیا

کس مپرسی میں، مکینِ طاقِ نسیاں ہو گیا — بند رہتے رہتے، جو گھر تھا وہ زنداں ہو گیا

اتحادِ باہمی کا ہے نتیجہ زندگی — ذرّے کیا شے تھے مگر ملنے سے انساں ہو گیا

سلسلہ ذکرِ جنوں کا آج تک باقی ہے کیوں — ختم کب کا قصۂ جیب و گریباں ہو گیا

کہنے سننے پر نہ جا، کر شامِ غم کا اہتمام — اُن کا وعدہ، یوسفِ چاہِ زنخداں ہو گیا

اک بلائے بد تھی ایسی زندگی جو کٹ گئی — زندہ باش اے مرگ، دردِ دل کا درماں ہو گیا

تھک گیا میں ورنہ پہنچی ہمصفیروں تک صدا — ہائے اتنی دور اب مجھ سے گلستاں ہو گیا

دن تو چھوٹا کر دیا پر سوز آہوں نے مگر — دیدۂ تر اس ہوا میں ابرِ باراں ہو گیا

سیرِ عالم کے لئے، کچھ چھوڑ آئی دستِ جنوں — اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہو گیا

سیکڑوں داغوں کے دیتے ہیں، وہ جلوے اب کہاں — دل مٹا، اور مٹ کے بھی صحنِ گلستاں ہو گیا

ہم کو صحرا نے غباری پیرہن پہنا دیئے — جن کا کچھ ساماں نہ تھا، اُن کا بھی ساماں ہو گیا

دل تو ہے سینے میں پر جمعیتِ خاطر کہاں　　اسکا شیرازہ تو زلفوں سے پریشاں ہو گیا

خطۂ جھانسی کہ ہے ثاقبؔ سراسر سنگلاخ
فیض سے خورشید احمد کے گلستاں ہو گیا

۷ دسمبر ۱۹۲۴ء

جو کچھ ہوا عالم میں ہوتا نہ تو کیا ہوتا　　بہتر تھا بگڑنے کو یہ دل نہ بنا ہوتا

جو ایک ہو وہ کیونکر نقشِ کفِ پا ہوتا　　بیٹھے ہوئے اس دل سے ہوتا بھی تو کیا ہوتا

خاکسترِ الفت ہوں اور اس پہ یہ سنتا ہوں　　یوں خاک ہوا تو کیا، رہ رہ کے جلا ہوتا

پوچھا نہ گیا قصۂ محشر میں کہ ظاہر تھا　　اب اس سے زیادہ کیا اظہارِ وفا ہوتا

راہیں نہ اگر ہوتیں دنیا میں جفاؤں کی　　مظلوم کی گردن پر خنجر نہ چلا ہوتا

جلوے میں اثر کیا تھا موسیٰ سے کوئی پوچھے　　کام آ گیا غش ورنہ کیا جانئے کیا ہوتا

نظارہ بھی اک مے ہے گر ہو حدِ طاقت میں　　اتنی کوئی پیتا ہے بدمست گرا ہوتا

یہ کیا تمھیں نیند آئی اور مجھ پہ بگڑتے ہو　　دلچسپ نہ تھا قصہ، تم نے نہ سنا ہوتا

ہاں منصبِ گلچیں تھا تنکوں کا جلا دینا　　تنکا تو نشیمن کا دل میں نہ چبھا ہوتا

خود یاس بھی اک شے ہے میں کب کا چلا جاتا　　اوروں نے اگر یہ در پہلے نہ کھلا ہوتا

آخر تھی بہارِ گل، مرنا نہ تو کیا کرتا　　جب قید کی حاجت تھی، اسوقت رہا ہوتا

نالوں کے لئے ثاقبؔ راتیں نہ ملیں ورنہ
عالم جسے کہتے ہیں، میری ہی صدا ہوتا

۲۴- فروری ۱۹۱۱ء

تم نے بجھا دیا، یہ جفا تھی، کہ پیار تھا　　تصویر میرے دل کی چراغِ مزار تھا

انجامِ کار میں، یہ مرا حالِ زار تھا　　جس شوق میں مٹا تھا وہی دل پہ بار تھا

تھا ہجرِ گل، خزاں میں جو دل بیقرار تھا　　کیا تھا بہار میں، کہ سوا انتشار تھا

سمجھاتا کس امید پہ میں دل کو شامِ غم　　اُس رات زندگی کا کسے اعتبار تھا

منصور نے جو دار پہ چڑھکر نگاہ کی　　ثابت ہوا کہ منزلِ آخر میں خار تھا

مجرم وہ کہہ رہے ہیں شبِ ہجر کا مجھے　　ہاں، اُنکے ساتھ موت کا بھی انتظار تھا

باتوں میں راہِ منزلِ ہستی گزار دی　　دنیا میں جو ملا وہ غریب الدیار تھا

اللہ رے خارِ عشق کی وحشت نوازیاں　　کیا ذکرِ جیب دامنِ دل تار تار تھا

دم بھر کو عاریت کی طرح بھی خوشی نہ دی　　اتنا میں چشمِ دہر میں بے اعتبار تھا

خود دار تھی مٹے ہوئے نازک دلوں کی خاک　　برہم ہوائے تند سے اپنا غبار تھا

آئے ہو وقتِ دفن تو شانہ ہلا کے جاؤ — آنکھ اُس کی لگ گئی ہے جسے انتظار تھا
تیغِ جفا پہ قتل کا الزام کیا ضرور — یہ رشتۂ حیات ہی ناپائدار تھا
تقدیر سے ہے قید و رہائی وگرنہ میں — بیہوش تھا کبھی نہ کبھی ہوشیار تھا
میّت تو اُٹھ گئی، وہ نہ آئے نہیں سہی
ثاقبؔ، کسی کے دل پہ کوئی اختیار تھا

۲۷ جنوری ۱۹۱۹ء

عشقِ مظلوم بے خطا نہ ہوا — حُسن اچھوں میں بھی بُرا نہ ہوا
باوفا ہو کے بے وفا نہ ہوا — ظالموں کو بھی میں بُرا نہ ہوا
سونے والوں کو کیا خبر اے ہجر — کیا ہوا ایک شب میں کیا نہ ہوا
ہنس کے بھی، رو کے بھی کہا لیکن — مطلبِ دل کبھی ادا نہ ہوا
وصل کی رات بھر ہوا نہ تمام — ہجر کی شب ہوئی گلا نہ ہوا
بسترِ اُٹھا نہ کوسے قاتل سے — شکر ہے پاس یہ رہا نہ ہوا
اک بلا تھی جو یہ گرہ کھلتی — عقدۂ دل بھلے کو وا نہ ہوا
دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں — وہ تماشا جو برملا نہ ہوا

کیا کہے بے زباں اسیرِ قفس کیوں ہوا قید کیوں رہا نہ ہوا
آشنا تھا مذاقِ عشق سے دل تلخ کامی سے بے مزا نہ ہوا
کچھ نہ کچھ لے گئے سب اس در سے دینے والے مرا بھلا نہ ہوا
حسرتِ ذبح رہ گئی ثاقب
یہ فریضہ مرا ادا نہ ہوا

۲۱- جنوری ۱۹۱۳ء

بلا ہے عشق لیکن ہر بشر قابل نہیں ہوتا بہت پہلو ہیں ایسے بھی کہ جن میں دل نہیں ہوتا
نشانِ بے نشانی مٹ نہیں سکتا قیامت تک یہ نقشِ حرفِ غلط ہے دہر سے باطل نہیں ہوتا
جہاں میں نا امیدی کے سوا امید کیا معنی سبھی کہتے ہیں لیکن دل مرا قائل نہیں ہوتا
تڑپنا کس کا دیکھو گے جو زندہ ہوں تو سب کچھ ہو بلائے عشق کا مارا کبھی بسمل نہیں ہوتا
صدائیں دے رہا ہوں مدتوں سے اہلِ مرقد کو سبھی سوتے ہیں لیکن یوں کوئی غافل نہیں ہوتا
سرشکِ غم کی حد شام و سحر میں مل نہیں سکتی امنڈتے ہیں جو یہ دریا تو پھر ساحل نہیں ہوتا
دعا دے عشق کو اے ظلم تو بھی زیبِ پہلو ہے وگرنہ کیسا ہی پیکاں ہو لیکن دل نہیں ہوتا
فراموشی ہی لیکن یاد رکھتا ہے ترے در کو درِ اغیار پہ ثاقب کبھی سائل نہیں ہوتا

۲۳- فروری سنہ ۱۹۱۳ء

دہر لا حاصل میں سب کچھ مجھ کو حاصل ہو گیا
یوں جہاں سمٹا کہ پہلو میں مرے دل ہو گیا

نقش کثرت جلوۂ وحدت سے باطل ہو گیا
کوئی قائل ہو نہ ہو بندہ تو قائل ہو گیا

خاک پر سوتا ہی لیکن ڈھونڈھتا ہوں کوے دوست
سہل تھا جو کام وہ ہمت سے مشکل ہو گیا

کل تک آئین وفا تھے اور جاں بخشی بھی تھی
آج کس نے دل کو بھڑکایا کہ قاتل ہو گیا

اور کیا نشو و نمائے عشق ہو اس سے سوا
کوچۂ جاناں کا ہر ذرّہ مرا دل ہو گیا

سحر تھا یہ حسن کا یا عشق کا اعجاز تھا
آپ کا نقش وفا کس طرح باطل ہو گیا

جرعۂ نوش تلخکامی کو وہی شیریں دہن
اک نمکداں تھا کہ بسمل اور بسمل ہو گیا

ضعف میں تھا دو گھڑی ہشیار رہنا بھی محال
آنکھ کھولی تھی کہ پھر بیمار غافل ہو گیا

جائے خوں ثاقب رگ و پے میں ہے ساری عشق دوست
شکر ہے میرا گلا کٹنے کے قابل ہو گیا

۳- اپریل سنہ ۱۹۲۱ء

پردہ رہا کہ جلوۂ وحدت نما ہوا
غش نے خبر دی مجھے کب سامنا ہوا

دشمن کی دوستی کا نتیجہ برا ہوا
خنجر گلے ملا تو مرا سر جدا ہوا

محشر میں رنگِ چہرۂ ظالم ہوا ہوا — سچ ہے برا ہوا کہ مرا سامنا ہوا

گلشن سے اٹھ کے میرا مکاں دل میں آ گیا — اک داغ بن گیا ہے نشیمن جلا ہوا

کیا تیرگی سے لئے ہوئے آئی شعاعِ نور — دیکھا شبِ فراق ازل کا لکھا ہوا

گھر دل میں کر چکا ہے مرا نوحۂ قفس — صیاد قید ہوگا اگر میں رہا ہوا

جب تک تھا میں عروج پہ تھا حسنِ جانستاں — پھر کچھ خبر نہیں کہ مرے بعد کیا ہوا

کہنے کو شکستِ پر کی اسیری تو تھی مگر — خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

تو جس میں تھا وہ منزلِ ہستی میں ہر ضرر — میری فنا سے دل مرا کیونکر فنا ہوا

نیند ان کی یوں اڑی ہے کہ آتی نہیں کبھی — مرنے کے بعد اب مرا نالہ رسا ہوا

صیاد کا گھر آج ہے جیسے چمن تھا کل — شاید قفس کا بیٹھنے والا رہا ہوا

تصویر میری عمرِ گزشتہ کی دیکھ جاؤ — تربت پہ اک چراغ ہے وہ بھی بجھا ہوا

اپنے کبھی مجھ سے خوش رہے باغِ دہر میں — بگڑا کیا مجھی سے نشیمن بنا ہوا

چمکا ہے کچھ وہ جلوۂ رخ ہو کہ داغِ عشق — دونوں دلوں میں ایک اک مبتلا ہوا

ڈھونڈے نہ مل سکے مجھے ظلمت میں وہ سال — رو کے سحر بھی چشمۂ آبِ بقا ہوا

اک عمر ہو گئی کہ ہے بارش میں چشمِ تر — اب تک نہ کوئی نخلِ تمنا ہرا ہوا

ثاقبؔ خبر نہ تھی کہ فلک میں ہیں گردشیں
میں آ کے دانۂ دہنِ آسیا ہوا

۳۔ فروری ۱۹۲۴ء

دلِ مردہ کبھی جینے کا طلبگار نہ تھا
ہوشیاری کو سمجھتا تھا یہ ہشیار نہ تھا

یہ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ گنہگار نہ تھا
ظلم اتنا بھی مگر تم کو سزاوار نہ تھا

وہ تھے شاکی مجھے شکوے سے سروکار نہ تھا
وہی بیمار تھے میں تو کبھی بیمار نہ تھا

عام لوگوں میں بھلا کیا دلِ مجروح کی قدر
یہ بھی یوسف تھا مگر لائقِ بازار نہ تھا

صاحبِ جا نہ ہوا پا کے مرے دل کی زمیں
ورنہ پہلے تو کہیں عشق کا گھر بار نہ تھا

طالعِ بخت کی کیا پوچھتے ہو بے خبری
عمر بھر جاگ کے دیکھا بھی تو بیدار نہ تھا

رشک منعم کو ہے جاہِ فقرا پر دمِ حشر
وہ ہے گھاٹے میں جو محنت کا خریدار نہ تھا

اضطرابِ شبِ فرقت کو بتاؤں کیونکر
رات یوں گزری کہ بستر پہ مرا بار نہ تھا

شمع سے ہو نہ سکی معرفتِ دشمن و دوست
ہم گنہگار تھے پروانہ گنہگار نہ تھا

یہ گوارا نہ کیا دل نے کہ مانگوں تو ملے
ورنہ ساقی کو پلانے میں کچھ انکار نہ تھا

آفتِ دہر کو کیا خفتہ و بیدار سے کام
قید ہونے سے سمجھو کہ میں ہشیار نہ تھا

حلقۂ دام سے زاہد تھے کہیں حلقۂ حرص | مجھپہ صیاد وہ ہنستا جو گرفتار نہ تھا
اس طرح پاک کیا اشکِ ندامت نے مجھے | اس سے پہلے کبھی جیسے میں گنہگار نہ تھا
آمد و رفتِ شب و روز نے بدلا مرا رنگ | ورنہ جب دہر میں آیا تھا تو بیمار نہ تھا
روشنی ڈال کے دنیا کا دکھاتا تھا مآل | یہ چراغِ سرِ تربت مرا بیکار نہ تھا
پلے مجرم میں قیامت کی ہر لغزشِ دم | بارِ قاتل ہے وہی سر جو مجھے بار نہ تھا
یا بجز انکے نہ تھا دہر میں ظالم کوئی | یا سوا میرے کوئی اور گنہگار نہ تھا

قدر دانِ سخن اب دہر سے گم ہیں ثاقب
اپنے موتی کو جو لایا میں تو بازار نہ تھا

۲۹- مارچ ۱۹۲۴ء

گزریگی یونہی شام و سحر دیکھتے رہنا | جو ہے وہ نہ آئیگا نظر دیکھتے رہنا
حسنِ رخ و عشقِ دلِ نازک ہی عجب چیز | تکتا ہوں ادھر میں تم ادھر دیکھتے رہنا
منظور ہو خورشیدِ قیامت کی اگر یاد | دل والو مرا داغِ جگر دیکھتے رہنا
دل منتظرِ غیر نہ ہے اور نہ ہوگا | غم کہتا ہے آثارِ سحر دیکھتے رہنا
اللہ بچائیگا تو بچ جائے گا دل بھی | تم انبی بلا خیز نظر دیکھتے رہنا

پہچانو خطِ دیر و حرم ایک نہیں ہے — بدلے نہ کہیں راہِ سفر دیکھتے رہنا

صیّاد تری قید سے چھٹنا تو ہے معلوم — آفات سے کہدے مرا گھر دیکھتے رہنا

اشکوں میں نظر آئیگا اک روز لہو بھی — یہ آئینۂ دیدۂ تر دیکھتے رہنا

جاگو تو بتائیں تمھیں اک شعلۂ دل — شب بھر مری آہوں کا اثر دیکھتے رہنا

انجامِ تجلّی نظر آجائیگا تم کو — پروانو رخِ شمعِ سحر دیکھتے رہنا

شاید ہو یونہی دل کے تڑپنے کا تصوّر — تم اپنے ہی کانوں کے گہر دیکھتے رہنا

ہے حکم بدلتا رہے چہرے کا ترے رنگ — میں کہہ نہیں سکتا کہ ادھر دیکھتے رہنا

غم نامۂ الفت دلِ صد پارہ ہے **ثاقب**
یہ نقشِ وفا آٹھ پہر دیکھتے رہنا

۸- فروری ۱۹۲۴ء

نالہ و فریاد و آہ و کاہشِ جاں دیکھنا — مجھ فقیرِ بے نوا کا ساز و ساماں دیکھنا

خون کا قطرہ نہ ہو دل میں تو پھر اک حشر ہے — لاکھوں مہمانوں کو اپنے گھر میں مہماں دیکھنا

حسرتوں کو آگ دیکر تم نے مشکل سہل کی — ورنہ کیا آسان تھا دل میں بیاباں دیکھنا

قلبِ صد پارہ مرا اب تک ہے تصویرِ وفا — ٹوٹنے پر بھی نہ ٹوٹا دل کا پیماں دیکھنا

پیس ڈالا خواہشِ بیجا نے کو ہ طور کو — دل کی قوت دیکھ لے پھر روئے جاناں دیکھنا

تم جو بچ جاؤ تو اچھی ہے مجھے شامِ فراق — دور ہی سے میرے ان اشکوں کا طوفاں دیکھنا

تنگیِ دل بعدِ وسعت آ نہیں سکتی کبھی — دشت والوں کی قضا ہے بابِ زنداں دیکھنا

بخیہ گر جس کا نہیں، وہ چاک زن ہے دستِ حسرت — دل نے یوسف کا نظر آئے تو داماں دیکھنا

کھل گیا داغِ جگر یا کچھ کسر باقی ہے — اک ذرا جھک کر مرا چاکِ گریباں دیکھنا

موت کی خواہش سوا میرے کسی کو بھی نہیں — کارِ اہلِ دل ہے ہر مشکل کو آساں دیکھنا

ایک خنجر ہو گیا دل کے لئے انکارِ وصل — اس نہیں نے کیا اثر پیدا کیا ہاں دیکھنا

کائناتِ موت دامن میں لئے ہیں دل کے زخم — درد اگر کم ہو تو تم سوئے نمکداں دیکھنا

ہستیِ فانی پہ اک اصرار تھا تقدیر کو — ورنہ کب منظور تھا خوابِ پریشاں دیکھنا

ہم نہ مر جاتے تو کیوں سنتا کوئی فریادِ صور — اک قیامت ہے کسی بستی کو ویراں دیکھنا

تپّی تپّی سے نہ خون اُبلے تو مجرم جاننا — ذبح میں ہو لوں تو پھر رنگِ گلستاں دیکھنا

گر یہی پہلو ہے دل اور یہی غم ہے تو پھر
عمر بھر آساں ہے ثاقب کو پریشاں دیکھنا

۶- اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء

دیارِ دل میں کہیں دوست کا پتا نہ ملا — وہ بدنصیب ہوں کعبے میں بھی خدا نہ ملا

تری یک قید تھے جذباتِ دل مگر بے کار — قفس تھا ایسا، کہ نالوں کو راستا نہ ملا

عدو کے مارے ہوؤں سے زمانہ مملو ہے — قتیلِ دوست جہاں میں مرے سوا نہ ملا

میں سوزِ غم کو کروں کیا، کہ رائگاں شے ہے — کباب ہو گیا دل اور تمھیں مزا نہ ملا

چراغِ مہر لئے ڈھونڈتا پھرا گردوں — شبِ فراق، تری صبح کا پتا نہ ملا

ذرا سی خاک سے پیدا ہوا تھا دل لیکن — جہاں سمائے جہاں، ایسا دوسرا نہ ملا

متاعِ عشق کا ہو دل کے بعد کیا سودا — کہ گم شدہ کا بھروسا نہیں ملا نہ ملا

یہ کس نے غمکدہ دنیا کا نام رکھا ہے — ہمیں تو کوئی یہاں دردآشنا نہ ملا

جمالِ شمع کسی کو، کسی کو جلوۂ گل — وہ ایک میں ہوں جسے کوئی خوں بہا نہ ملا

میں امتحانکدۂ عشق سے اٹھا جب سے — خبر نہیں، مگر اتنی، کہ دوسرا نہ ملا

ہزار سعی کی دل کے سوا مگر ثاقب
کوئی طریقِ محبت میں رہنما نہ ملا

۲- اپریل ۱۹۲۸ء

دل اپنے رنج و غم سے جامِ جہاں نما تھا — اب آپ ہی بتائیں اچھا تھا یا برا تھا

صحرا تھا یا چمن تھا، جانے وہی کہ کیا تھا
اُس دل کی انتہا ہے جو مدتوں جلا تھا

تڑپوں تو راز کھولوں سنبھلوں تو عشق ناخوش
جس حال کو میں سمجھا اچھا وہی برا تھا

پوچھا نہ زندگی میں یوں تو کسی نے آکر
مرنے کے بعد جو تھا وہ مجھکو پوچھتا تھا

شب کو مری صدائیں مجھ تک پلٹ کے آئیں
نالوں کی کیا خطا تھی جب بند راستا تھا

منزل پہ جب گرا تھا تھک کر تو میں نے دیکھا
قصہ مرا زبانِ عالم پہ چل رہا تھا

جانِ حزیں نکلتی شامِ فراق کیونکر
وہ رات تھی اندھیری رستہ نہ سوجھتا تھا

میری طرف چلے تم جب جانکنی میں تھا میں
دنیا ہی ایک جاتا تھا ایک آ رہا تھا

اک طرح کی مصیبت ہوتی تو جھیل لیتے
ہر شب نئی زمیں تھی ہر دن فلک نیا تھا

افسوس ہے کہ عمرِ فانی نے ختم ہو کر
مجھکو وہی بتایا جس کو میں جانتا تھا

ڈھونڈینگی بعد میرے مجھکو چراغ لے کر
وہ محفلیں کہ جن میں ثاقب غزلسرا تھا

دہم ماہ فروری ۱۹۲۷ء

کیا ہمایوں ہے ولیعہد کے سر پر سہرا
اوجِ گردوں پہ سعادت کا ہے اختر سہرا

رات دن ہو گئی، ایسا ہے منور سہرا
مہر وش رخ پہ شعاعوں سے ہی بہتر سہرا

شکر کا قصد ہی تسبیح کی یہ ساعت ہی — لے چکا سبحۂ صد دانۂ گوہر سہرا

سایہ افگن ہی خدا رکھے ہمائے اقبال — کہ ہی پرواز میں کھولے ہوئے شہپر سہرا

کھنیچتا ہی سحرِ وصل کی روشن تصویر — سر پہ نورِ ولی عہد پہ آ کر سہرا

چرخ سے عقدِ ثریا کی صدا آتی ہی — اسی دن کے لئے گوندھا گئے اختر سہرا

ایک موتی ہیں جو ہی دوسرے موتی کا عکس — نظر آجاتا ہی سہرے کے برابر سہرا

حسن کا نشو و نما فرق تک آتے ہی بڑھا — بڑھ چلا صورتِ گیسوے معنبر سہرا

میں یہ کہتا ہوں کہ اس سہرے کا زیور سر ہی — لوگ کہتے ہیں کہ ہی فرق کا زیور سہرا

کل تو پھولوں سے گرانبار تھی شاخِ چمن — آج دیکھا کہ گلوں کا ہی ترے سر سہرا

ناتواں تاروں میں یہ تاب ہی ماشاءاللہ — کہ اٹھائے ہوے ہی حسن کا لنگر سہرا

جنکو سب کہتے ہیں موتی، وہ نشانِ لب ہیں — بخت نے باندھ کے چوما ہے مکرر سہرا

قابلِ دید ہی شادی میں یہ خودداریِ حسن — پاوں رکھتا نہیں محفل کی زمیں پر سہرا

چھن کے آتی ہے ضیا رخ کی برابر سرِ بزم — دیکھو اوڑھے ہوے ہی نور کی چادر سہرا

پا گیا بحر جہاں میں رخِ پر نور کی آب — اب تو اک گوہرِ یکدانہ ہے سر پر سہرا

دیکھکر آئنے میں حسنِ قران السعدین — چشمِ حیراں نظر آتا ہے سراسر سہرا

ہوگیا عقدہ کشا دل کا دمِ آرایش
شانۂ حسنِ خداداد ہے سر پر سہرا

پہلے بھی آتی تھی ان پھولوں سے خوشبوئے مراد
زلف تک آکے ہوا اور معنبر سہرا

تحت و فوق ایک طرح ہی تو نہیں کچھ کھلتا
سرِ گوہر ہیں کہوں یا تہہ گوہر سہرا

کیوں نہ آجائے قدم تک پئے عفوِ تقصیر
کہ چڑھا فرطِ طرب سے ترے سر پر سہرا

غم سے کہتا ہوں کہ ہٹ، عیش سے کہتا ہوں کہ آ
کہ بناتا ہے دلِ دوست میں اک گھر سہرا

کہہ چاسد سے کہ جل، کچھ تو ضیا اور بڑھے
گوندھ کر لایا ہے نوشہ کا مقدر سہرا

ساز و برگِ فقرا کچھ نہیں اک دل کے سوا
لے چلا ہوں اسی کشتی میں لگا کر سہرا

حدِ امکاں میں جو تھی سعی بجا لایا ہوں
کہ ولی عہد کا بہتر سے ہو بہتر سہرا

ایک ہی طرح کے کلچیں بھی ہیں اور ہاتھ بھی ہیں
کیوں نہ ہو غالب و ثاقب کا برابر سہرا

۶- نومبر ۱۹۲۶ء

کٹ گیا رشتۂ الفت جو ترا نام آیا
دل وفادار تھا لیکن نہ مرے کام آیا

عشق کے ہاتھوں چراغ ایک سرِ شام آیا
تیرہ بختی میں مرا دل ہی مرے کام آیا

طالبِ ملکِ عدم سے نہ جہاں دیکھ سکا
ابھی منزل پہ نہ اُترا تھا کہ پیغام آیا

نازشِ دہر نہ تھا میں تو بسِ مُردن کیوں   محفلِ غیر میں سو بار مرا نام آیا

شمع روئی تو، وہ کچھ دیر سہی تربت پر

خیر کوئی تو زمانے میں مرے کام آیا

۱۸- نومبر ۱۹۲۶ء

ادھر پھولوں کے مجمع تھے اُدھر شورِ عنادل تھا   زمانہ تھا چمن جب دیکھنے سننے کے قابل تھا

حبابِ آسا گزاری زندگی بحرِ حوادث میں   سخن کا ذکر ہی کیا سانس کا لینا بھی مشکل تھا

نہیں مانا تو خیر اچھا کیا لیکن مٹایا کیوں   کہ میں اس دارِ فانی میں نہ حق تھا اور نہ باطل تھا

۱۳- فروری ۱۹۲۱ء

یوں اکیلا دشتِ غربت میں دلِ ناکام تھا   پیچھے پیچھے موت تھی آگے خدا کا نام تھا

بنتے ہی گھر ابتدا میں روکشِ انجام تھا   تنکے تنکے پر جب نظر کی آشیاں اک دام تھا

بے محل دل کے بجھانے سے اُنھیں کیا مل گیا   جسکو شمعِ صبح سمجھے وہ چراغِ شام تھا

حالِ مُنعم خود غرض کیا جانیں منعم تھیں کل   رند تھے بیفکر گردش میں دماغِ جام تھا

بس یہی فقرہ، کہ شامِ ہجر نے مارا مجھے   کوئی کہہ آتا، تو کتنا مختصر پیغام تھا

سیکڑوں بار ایک آہِ سرد سے تھرا چکا   کس قدر نزدیک دل سے آسماں کا بام تھا

نامور پھر کون ہوگا کارزارِ دہر میں ۔۔۔ جب یہاں دل سا علم بردارِ غم گمنام تھا

مونسِ وحدت کو کھو بیٹھا، بڑی مشکل یہ ہے ۔۔۔ کاٹنا اک شامِ فرقت کا ذرا سا کام تھا

سو جگہ سے چھن رہا تھا جب تو ڈرتا کس لئے ۔۔۔ کھا گیا دھوکا کہ میرے دل کی صورت دام تھا

سر چڑھایا میں نے چن چن کر خس و خاشاک کو ۔۔۔ باغ کے تنکے تھے وہ جنکا نشیمن نام تھا

ذبح میں اک بھیڑ سی دیکھی تھی لیکن کیا خبر ۔۔۔ گرد میری حسرتیں تھیں یا ہجومِ عام تھا

میرے نالے تھے شبِ فرقت میں کتنے برمحل ۔۔۔ اُنکے کانوں میں مگر اک شورِ بے ہنگام تھا

کیا زمانے کا گلہ ثاقب کسی کا کیا قصور

یہ دلِ غم دوست خود ہی دشمنِ آرام تھا

۲۱- فروری ۱۹۲۱ء

با وفا دل اس جہاں میں موردِ الزام تھا ۔۔۔ نیکنامی کھا گئی جس کو وہی بدنام تھا

وہ خود آرائی میں، حیرت میں دلِ ناکام تھا ۔۔۔ میرے اُسکے بیچ میں اک موت کا پیغام تھا

معرفت غم کی نہیں اور پوچھتے ہیں حالِ ہجر ۔۔۔ بس یہی کہدوں کہ ہاں آرام ہی آرام تھا

آگ پہلو میں لگا رکھی ہمیشہ کے لیئے ۔۔۔ کیوں دلِ پُر درد رکھتا ہوں، یہی الزام تھا

کعبۂ رنج و حوادث تھا سیہ بختی میں بھی ۔۔۔ گرد اس دل کے طوافِ گردشِ ایام تھا

شامِ غم بدلا ہوا انداز نالوں کا نہ پوچھ | دل کی میّت پر مرے سینے میں اک کہرام تھا

چاکِ دل اُسکو پسند آیا تو ٹانکے کیا ضرور | کب رہینِ لُطفِ سوزن جامۂ احرام تھا

سخت جاں کہتے ہیں مجھکو دور اُسمیں دم نہیں | وہ مرے سر آرہا خنجر پہ جو الزام تھا

ایک شب بھی دل نہ ٹھنڈا کر سکے اہلِ جہاں | صبح تک مہمانِ دنیا میں چراغِ شام تھا

جز دلِ راحت فروش اک چیز نے جنبش نہ کی | جب ازل میں خوانِ غم پر اک صلائے عام تھا

پختہ کاروں نے بھی ثاقبؔ ٹھوکریں کھائیں یہاں
دہر سے سالم گزرنا اک خیالِ خام تھا

۷۔ مارچ ۱۹۲۶ء

اگر نہ پیچ میں میرا سرِ گراں ہوتا | نہ گردشیں نظر آتیں نہ آسماں ہوتا

کسی وسیع جگہ میں جو امتحاں ہوتا | تو ایک ذرّہ مرے دل کا اک جہاں ہوتا

کھٹک رہا تھا نشیمن جہاں کی آنکھوں میں | وگرنہ باغ میں کوئی تو مہرباں ہوتا

گلہ نہ ہوتا مجھے آگ کے لگانے سے | چراغِ خانۂ دشمن جو آشیاں ہوتا

زرا بھی دل میں تمہارے اگر وفا ہوتی | تو میرے ساتھ تمہارا بھی امتحاں ہوتا

متاعِ صبر بھی اک شے ہے دل بھی اک شے ہے | یہ سب جبھی تھا کہ جب کوئی قدرداں ہوتا

اُمیدِ وصل تو خیر اک پیامِ لطف سہی — بُرا نہ ہوتا اگر کچھ نہیں سے ہاں ہوتا

نشیمن آگ سے بچتا تو خوف برق کا تھا — جو باغباں بھی نہ ہوتا، تو آسماں ہوتا

جو ایک طرح بھی تاثیرِ حسنِ دوست تو کیوں — تمام بزم میں میرا ہی دل تپاں ہوتا

نہ جاگتے نہ سہی سُن کے نیند تو آتی — یونہی سہی، مرا قصہ کبھی بیاں ہوتا

قدم کے نیچے جو آتا تو منہ پہ بھی پڑتا — بُرا نہ تھا جو یہ دل گردِ کارواں ہوتا

قفس میں نالے ہیں، اُمیں مزہ کہاں صیاد — تجھے میں نغمے سناتا جو آشیاں ہوتا

چراغِ گورِ غریباں بجھا کے کیا ملتا — عبث تھا حسن اگر عشق بے نشاں ہوتا

یہ اضطراب بھی اک اثرِ عشق و الفت ہے — سمجھ میں آتا اگر دردِ میہماں ہوتا

جہاں خموش ہوا اور نالہ کش ہے قلبِ حزیں — زبان رکھتا زمانہ تو ہمزباں ہوتا

بلند و پست میں الفت نہ دیتی ربط اگر — چمن تو ہوتا، مگر آشیاں کہاں ہوتا

زیادتی کی طلب ہو تو معرفت گم ہے — وگرنہ اک ورقِ گل میں گلستاں ہوتا

رفیق لاؤں کہاں سے کہ میں اکیلا ہوں — جو مجھ سے ہوتے بہت سے تو کارواں ہوتا

متاعِ عشق میں اک دردِ بے نہایت ہے — وگرنہ باغ پہ کیوں مشتِ پر گراں ہوتا

شناخت ہوتی تو پھر حاجتِ بیاں کیا تھی — میں خود زمانے کی محفل میں داستاں ہوتا

زمانہ جوہرِ الفت کا روشناس نہیں ۔۔۔ وگرنہ درد مرے دل میں کیوں نہاں ہوتا

ہوے ہیں داعیِ ثاقب صفاتِ زین الدین

نہیں، فقیر کا بھیرا یہاں کہاں ہوتا

۱۴- اپریل ۱۹۲۶ء

ہوں وہ غم دوست، کہ آرام کا خواہاں نہ ہوا ۔۔۔ دل کبھی حُسن کا شرمندۂ احساں نہ ہوا

جب میں کہتا ہوں کوئی وصل کا ساماں نہ ہوا ۔۔۔ کان میں آتی ہے آواز کہ جی ہاں، نہ ہوا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی ۔۔۔ میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

جو گیا غمکدۂ دہر سے وہ خوش نہ گیا ۔۔۔ سبھی مہماں ہوئے اور کوئی بھی مہماں نہ ہوا

حال وہ تھا کہ جسے دیکھ کے دشمن نہ ہنسا ۔۔۔ زخم وہ تھا کہ جو ممنونِ نمکداں نہ ہوا

پردۂ حشر اُٹھا، پھر بھی تمنا ہے بعید ۔۔۔ کام مشکل تھا، تو مرنے پہ بھی آساں نہ ہوا

جمعِ اسبابِ تمنا میں کٹی ساری عُمر ۔۔۔ جتنا ساماں کیا، اُتنا ہی ساماں نہ ہوا

حُسن و خوبی میں کہیں تم سے زیادہ ہوتا ۔۔۔ ہائے افسوس مرا دل کوئی انساں نہ ہوا

دل میں ہر روز رہی اک قافلۂ غم کا ورود ۔۔۔ اتنی وسعت تھی تو کاہے کو بیاباں نہ ہوا

غنچے گل ہو گئے، اس طرح کے قیدی چھوٹے ۔۔۔ کس سے ہم پوچھیں کہ وا کیوں درِ زنداں نہ ہوا

خوش ہے صیاد نشیمن مرا جل جانے سے
مجھے بتلائے وہ آباد جو ویراں نہوا

دلِ نفاق کے ملنے سے بڑی عادتِ عشق
کونسا وقت تھا جب آئنہ حیراں نہوا

غنچہ و دل تو ہیں ہم شکل مگر فرق کو دیکھ
ایک گریاں نہوا دوسرا خنداں نہوا

روشنی تیری عدالت کی یہ پھیلی کہ پناہ
قاتل اک راز تھا پر حشر میں پنہاں نہوا

گوہرِ عشق کی نایابی و عزت کو سمجھ
بھر دیا صحنِ جہاں کو مگر ارزاں نہوا

کلبۂ تنگ میں وحشت کا مزہ کیا ثاقب
خاک اڑائی بھی تو گھر اپنا بیاباں نہوا

۳- فروری ۱۹۲۶ء

تکلف ہے مرادِ دل کا دل پر بار ہو جانا
محبت کیا ہے مرنے کے لیئے تیار ہو جانا

نہ کام آیا ان آہوں کا فلک کے پار ہو جانا
مرے سوتے سے مشکل تھا ترا بیدار ہو جانا

نظر ملتے ہی ان سے آگیا سارا اثر دل میں
اسے آتا نہ تھا پہلے کبھی بیمار ہو جانا

وفا کا راہبر ہے تو وہ خاکی نہ جان اسکو
کمانکش دل ہے آگے اک ذرا ہشیار ہو جانا

یہ طوفاں اشک کا کم ہو تو سمجھوں ڈوبکر ابھرا
اسی مطلب کو سب کہتے ہیں بیڑا پار ہو جانا

نہ ہے شمشیر جائے مردمِ دیدہ ہے دیکھا یہ دل
یونہی تو بھی اسی دن کے لیئے تیار ہو جانا

زراسی اک نگاہِ عشق میں آنکھوں سے گرتا ہے
بہت آسان ہے انسان کا بیکار ہو جانا

دلِ صیاد سے شکوہ کروں کیا، سہل ہے اسکو
عدو پھولوں کا ہو کر ہمزبانِ خار ہو جانا

ہوا جو کچھ ہوا، ممنون ہوں صہبائے غفلت کا
قفس میں آکے اب بیکار ہے ہشیار ہو جانا

یہ کیسی ناتوانی ہے کہ دل محسوس کرتا ہے
مرے کاندھوں پہ خود میرے ہی سر کا بار ہو جانا

نظر کو ایک جنبش اور دے اے دیکھنے والے
اشارے پر ہے ان زخموں کا دامندار ہو جانا

بہم ہیں بے حسی و حس، کہ دل کو خوب آتا ہے
کبھی شق ہو کے در ہونا، کبھی دیوار ہو جانا

تمہارے زعم میں رہرو کا رستے سے گزرنا ہے
کسی چھوڑے ہوئے ناوک کا دل کے پار ہو جانا

ترا آوازۂ حسنِ سخن، اچھا نہیں **ثاقب**
نظر پڑتی ہے تجھ پر اک زرا ہشیار ہو جانا

۱۶۔ مئی سنہ ۱۹۳۰ء

میں وہ ہوں، جسکو زمانے نے سبق یاد کیا
غم نے شاگرد کیا، پھر مجھے استاد کیا

حسنِ جانسوز نے وحدت میں مجھے یاد کیا
میں یہ سمجھا کہ مجھے عشق نے برباد کیا

نہیں معلوم وہ میں ہوں کہ کوئی اور اسیر
سن رہا ہوں کہ گرفتار کو آزاد کیا

جس جگہ کھائی تھی ٹھوکر، وہیں تربت تھی مری
بھولنے والے نے مشکل سے مجھے یاد کیا

میری آہوں کی ہوائیں نہ آجانا تم — یہ وہی ہیں کہ جنھوں نے مجھے برباد کیا

خانۂ قبر عجب چیز ہے لیکن میں نے — اتنے ٹکڑے کو بھی اک عمر میں آباد کیا

یاس و امید کے مابین ہوئی ختم حیات — ایک نے شاد کیا ایک نے ناشاد کیا

تجھکو سب دیتے ہیں آواز وہ اپنے ہوں کہ غیر — اسطرف میں نے مؤذن نے آدھ ماد کیا

میں تھا اک خاک کی چٹکی تو اڑا جاتا ہوں — خاک کا وہ بھی ہر ذرہ جسے صیاد کیا

کس سے لوں دادِ وفا کس کو دکھاؤں جفا — وہ تو پردے میں ہی جس نے مجھے ایجاد کیا

عشق میں اپنے ہی ہاتھوں سے ہوا دو ٹکڑے — دلِ ناکام نے کارِ سرِ فرہاد کیا

ناتوانی میں گرے تھے جو لہو کے قطرے — میں تو بھولا ہوا تھا دل نے بہت یاد کیا

اشک آنکھوں سے گرے خون رگ و میں جو نہ تھا — میں نے آخر ادبِ نشترِ فصاد کیا

ذرے ذرے سے مری خاک یہ دیتی ہے صدا — رہے آباد وہ جس نے مجھے برباد کیا

ایک سناٹا سا عالم میں تھا لیکن میں نے — فتحِ بابِ اثر و نالہ و فریاد کیا

جتنے شکوے ہیں تجھی سے ہیں کہ اس عالم میں — مجھکو بلبل کیا صیاد کو صیاد کیا

راستہ چلنے کے قابل نہ رہا اے ہمدم — میں نے منزل پہ نیا مرحلہ ایجاد کیا

میں تو چیونٹی کے کچلنے سے حذر رکھتا تھا — پھر مجھے کس نے تہہِ زانوے جلاد کیا

اتنا زندہ رہے ہیں ہم جس سے کھلیں معنیِ ہو تو صبحِ ایجاد میں قصدِ عدم آباد کیا
بو نکلنے لگی غنچوں سے تو پھڑ پھڑ کس کا یہ خبر سچ ہے تو صیاد نے آزاد کیا
قبل از وقت پھنسا دام میں او ر پھنستے ہی جو تمنا یہاں لائی تھی اُسے یاد کیا

عالمِ حسن ہے وہ نقشِ معانی ثاقب
جو مری طبعِ خداداد نے ایجاد کیا

۲- اپریل ۱۹۱۸ء

بھول کے ایک نقشِ غم، عہدِ شباب ہو گیا جس نے سلایا مدتوں اب وہی خواب ہو گیا
خارِ غم اس قدر چبھے، جس کی کچھ انتہا نہیں جب تو دہانِ زخمِ دل کھل کے گلاب ہو گیا
میرا لہو بہل کے او ر مست ہوئے ہیں اہلِ ظلم خون عنب تھا کہ جو بادۂ ناب ہو گیا
دور سے پاس آ گیا، پاس سے دور ہٹ گیا وعدۂ وصل کیا ہوا، کوئی سراب ہو گیا
عہدِ وفا و مہر کا، اب کوئی فائدہ نہیں تم نہ جلاؤ گے کسے دل تو کباب ہو گیا
حشر میں گنگ تھک گیا، حد نہ ملی گناہ کی بس مرے پردہ پوش بس، میرا حساب ہو گیا

غرقِ عرق ہوں تا گلو حد نہیں انفعال کی
بس مرے پردہ پوش بس، میرا حساب ہو گیا

۱۹۔ ستمبر ۱۹۲۷ء

کوئی بھی شمعِ شبستاں کے روبرو نہ رہا ۔۔۔ وہ سوز تھا کہ پتنگوں میں بھی لہو نہ رہا

دلِ حزیں، ترے مرنے کے بعد کیا دیکھوں ۔۔۔ فضائے دہر میں کیا رہ گیا جو تو نہ رہا

مقامِ حشر بھی کتنی مہیب منزل ہے ۔۔۔ نشانِ دوست کہاں پائیں جب عدو نہ رہا

میں سو گیا تہِ شمشیر، کیا خبر مجھ کو ۔۔۔ رہا نہ خنجرِ سفاک یا گلو نہ رہا

شکستہ ہو گیا دل، دورِ چشمِ ساقی سے ۔۔۔ یہ وقتِ بد ہے، کہ ساغر رہا سبو نہ رہا

قبائے یوسفِ کنعاں دریدہ تھی لیکن ۔۔۔ پھٹا جو دامنِ دل، قابلِ رفو نہ رہا

گل اپنی بزم میں تھے، باغ اپنے رنگ میں تھا ۔۔۔ میں کھو گیا، تو کوئی محوِ جستجو نہ رہا

پسِ دل اُنکے گندھے گیسوؤں پہ کیا گزری

بتائے کون جب آئینہ روبرو نہ رہا

۱۱۔ مارچ ۱۹۱۳ء

ہوں مشتِ خاک جلنے کے قابل نہیں رہا ۔۔۔ جس دل پہ داغ پڑتے تھے وہ دل نہیں رہا

مدہوش تیری یاد میں کب دل نہیں رہا ۔۔۔ تھی بیخودی مگر کبھی غافل نہیں رہا

شمعِ حیات بجھ گئی، بس اے چراغِ طور ۔۔۔ شایانِ دید، دیدۂ محفل نہیں رہا

یا میرے بعد پھر نہ ملا کوئی سرفروش　　یا اب وہ زورِ بازوے قاتل نہیں رہا

تو ہے کہ سو رہا مجھے تڑپا کے ہجر میں　　میں ہوں کہ تیری یاد سے غافل نہیں رہا

لڑتے ہیں جامِ مے تو اُبھرتی ہے دل کی چوٹ　　میں ہم مذاقِ ساقی و محفل نہیں رہا

کب اُس جفا شعار نے چھیڑا ہے ذکرِ درد　　جب حالِ دل بیان کے قابل نہیں رہا

ناداں بھی ہو گئے مرنے لوگ سے ہشیار　　اب آپ کے سوا کوئی غافل نہیں رہا

رنگ اُڑ گئے ہیں سب کے مجھے دیکھ دیکھ کر　　پہلا سا وہ طریقۂ محفل نہیں رہا

ثاقب وفورِ شوق سے نادم ہوں بعدِ قتل
مجھکو خیالِ زحمتِ قاتل نہیں رہا

۳- نومبر ۱۹۰۹ء

کل وحدتِ فرقت کا سماں پیش رہا تھا　　نالہ بھی مرے مُنھ سے نکلتے ہی ہوا تھا

وہ کر گئے تھے مجھکو بلاؤں کے حوالے　　سب جھیل لیں میں نے کہ مرا بھی تو خدا تھا

آئے تو سوادِ شبِ غم تم کو دکھاتے　　وہ سب تھا جو کچھ اپنے مقدر میں لکھا تھا

دعواے محبت تھا وہ جس نے مجھے مارا　　بس اسکے سوا کچھ نہ کہا تھا نہ سُنا تھا

کیا دیکھتا آثارِ سحر میں شبِ فرقت　　وہ جوش پر آنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

دل سوختگانِ لحد، اچھے تو ہیں یارب — اک آبر سا کل گورِ غریباں سے اُٹھا تھا

ثاقب انھیں کیا حالِ شبِ ہجر بتاؤں
خود ان پہ جو یہ رات گزرتی تو مزا تھا

۴- جون سنہ ۱۹۲ء

وارِ تیغِ نگہِ قہر کا چلتا ہی رہا — تیوریاں مجھ سے جفا کار بدلتا ہی رہا
نخلِ امید مرا پھولتا پھلتا ہی رہا — جسکی تقدیر میں جلنا تھا وہ جلتا ہی رہا
غش انھیں دیکھکے آیا تو مرا بس کیا تھا — مجھ سے سنبھلا گیا جبتک تو سنبھلتا ہی رہا
ایک حالت پہ کوئی شے نظر آئی نہ کبھی — راتدن رنگ زمانے کا بدلتا ہی رہا
اثرِ سوزِ غمِ عشق، الٰہی توبہ — خون پانی ہوا پر دل مرا جلتا ہی رہا
ضبطِ غم سے نہ دبا جوشِ محبت دل میں — بنکے آنسو مری آنکھوں سے نکلتا ہی رہا
شغلِ فریاد و فغاں، مونسِ تنہائی تھا — قید میں کچھ تو دلِ زار بہلتا ہی رہا
ذکرِ نیرنگِ غمِ عشق نہ پوچھو ثاقب — دل مرا حسن کی محفل میں بھی جلتا ہی رہا

۸- اکتوبر سنہ ۱۹۰ء

بجا کہتے ہو تو غم میں فنا ہوتا تو ہو جاتا، — ذرا ہاں پھر یونہی کہنا، وہ کیا ہوتا تو ہو جاتا

زمانہ ہو گیا مدت ہوی مجھکو دعا کرتے ۔۔۔ جو میرا مدعائے دل روا ہوتا تو ہو جاتا
دل آزادی کا طالب ہی مگر یہ ہو نہیں سکتا ۔۔۔ اسیرِ عشق اگر کوئی رہا ہوتا تو ہو جاتا
امیدِ وصل محشر پر اُٹھا رکھا یہ دلِ ناداں ۔۔۔ کہ دُنیا میں اگر وعدہ وفا ہوتا تو ہو جاتا
رہا جاتا ہی شوقِ دید سنتا ہوں وہ آتے ہیں ۔۔۔ یہ مطلب موت میں قصہ ذرا ہوتا، تو ہو جاتا
میں اسکا امتحاں لینے کو ہوں پر بس نہیں چلتا ۔۔۔ جو اُن ہاتھوں سے میرا سر جدا ہوتا تو ہو جاتا
دلِ ثاقب لہو ہونیکو ہی لیکن نہیں ہوتا ۔۔۔ جو ایسی زندگی میں کچھ مزا ہوتا تو ہو جاتا

۳ - اگست ۱۸۹۴ء

مرا دل داد خواہِ ظلم اصلا ہو نہیں سکتا ۔۔۔ مروت منہہ کو سی دیتی ہی شکوا ہو نہیں سکتا
چھپاؤ آپ کو جس رنگ یا جس بھیس چاہو ۔۔۔ مگر چشمِ حقیقت بیں سے پردا ہو نہیں سکتا
تماشا گاہِ حیرت ہے یارِ دل کی ویرانی ۔۔۔ یہ سناٹا میانِ دشت و صحرا ہو نہیں سکتا
بڑھا ایک اور غم افسانۂ رازِ عشق سے ورنہ ۔۔۔ نہیں کھلتا نہ وہ کہتے کہ ایسا ہو نہیں سکتا
مرے ظلمتکدہ میں روزِ روشن کا گزر کیسا ۔۔۔ سلامت ہی شبِ غم تو اجالا ہو نہیں سکتا
دمِ عہدِ وفا ٹھہرا نہ اُنکے سامنے کوئی ۔۔۔ سوا میرے تو میں کس دل سے کہتا ہو نہیں سکتا
کبھی کج طبع کو دیکھا نہ سیدھی راہ پر آتے ۔۔۔ جو ہو در اصل بد باطن وہ اچھا ہو نہیں سکتا

نہوں سنگِ درِ میخانہ اہلِ زُہد اے **ثاقبؔ**
کہ میں پابندِ رسم و راہِ تقویٰ ہو نہیں سکتا

۱۹- جنوری ۱۸۹۸ء

جاں بلب پاکے مجھے آپ کا غصّہ اُترا ہائے جی ڈوبگیا جب تو یہہ دریا اُترا
ہجر کی رات ہوئی میرے کفن کیلئے صبح پھٹ کے آخر کو لباسِ شبِ یلدا اُترا
رحم آیا اُنھیں جب میں نہ رہا قابلِ رحم میری گردن پہ چھری پھیر کے غصّا اُترا
مجھکو غم ہے کہ مرے بعد مٹی حُسن کی قدر وہ سمجھتے ہیں کہ یہہ مرگیا صدقا اُترا

یکم جنوری ۱۸۹۸ء

خفا کیوں ہو جو پیغامِ قضا ابتک نہیں آیا برے دل سے تمھیں خود کو سنا ابتک نہیں آیا
مرے جلاد کا اک ہاتھ تو بھرپور پڑ جاتا کہ ادھے زخم کھا کر کچھ مزا ابتک نہیں آیا
سب آئے پرسشِ بیمار کو بچھڑے ہوئے ساتھی مگر اک دل کہ وہ جب سے گیا ابتک نہیں آیا
درِ تاثیر کی زنجیر کیونکر کھول لیتے ہیں تجھے اتنا بھی اے سنتِ دُعا ابتک نہیں آیا

کئی بار اس نے پوچھا رات میرے چارہ سازوں سے
کہ **ثاقبؔ** ہوش میں آیا بھی یا ابتک نہیں آیا

۲۷- اکتوبر ۱۸۹۴ء

حشر کل غیر کی لحد پر تھا — رونے والا وہی ستمگر تھا
میں بھی مہمانِ کوے دلبر تھا — یہ نہ پوچھو کہ تھا تو کیونکر تھا
جان دینے میں عذر کیا معنی — آپ کہتے تو کیا میں باہر تھا
آ گئے، بن گیا، گئے، بگڑا، — اُنکے بس میں مرا مقدر تھا
زندگی تھی تو عشق کے دم تک — جو نفس تھا وہ روح پرور تھا
لوحِ تربت سے تھا نشاں باقی — میں جو تھا بھی تو خاک تیرہ تھا
وہ اُلٹ کر جو آستیں نکلے — ظلم جامے سے اپنے باہر تھا
توڑ ڈالا قفس اسیروں نے — نئے مہمان تھے نیا گھر تھا
حالِ تنہائی فراق نہ پوچھ — ایک بیمار ایک بستر تھا
کھل گیا جب لہو کی بو پھوٹی — کس کی گردن تھی کس کا خنجر تھا

غیر کب سدِ باب تھا ثاقب
راہ رو کے مرا مقدر تھا

۱۳- جولائی ۱۸۹۴ء

موت کا آنا بُرا کیا ہو گیا — آپ کا بیمار اچھا ہو گیا

وہ اُٹھے انگڑائیاں لیتے ہوئے — میں یہ سمجھا حشر برپا ہو گیا

حُسن کے جلوے نے بیخود کر دیا — سامنا ہوتے ہی پردا ہو گیا

کس کو شوقِ دید بیتابی نہیں — دل نہ ٹھہرا اک تماشا ہو گیا

سینے میں دل کا نگیں محفوظ تھا — خود بخود اک داغ پیدا ہو گیا

حسنِ دلکش خواب میں تھا بے حجاب — کُھل گئیں آنکھیں تو پردا ہو گیا

اب کہاں **ثاقب** وہ بزم آرائے عشق
بجھ گئیں شمعیں اندھیرا ہو گیا

۳- فروری سنہ ۱۸۹۱ء

کب مجھے بزم سے اُٹھنے کا اشارا نہ ہوا — بیٹھنا بھی مرا ظالم کو گوارا نہ ہوا

پیشِ اربابِ کرم ہاتھ وہ کیا پھیلاتا — جسکو تنکے کا بھی احسان گوارا نہ ہوا

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر — یہہ مری ہمّتِ عالی کو گوارا نہ ہوا

۱۷- ستمبر سنہ ۱۸۹۰ء

عشق دکھلائے اگر تیغ کو جوہر اپنا — پائے جلاد ہی پر کٹ کے گرے سر اپنا

جھاڑ کر ہاتھ اُٹھے منزلِ دنیا سے فقیر　　کیا لگاتا کوئی ویرانے میں بستر اپنا
نشۂ عشق میں جب دیکھئے دل ہے سرشار　　مے سے خالی کبھی رہتا نہیں ساغر اپنا

۱۷- فروری ۱۹۱۰ء

ہے سہل یوں تو دلِ زار کا دُکھا دینا　　جزا کو سوچ لو پہلے، تو پھر سزا دینا
جہاں تک آنکھ میں آنسو تھے دیکے دیکھ لیا　　کہ دل کی آگ کا ممکن نہیں بجھا دینا
زبانِ غیر سے اچھی ہے مدحِ گل صیاد،　　کوئی چمن کی کہانی مجھے سنا دینا
کھڑا ہوں حشر میں، قاتل کا نام یاد نہیں　　حجاب والے، تو ہی اک ذرا بتا دینا
میں اپنے حال پہ روتا ہوں اے جراحتِ دل　　وہ مجھکو دیکھنے آئیں، تو مسکرا دینا

۱۲- مئی ۱۹۱۰ء

ملالِ اہلِ الفت، انبساطِ غیر ہوتا تھا　　دلِ بیکس کا یونہی خاتمہ بالخیر ہوتا تھا
بتوں پر کس لئے جلتا جو دل عشقِ خدا رکھتا　　مرے کعبے کو پہلے ہی چراغِ دیر ہوتا تھا
کبھی تھا آدمی اب خاک ہوں اس دل کے ہاتھوں سے　　اگر اسنے یہ کرتے ہیں تو ہم انکو غیر ہوتا تھا
ہزاروں ذرّے اٹھکر دل کی صورت بیٹھے جاتے ہیں　　کسی کو دشتِ غربت میں مرا ہم سیر ہوتا تھا

۱۸- اپریل ۱۹۱۰ء

خاک اُڑنے دے لحد کی، جی بہلتا جائیگا — آسماں یونہی غبارِ دل نکلتا جائیگا

آج ہی میرا گلا، کل اور ہونگے بے گناہ — اب اگر چلتا ہی یہ خنجر تو چلتا جائیگا

تا سحر مہمانِ غم ہوتی تو ہوتی شمعِ بزم — دل ہی ہے یہ تا صبحِ روزِ حشر جلتا جائیگا

آپکے کہنے سے وقتِ نزع ٹل سکتا نہیں — وعدۂ فردا ہی کیا جو روز ٹلتا جائیگا

۱۸- اپریل سنہ ۱۹۰۹ء

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا — بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا

میں دنیا کو میخانہ سمجھا کہ اس میں — کوئی ہنس رہا تھا، کوئی رو رہا تھا

شبِ غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو — جدھر دیکھتا تھا خدا ہی خدا تھا

لحد پر تاسّف کے معنی نہ سمجھا — یہ کاہے کا رونا ہے جب میں پڑا تھا

عوض لے لیا ہجر کا میں نے مر کے — وہ تربت پہ روتے تھے میں سو رہا تھا

قفس کے سے نالے گلستاں میں بھی تھے — کبھی کیا نشیمن میں چپ ہو گیا تھا

یکم مارچ سنہ ۱۹۱۰ء

عروسِ دہر کو دل دیکے آزماؤں کیا — سنوارنے میں جو بگڑے اُسے بناؤں کیا

جو اہلِ دل پہ گزرتی ہے مجھ پہ بھی گزری — سُنا ہوا ہو جو قصہ اُسے سناؤں کیا

شبِ فراق کو میں جانوں یا خدا جانے
جو تم سمجھ نہیں سکتے اُسے بتاؤں کیا

ترے بنائے ہوئے نقش کو بگاڑ آیا
کریمؔ حشر کے دن تجھکو منہ دکھاؤں کیا

شبِ فراق میں دل پھونک کر سحر کی تھی
شبِ مزار تو وہ بھی نہیں جلاؤں کیا

بقیہ اشعار غزل مندرجہ صفحہ (۲)

کھویا اس اختلاف نے لطفِ وصال بھی
اُن میں تھا انکسار نہ مجھ میں غرور تھا

منزل پہ لے گئی نظرِ دوربیں مجھے
جو پاس ہو وہی مرے نزدیک دور تھا

پوچھوں جو سر کشوں میں کسی کی لحد ملے
اے مشتِ خاک کیوں تجھے اتنا غرور تھا

بقیہ اشعار غزل مندرجہ صفحہ (۱۴-۱۶)

بربادی مکین و مکاں موت کر گئی
ہم چپ ہوئے سکوت میں ویرانہ ہو گیا

بدلا مذاقِ بادہ پرستی نے رنگِ طبع
مشرب تو کیا مزاج بھی رندانہ ہو گیا

دل بندگیِ حسن پہ راضی نہیں ہوا
آخر فدائے ہمتِ مردانہ ہو گیا

صیاؔ ذوقِ بد میں ذرا دوستوں کو دیکھ
کیونکر شریکِ دام ہر اک دانہ ہو گیا

بقیہ اشعار غزل مندرجہ صفحہ (۱۷)

اُنکے دروازے سے داغِ دل ملے ہیں بھیک میں
میں نے وہ پایا کہ جس کا میں کبھی سائل نہ تھا

دل نے اپنی حسرتوں کے قافلے ٹھہرا دیئے
اسقدر آباد پہلے کوچۂ قاتل نہ تھا

ناشناسی کا گلہ کیا چھپنے والے کی خوشی
پردۂ دل سے زیادہ پردۂ محمل نہ تھا

زخم ہے لیکن نمکپاشی سے ہو سشر کون
درد میں جب کچھ مزہ ملنے لگا تو دل نہ تھا

بقیہ اشعار غزل مندرجہ صفحہ (۲۰)

وہ حصارِ نامرادی سے کبھی نکل نہ سکتا
مری حسرتوں کے زنداں میں اگر شرار ہوتا

مرے زخموں سے اُلجھنا ترے تیر کا ستم تھا
کہ نکل نہ جاتے ارماں جو یہ دل کے پار ہوتا

میں بچھا کے دل کے داغوں کو ہوا جہاں کی دیتا
جو فلک کی طرح قبضے میں کوئی حصار ہوتا

کبھی کوئی چوٹ سہتی نہ زمینِ فنِ دل
اگر اتنا بھی ٹپکتا تو عیاں شرار ہوتا

کس اُمنگ سے چلا تھا مرا تیر آہ کھنچکر
جو نہ روکتا مقدر تو دلوں کے پار ہوتا

بقیہ اشعار غزل مندرجہ صفحہ (۳۷)

چین آتا ہی نہ تھا جس دل کو نالوں کے بغیر
کس طرح وہ داخلِ شہرِ خموشاں ہو گیا

پستیِ ظاہر سے رکتا ہے کہیں بختِ بلند
چاہ تھا پھر بھی وہ برجِ ماہِ کنعاں ہو گیا

اب وہ دل چبھتا ہے پہلو میں جو پہلے نرم تھا
سخت کس نے کر دیا اتنا کہ پیکاں ہو گیا

یکم مارچ ۱۹۱۰ء

دورِ غم پہلے نہیں تھا یا قمر پہلے نہ تھا — میں نہ مانوں گا کہ یہ داغِ جگر پہلے نہ تھا

مر کے ہم سے قیدیوں نے راستے پیدا کئے — ورنہ زنداں خانۂ دنیا میں در پہلے نہ تھا

اب تو میرِ قافلہ ہوں میں طریقِ عشق میں — ہاں چلا تھا جب تو کوئی ہمسفر پہلے نہ تھا

دل جلا کر میں نے دنیا بھر کی آنکھیں کھول دیں — اسطرح کا سرمۂ اہلِ نظر پہلے نہ تھا

اب کٹی شہ رگ کہ جب کٹیاں جہاں کی جھیل لیں — ورنہ کیا خنجر نہ تھا یا میرا سر پہلے نہ تھا

۳۔ جون ۱۹۱۱ء

طور پر وہ کس لئے روپوش تھا — دیکھنے والوں میں کس کو ہوش تھا

کل تو بحرِ حسن میں وہ جوش تھا — طالبِ دیدار تک روپوش تھا

چشم کے سیلاب کا کیا پوچھنا — پہلے پانی پھر لہو کا جوش تھا

قصۂ طوفاں پرانا ہو گیا — جو رہا اب تک وہ دل کا جوش تھا

۱۷۔ نومبر ۱۹۲۶ء

اوجِ پستی کا زمانے میں نہیں کچھ اعتبار — اک ذرا سی بات میں کاندھے پہ بستر آ گیا

اپنی اپنی قابلیت اپنا اپنا مشغلہ — آسماں کو دیکھ کر ہم کو نہ چکر آ گیا

مالک اب اس سے سوا عادت نہیں برداشت کی — حشر کا دن شامِ ہجراں کے برابر آ گیا

۱۹- نومبر ۱۹۲۶ء

کل مرے دل کی طرح سے ابر میں بھی جوش تھا — فرق اتنا تھا کہ وہ گویا تھا میں خاموش تھا

نالۂ احباب کے سننے کا کس کو ہوش تھا — بولتا کیا جب چراغِ زندگی خاموش تھا

منحصر آنکھوں میں کب ہے حسنِ دلکش کا اثر — مثلِ موسیٰ ایک عالم طور پر بیہوش تھا

۲۰- نومبر ۱۹۲۶ء

کوئی یوں دھر کا محوِ تماشا ہو نہیں سکتا — جھکا ہے اس طرح گردون کہ سیدھا ہو نہیں سکتا

بہت کچھ میں تمھارے ظلم کا ممنونِ احساں ہوں — فقط دل سے تو اک نالہ بھی پیدا ہو نہیں سکتا

ورودِ کاروانِ حسرت و امید سے پہلے — سمجھتے تھے کہ اک انسان دنیا ہو نہیں سکتا

۱۷- جون ۱۹۱۲ء

برائے ملکِ عدم کوئی راہبر نہ ملا — کیا سفر کا ارادہ تو ہم سفر نہ ملا

بتائیے مجھے کیا اب عشق ہے کہ جمال — چمن میں پھول ملے میرا ایک پر نہ ملا

زمانہ کثرتِ سودائے عشق سے ہے سیاہ — کہ جس میں اسکی سمائی تھی پھر وہ سر نہ ملا

۲- اپریل ۱۸۹۴ء

کشش وہ کچھ مذاقِ عشق میں اس دل کے زخموں کی — نمک کافور بنکر اڑ گیا تیرے نمکداں کا

نہ ہمت ہارنا اے دل کہ بیڑا پار ہوتا ہے — ہوائیں دب چلیں گھٹنے لگا ہے زور طوفاں کا

کیا جب طول وحشت کا خلاصہ کلک قدرت نے — لکھا عنوان قسمت میں الف چاک گریباں کا

۵- جون ۱۹۰۹ء

کبھی جوش جنون عشق میں صحرا کو دیکھ آنا — جو رونے سے کبھی فرصت ملی دریا کو دیکھ آنا

بہت ہے آسیائے چرخ کو ناز اپنی سختی پر — مرے نالو کسی دن گنبد مینا کو دیکھ آنا

بٹھا رکھیگا یہ دل شام غم میں صبح محشر تک — بہت مشکل ہے مجنوں کو خیمۂ لیلی کو دیکھ آنا

۸- نومبر ۱۹۳۳ء

صورت گل میں زمیں نے اشک خوں رو دیا — جب گری شبنم تو میں سمجھا کہ گردوں رو دیا

یہ نمک پاشی مذاق عشق میں اچھی نہیں — جب ہنسی لیلی کو آئی قلب مجنوں رو دیا

انکے رونے کی مرے زخم جگر نے داد دی — ایک آنسو کے عوض سو قطرۂ خوں رو دیا

یا میں رسوا ہونگا یا ظالم کا پردا جائیگا — سامنے آئے تو روز حشر دیکھا جائیگا

ناتواں ہوں میں ستا کر مجھکو کیا پا جائیگا — درد اٹھنے کو اٹھے مجھ سے نہ تڑپا جائیگا

مرگِ عاشق ہے کسی درد کا پنہاں کرنا — نہیں آتا انھیں مشکل مری آساں کرنا
ہائے بربادیِ دل کس کو تجھے دکھلاؤں — انھیں منظور نہیں سیرِ بیاباں کرنا

میرے قاتل پہ بھی اک وقت آ پڑا — قتل کرنے کے لئے جھکنا پڑا
جیسی کالی تھی شبِ غم کی گھٹا — ویسا ہی اشکوں کا مینھ اچھا پڑا

نہ معبود ساقی رہا اور نہ بندے — نہ وہ بت رہا اور نہ ایماں ہمارا
وہ آنکھیں کہ جن میں فالامکاں ہے — سمائے گا خوابِ پریشاں ہمارا

۹-اگست ۱۹۱۹ء

میکشو تم میں کیوں نہ ہو مشہور نامِ آفتاب — لیکے انگڑائی سحر لیتی ہے جامِ آفتاب
پستیِ طالع کہاں تک طاق سے شیشہ اتار — تا بہ کے اونچا نظر آئیگا بامِ آفتاب
آتشیں مئے جوش کھا جاتی ہے اپنے وقت پہ — سرخ ہو جاتا ہے صبح و شام جامِ آفتاب
دامنِ گلشن پہ کیا کہنا تری رفتار کا — سبزۂ گردوں پہ اچھا ہے خرامِ آفتاب
داغِ دل کی مہمانی رات کو کرنا ہو تمیں — میرے ہی گھر میں ہوا کرتی ہے شامِ آفتاب

جھیلنے والا شبِ غم کا سحر سے خوش ہوگیا — ہی فقط دن بھر زمانے میں قیامِ آفتاب

یہہ مقدر ہی کہ ذرہ بھر نہیں کم سوزِ دل — پاس ہی عیسیٰ کے گو اب تک مقامِ آفتاب

زلفِ آراستہ کسی دن پھیر دے میری طرف — ہو ترے ہی دستِ قدرت میں لجامِ آفتاب

سر اُٹھا کر دیکھ لے میکش کا دل بھر پوچھنا — جل رہا ہی دور سے خالی ہوکے جامِ آفتاب

نالۂ دل روشنی کرتا ہوا گردوں پہ جا — رات ہی تاریک خالی ہیں خیامِ آفتاب

گردشِ سر کب مٹیگی مجھکو کیا معلوم ہی — دیکھئے باقی رہے کبتک نظامِ آفتاب

اہلِ رفعت کے لئے پرواے ملک و مال کیا — بے نگیں چمکا کیا عالم میں نامِ آفتاب

قبرِ ثاقب نورِ حیدر سے منور ہوگئی
جھکتے جھکتے تا زمیں پہونچا ہے بامِ آفتاب

۱۳۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء

مل گئے شاید کہیں حسرت بھرا دل اور آپ — خواب دیکھا ہی کہ اک افسردہ محفل اور آپ

مجھکو رونے دے مگر تو پوچھ لے اے شمعِ بزم — ہنس پڑی کیوں بیٹھے بیٹھے ساری محفل اور آپ

چشمِ گریاں سے اُتر کر سیرِ دل فرمائیے — مدتوں دیکھا کہ دریا اور ساحل اور آپ

آئیگا ہاں مگر میرے گزر جانے کے بعد — ایکدن ہو گی یہی بربادِ منزل اور آپ

داستانِ عشق، سنئے تو کسی ہمدرد سے — کوئی گلشن ہو، جہاں ہوں کچھ عنادل اور آپ

خوفِ محشر کس لئے آنکھوں کو دھوکا ہو گیا — ایک ہی صورت کے ہونگے میرا قاتل اور آپ

ادعائے پارسائی کیا ہوا ثاقب کے آج — یہ الہ آباد یہ رندانہ محفل اور آپ

۱۱- نومبر ۱۹۰۶ء

آئے نہ آنچ، سوزِ جگر کے بیان پر — چھالوں نے جال ڈال دیا ہے زبان پر

آنکھیں ملیں نہ میں نے قدم کے نشان پر — سر اٹھ سکا نہ جھک کے ترے آستان پر

وہ ہنس پڑے جو زخمِ جگر کے بیان پر — آیا لہو میں ڈوب کے نالہ زبان پر

بیداد تیری راہ نے کی اک جہان پر — کیا قافلے لٹے ہیں قدم کے نشان پر

دیکھا کئے وہ، چاند کو، اپنے گمان پر — میں خوش ہوا کہ تیر چلے آسمان پر

ہو چھیڑ چھاڑ انکی طرف سے تو یہ کھلیں — کچھ دل سے لیکے آئے ہیں چھالے زبان پر

رکھتے ہی پاؤں لٹ گئے بازارِ عشق میں — بیٹھے نہ دل کے بیچنے والے دکان پر

اچھوں کو چین سے نہیں رکھتا بُروں کا ساتھ — ساری بلائیں جسم کی آتی ہیں جان پر

کچھ کم نہیں تھے میرے لئے باغباں کے جور — بجلی کہاں سے ٹوٹ پڑی آشیان پر

میری زبان اُنکے دہن میں ہو اے کریم — ہونا ہے فیصلہ جو انھیں کے بیان پر

ظالم سبک نہ ہو کہیں محفل میں شانِ حُسن — کیوں خاک ڈالتا ہے مری داستان پہ

دل کی مراد مانگنے آئے تھے دور سے — کچھ کھو چلے گرہ سے ترے آستان پہ

پہونچی کہاں بھٹک کے شبِ تارِ ہجر میں — کیا صبح راہ بھول گئی آسمان پہ

کس بسملِ جفا پہ قضا مہربان ہے — کروٹ بدل رہی ہے تری تیغ سان پہ

سجدے کی آرزو میں کیا طوف کو سلام — کعبے سے اُٹھ کے آئے ترے آستان پہ

رہنے دے کچھ تو چاہیے سخن اے تپِ دروں — یوں دل جلا کہ آنچ نہ آئے زبان پر

کیا جانیں کس خیال میں ہیں وہ شبِ وصال — مجھ پر کبھی نظر ہے کبھی آسمان پر

انکی جفا سے میری وفا کم نہیں رہی — ہر چند امتحان ہوے امتحان پر

اے مے پرست شیشۂ دل بھی بغل میں ہے — گرنا سنبھل کے پیرِ مغاں کی دکان پر

عمرِ شبِ فراق اسی طرح ہے دراز — نالوں نے جا کے کچھ نہ کیا آسمان پہ

میرے بیان سے وہ نہ سمجھے مذاقِ عشق — ایسا تھا یہ مزہ کہ نہ آیا زبان پہ

دورِ فلک نے مجھکو اٹھا بھی دیا تو کیا — دل کو بٹھا دیا ہے ترے آستان پہ

کعبہ کدھر ہے شکر کا سجدہ ادا کروں — اللہ آپ آئے ہیں میرے مکان پر

کچھ کھل چلا ہے چرخِ منافق مزاج بھی — چھایا ہوا غبار سا ہے آسمان پہ

مارا مجھے کسی نے وہ ہوں یا سپہر ہو — میں کس کا نام لوں فقط اپنے گمان پر

یہ تلخ کامیوں کا اثر ہے کہ نزع میں — کچھ موت کا مزہ نہیں کھلتا زبان پر

کیا جانئے یہاں سے گئے اور آئے کب — نشہ اُتر گیا تو کھڑے تھے دکان پر

مژگاں کی جنبشوں سے مرا دل ہدف کرو — دیکھوں تو کتنے تیر چڑھے ہیں کمان پر

نالوں میں انتشار رہا اچھا شبِ فراق — کوئی زمین پر ہے کوئی آسمان پر

میری طرح ہے حال مرا اُنکا خیر خواہ — عاشق ہوا اُنکی نیند مری داستان پر

ثاقبؔ جہاں میں عشق کی راہیں ہیں بے شمار
حیران عقل ہے کہ چلوں کس نشان پر

۱۶- مارچ ۱۹۰۸ء

ناز تھا جس کو بہت کچھ ناخنِ تدبیر پر — جا پڑا آخر وہی سر بالشِ تقدیر پر

شمع کا سر کاٹ کر اچھا نہیں ظالم کا حال — اک دھواں سا اُڑ رہا ہے چہرۂ گلگیر پر

چھانٹ ڈالا قلبِ فریادی کو میں نے شامِ غم — کھو گئے نالے وہ جنکو ناز تھا تاثیر پر

کیوں تمنا کر کے اپنی زندگی کا دوں ثبوت — مر مٹی ہیں سب مرادیں خواہشِ تقدیر پر

سب کی آنکھوں سے بچا کر دل نے کھینچا تھا جسے — ہے نگاہِ آسماں ثاقبؔ اُسی تصویر پر

۱۲- مارچ سنہ ۱۹۰۲ء

خون کس کس کا ہوا صدقے تری تلوار پر — فصلِ گل دھبّے ہیں لاکھوں دامنِ گلزار پر

اب رہا دل تا قیامت ابروئے خمدار پر — کیا ہٹیگا وہ جو گردن رکھ چکا تلوار پر

فصلِ گل رخصت ہوئی رو لیجئے گلزار پر — بس یہی دو تین پنکھڑیاں ہیں یا دو چار پر

وصل و فرقت کی شبیں دونوں نہیں آتی نہیں — ہنس رہا ہوں رو رہا ہوں طالعِ بیدار پر

انتہا پر عشق آکر ہوگیا ہے عینِ حسن — موت کی بھی آنکھ پڑتی ہے ترے بیمار پر

وصل سے مایوس ہو کر کام میرا بن گیا — سیکڑوں اقرار صدقے ہوگئے انکار پر

بن نہیں لاکھوں بڑے ہیں مڑکے پیچھے دیکھئے — نقشِ پا غش کھا گئے ہیں شوخیِ رفتار پر

داغ والوں کے نشیمن شب کو بھی چھپتے نہیں — دھوپ سی پھیلی ہوئی ہے باغ کی دیوار پر

گردنیں وہ خم کیے ہیں جنکے سر ہیں بارِ خوں — تو اگر خود بیں نہیں ہے ڈال اک نظر تلوار پر

اشکِ گریانِ چمن سے خندۂ گل دب گیا — اوس پڑتی ہے نئی ہر شب سرِ گلزار پر

ایک اک رگ دے رہی ہے لَو دفورِ سوز سے
ناز ہے ثاقب کو اپنے خلعتِ زرتار پر

۲۷- جنوری سنہ ۱۹۱۳ء

ہے خزاں میرے لئے قصۂ تاثیرِ بہار
رنگ اُڑ جائے اگر دیکھ لوں تصویرِ بہار

زہر زخموں میں ہے یا آگئی تاثیرِ بہار
واہ رے دل کہ خزاں ہو کے ہے تصویرِ بہار

قید میں کھنچ کے نہ آجائے گی تاثیرِ بہار
لاکھ دکھلائے مرا دل مجھے تصویرِ بہار

تھی کبھی خاطرِ افسردہ میں تاثیرِ بہار
اب نہ پہلو میں وہ دل ہے نہ وہ تصویرِ بہار

غنچے شب بھر جسے مٹھی میں چھپا رکھتے ہیں
صبح کو پھول دکھاتے ہیں وہ تحریرِ بہار

عشقِ بلبل کی گرہ کھلنے کے قابل نہ رہی
مشکلیں ڈال گئے ناخنِ تدبیرِ بہار

شاخ در شاخ ہیں اشجار مگر کیا ممکن
بوئے گل ہو کے رہے قیدیِ زنجیرِ بہار

گن کے گلہائے چمن کاٹ یہ دن اے بلبل
ایک دو رات کا ہے طالعِ تقدیرِ بہار

فصلِ گل آئی زمانے میں جنوں کے ہمراہ
صورتِ پنجری میں رہی تاثیرِ بہار

طوق تو گردنِ قمری کو ملا گلشن میں
دلِ دیوانہ، بتا کیا ہوئی زنجیرِ بہار

ذکرِ گلشن ہو، کہ ہو یادِ جمالِ محبوب
انھیں دونوں میں کوئی ایک ہے تصویرِ بہار

تیرے ہوتے ہوئے گلِ گلشن کو میں دیکھوں، توبہ
ابھی ایسی تو نہیں قوتِ تسخیرِ بہار

قید ہونے سے مرے کم رہا آوازۂ گل
میں نے چاہا تھا، مگر خوبیِ تقدیرِ بہار

مجھ سے بے پر کو ہے سبزے کے نمو سے کیا کام
پر نکل آئیں تو سمجھوں کہ ہے تاثیرِ بہار

آشیاں لاکھ اُمیدوں سے بنا رکھے ہیں — عندلیبوں کے لئے موت ہے تاخیر بہار

حلقۂ دام و قفس کی تو ضرورت ہی نہ تھی — پہلے ہی توڑ چکا تھا مرا دل تیر بہار

ساتھ پھولوں کا دیا زخم جگر نے کھل کے — دلِ مجروح پہ اُلٹی ہوئی تاثیر بہار

دل شگفتہ ہے اسیری میں کہ ہے موسمِ گل — اپنی زنجیر کو میں کہتا ہوں زنجیر بہار

باغباں دیکھئے چل نقش و نگارِ قدرت — سبزۂ صحنِ چمن ہے خطِ تقدیر بہار

اب تو کیا جب کبھی آزاد تھا میں گلشن میں — بول اُٹھتی تھی ہر آوازہ پہ تصویر بہار

میں تو میں گل بھی تو ہیں جامہ دری میں مشغول — سب کو دیوانہ کئے دیتی ہے تاثیر بہار

ہچکیاں غنچوں کی رک جائیں تو کچھ بات کھلے — صاف ہوتی نہیں الجھی ہوئی تقریر بہار

کتنے نیرنگ چمن میں ہیں خدا ہی جانے — کچھ نہ کچھ ہر ورقِ گل پہ ہے تحریر بہار

فکر لائی ہے یہ گلدستۂ رنگیں ثاقب
اہلِ محفل کو دکھاتا ہوں میں تصویر بہار

۳۔ جنوری ۱۹۱۷ء

دل کے چھوٹے ہاتھ نہیں سکتے بسیطِ خاک پر — جو گرا آنسو وہ تارا ہو گیا افلاک پر

داغ ہے ابھرے ہیں نقشِ پا جب پاؤں رکھے خاک پر — دل سے کہتا ہوں کہ آنا ایسے ہی بیباک پر

صبر کی سالم قبائیں تو ہزاروں ہیں مگر / ٹھیک بیٹھتی ہی نہیں کوئی دلِ صد چاک پر

دم نہیں لیتا دھواں دل کا، نظر آئے تو کیا / سیکڑوں پردے پڑے ہیں دیدۂ ادراک پر

اب کہ جب تاثیر کی حاجت نہیں زیرِ مزار / اک مؤثر نقش پیدا ہو گیا ہے خاک پر

کس خیالِ خام میں ہیں طالبانِ تخت و تاج / آسماں رہنے نہ دیگا بوریائے خاک پر

آتشیں ہوتا نہ آبِ خاک زاد اتنا مگر / آفتاب ایسا ہی چمکا تھا عنب کے تاک پر

بارِ جوں کیونکر اٹھا لیتے ہیں وہ نازک مزاج / زرد ہو جائیں جو رنگ آئے کوئی پوشاک پر

برہمیِ حسن کا میں دے نہیں سکتا جواب / عشق نے کیوں ہاتھ ڈالا اس دلِ غمناک پر

آشیانہ تو بنا لوں قید و آزادی سے کیا / یا ہوا پر سیر ہو گی یا رہوں گا خاک پر

میں نہیں کہتا کہ اچھا ہے جنونِ فتنہ زا / ہے مگر چشمِ جہاں قلبِ گریباں چاک پر

عشق نے باندھا ہے پل مابینِ ہستی و عدم / راستہ ہے گردنوں کا خنجرِ سفاک پر

بے نشانوں کے نشاں ہوں یا کوئی تعویذِ غم / کچھ گھروندے سے بنائے ہیں اجل نے خاک پر

جامۂ منعم سے اچھا ہے یہ بوسیدہ لباس / چاک دھبا ہو نہیں سکتا کسی پوشاک پر

مل گیا دل خاک میں **ثاقب** تو سناٹا سا ہے
اک اداسی چھا رہی ہے دشتِ وحشتناک پر

۱۵- فروری ۱۹۱۷ء

دل کیوں تپاں ہو کوچۂ دلدار دیکھکر — آگے بڑھوں گا چرخ کی رفتار دیکھکر
خوش ہو سکا نہ حالِ دلِ زار دیکھکر — جلتا ہے غیر میری شبِ تار دیکھکر
سمجھے نہ آپ دیدۂ خونبار دیکھکر — کیا کیجیئے گا حالِ دلِ زار دیکھکر
صیاد، داغِ دل نہ سمجھنا، کہ چلتے وقت — گلشن کے پھول لایا ہوں دو چار دیکھکر
طے کرکے آج خانہ بدوشی کی منزلیں — بیٹھا ہوں اُس کا سایۂ دیوار دیکھکر
کچھ کچھ، زمانہ جان گیا کارِ حُسن و عشق — منصور کو جہاں میں سرِ دار دیکھکر
وقفِ زبانِ اہلِ حسد ہے لہو مرا — خوش ہو رہا ہوں وادیِ پُر خار دیکھکر
تیغ نہیں، کہ طور کے اسرار ملے جائیں — اے برقِ حسن، حالِ دلِ زار دیکھکر
اب دہر روشناسِ وفا و جفا ہوا — میرے گلے پہ آپ کی تلوار دیکھکر
محشر میں کوئی پوچھنے والا تو مل گیا — رحمت بڑھی ہے مجھکو گنہگار دیکھکر
ہے روشنی قفس میں، مگر سوجھتا نہیں — ابرِ سیاہ، جانبِ گلزار دیکھکر
روتا ہوں شامِ غم میں دلِ گم شدہ کو میں — یاد آرہی ہے شمع شبِ تار دیکھکر
چلئے، مگر خیال رہے عمرِ دہر کا — تھم جائے آسماں نہ یہ رفتار دیکھکر

روتا ہوں وقتِ نالہ گزرنے سے اور بھی — شب کو طلوعِ صبح کے آثار دیکھ کر

بس ایک دن کی بات ہے اے عشقِ لایزال — میں کیا کروں گا مصر کا بازار دیکھ کر

کیا تھا، کہ ایسے وقت میں صاحبدلانِ حشر — دیکھا کئے مجھے، تری تلوار دیکھ کر

صد چاک دل کا ذکر نہ بھولا میں دیر میں — تسبیح یاد آ گئی زنار دیکھ کر

ٹوٹے ہیں شیشہ ہائے دل اتنے کہ اہلِ درد — رکھتے ہیں پاؤں خاک پہ سو بار دیکھ کر

صیاد کس جگہ پہ قفس ہے کہ دل مرا — در ہو رہا ہے باغ کی دیوار دیکھ کر

اُن دوستوں میں وہ نہوں یا رب جو وقتِ دید — بیمار ہو گئے، رخِ بیمار دیکھ کر

وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فرازِ دہر — جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر

کہتے ہیں دل لگی، مری شامِ فراق کو — اچھا یونہی سہی، مگر اک بار دیکھ کر

ثاقب عجب نہیں کہ سرِ طورِ امتحاں
غش دل کو آئے جلوۂ اشعار دیکھ کر

۱۷۔ فروری ۱۹۲۴ء

خبر جب ہے نہ پھولوں کو، تو مرجا بے خبر ہو کر — چمن کی دھن، قفس میں کس لئے بے بال و پر ہو کر

لگا دی آگ دل میں دیدۂ گریاں نے تر ہو کر — رہا دامن میں شامِ غم کے، میں شمعِ سحر ہو کر

وہ روئے دوست جو تقدیر سے اک در چمکا تھا
مرے سینے کے اندر رہ گیا داغِ جگر ہو کر

دلِ ناداں سمجھ لے اب تو معنی لفظِ وحدت کے
ہمارا ساتھ چھوڑا زندگی نے بھی بسر ہو کر

کوئی منزل نہ دیکھی سخت تر عشق و محبت سے
دو عالم چھان ڈالے ہیں، دل کا ہم سفر ہو کر

مرے صد پارہ دل میں زندگی کب تک چھپی رہتی
اجل کو راستہ بتلا دیا زخموں نے در ہو کر

شبِ فرقت نہیں وہ شب کہ آئے اور گزر جائے
رہیگی رات میری سرمۂ اہلِ نظر ہو کر

مرے ضائع شدہ نالوں کی مجھکو یاد دلوا دی
جہاں والوں نے، محوِ نالۂ مرغِ سحر ہو کر

ابھی تو نقطۂ موہومِ ہستی ہوں زمانے میں
کسی دن دیکھ لینا پھیل جاؤنگا خبر ہو کر

انھیں ذرّوں میں جلوے ہیں، انھیں ذرّوں میں ظلمت ہے
زمیں کو خوب دیکھا میں نے وقفِ دردِ سر ہو کر

مجھے بہلا نہیں سکتا کوئی اس بزمِ عالم میں
کہ میری بیدلی پہلو میں بیٹھی ہے جگر ہو کر

مرا نالہ حسینوں سے سوا مشہورِ عالم ہے
اثر والوں سے آگے بڑھ گیا ہے بے اثر ہو کر

وجودِ بے ضرر ہوں باغباں گلشن میں رہنے دے
کسی جا پڑ رہونگا سایۂ برگِ شجر ہو کر

ہوائے دہر دشمن تھی، تو مرنے پر بھی دشمن ہے
لحد تک شمع آئی تو، مگر شمعِ سحر ہو کر

نہیں معلوم کیا کچھ ہے ودیعت کیسۂ زر میں
خزانہ دارِ قدرت بن گیا بے مال و زر ہو کر

سمجھ میں عالمِ غربت کے قصے آ نہیں سکتے
ہماری منزلوں کو دیکھ لیجے ہم سفر ہو کر

مجھے دکھلا گئی ہیں بخت و قسمت کے کرشموں کو — نگاہیں باثر ہو کر، دعائیں بے اثر ہو کر

یہ پیکانِ محبت، مظہرِ اسرارِ الفت ہے — مرے دل میں ہے دل ہو کر، جگر میں ہے جگر ہو کر

جہاں تھا تنگ جس طولِ امل کے پھیل جانے سے — لحد میں آ گیا سارا وہ قصہ مختصر ہو کر

نہیں معلوم پائے سعی میں کانٹے کہاں کے ہیں — مرادیں ہٹ کے چلتی ہیں نکلتا ہوں جدھر ہو کر

ہزاروں کاروانِ غم ہیں، منزل پھر بھی خالی ہے — یہ دل کتنا بڑھا لے وسعت تیری رہگزر ہو کر

نہیں ہے قوتِ پرواز، تو رہنا مبارک ہو
چمن کی سیر کر ثاقب یونہی بے بال و پر ہو کر

۲۱- جون ۱۹۲۲ء

نکل آتے ہیں آنسو اب دماغ و دل کی حالت پر — گئے وہ دن کہ مجھ کو ناز تھا اپنی طبیعت پر

لہو کے گھونٹ پیتا ہوں مگر اُف کر نہیں سکتا — مبادا حرف آ جائے کوئی نامِ محبت پر

جو دل گھائل ہو الفت کا تو جاں بچ نہیں سکتا — قریبِ دربلا آ ہی گئی دامانِ عصمت پر

خدا جانے وہ تارے کیا ہوئے ٹوٹے تھے جو شب کو — میں سمجھا تھا چڑھائے آسماں نے پھول تربت پر

مریضِ غم بُرا کیا ہے بہت اچھی گزرتی ہے — کبھی آغوشِ حسرت میں کبھی دوشِ محبت پر

وہیں سے دل نے بدلا حشر میں فریاد کا پہلو — جب اُس نے سر جھکایا میری تمہیدِ شکایت پر

نشیمن کی تباہی آفتِ جاں تھی مگر ثاقب
گلستاں کا اُجڑ جانا قیامت ہے قیامت پر

۱۴- نومبر ۱۹۱۵ء

تنِ لاغر ہے اک نقشِ دو غارِ سنے دو بستر پر　　سمجھ لو تم کہ اک تصویر پیدا ہوگئی در پر
مفیدِ اہلِ عالم ہے بہت کچھ بےچینی دل کی　　زمانہ کروٹیں لیگا جو میں تڑپونگا بستر پر
دلِ میکش کی مٹی سے بنایا تھا اسے شاید　　کہ سارا میکدہ ٹوٹا ہوا ہے ایک ساغر پر

۱۳- جنوری ۱۹۱۵ء

رنگِ غم بدلا کیا ہر رنگِ گلشن دیکھکر　　اشکِ شبنم تھم گئے پھولوں کا دامن دیکھکر
آسماں کے سامنے دل کی نمائش کیا ضرور　　جی دھڑک جاتا ہے دورِ چشمِ رہزن دیکھکر
حسنِ انگیزِ جہاں ہے عاشقوں کی کائنات　　بھول جاتے ہیں چمن میرا نشیمن دیکھکر

۲۱- جولائی ۱۹۱۳ء

یوں چمن میں بڑھ چلا ہے دورِ تسخیرِ بہار　　پتے پتے پر اتر آئی ہے تصویرِ بہار
بوئے مطلب آہی جائیگی قفس تک بھی ضرور　　خطِ ریحاں میں زمیں لکھتی ہے تفسیرِ بہار
جلوۂ محبوب پیارا ہے مضر ہو یا مفید　　فصلِ گل میں ابر کی بجلی ہے شمشیرِ بہار

مدتوں کے بعد کی تھی کل قفس میں فکرِ عیش
سو سونچنے پر بھی نہ آئی دل میں تصویرِ بہار

۱۹- فروری سنہ ۱۹۰۶ء

قیامت تو کی تم نے دو گام چلکر ہمیں رہ گئے اپنی کروٹ بدل کر
زرا دیکھ پروانے کروٹ بدل کر ستی ہو گئی شمع محفل میں جلکر
سروں کو جھکائے ہیں سرکش جہاں کے یہ کیا دیکھتا ہوں لحد سے نکل کر
یہ ارماں اُسی دل کے دشمن ہوئے ہیں بڑے ہو گئے جس کے دامن میں پلکر

۲- فروری سنہ ۱۸۹۷ء

ہے ابتدائے عشق میں یہ حالِ زارِ دل پیشِ نظر ہے صورتِ انجامِ کارِ دل
کیوں وے بیخودی یہ برسنے لگا ہے نور کس کی تجلیاں ہوئیں آئینہ دارِ دل
رہ پاک صاف داغِ ہوس سے کہ عشق میں بے آبرو نہ ہو گہرِ آبدارِ دل
پیتا ہوں گردِ غم کی بدولت لہو کے گھونٹ دھونا پڑا ہے خونِ جگر سے غبارِ دل
ہے زہرِ عشق و داغِ محبت سے اجتناب چھوتے نہیں وہ ساغرِ مینا نگارِ دل
آتی ہے زلزلے میں ذرا سی دھمک کے ساتھ سیماب بن رہی ہے زمینِ مزارِ دل

سینے میں جب سے آتشِ الفت ہے شعلہ ریز — ہنستے ہیں ذکرِ طور کو سن کر شرارِ دل

۲۱- فروری ۱۹۱۸ء

میں نہیں کہتا کہ دنیا کو بدل کر راہ چل — خار ہیں پیراہنِ گل میں سنبھل کر راہ چل

دور ہے ملکِ عدم اور تجھ میں دم باقی نہیں — ہو سکے تو بس یونہی کروٹ بدل کر راہ چل

طالبِ منزل ہے پھر عزلت نشینی کس لیے — رہروؤں کو دیکھ لے گھر سے نکل کر راہ چل

کوئے جاناں میں زمانہ ہو گیا روتے ہوئے — تا کجا دل کا تأسف، ہاتھ مل کر راہ چل

یوں رسائی تا سحر ممکن نہیں اے دل مگر — شمع کی صورت شبِ غم میں پگھل کر راہ چل

۱۷- فروری ۱۹۱۷ء

جل گیا خاک ہوا کب کا، وہ پروانۂ دل — ختم ہوتا نہیں اب تک مگر افسانۂ دل

حشر کے دن پہ اٹھا رکھا کہ بڑا سودا ہے — عالمِ حسن سے ممکن نہیں بیعانۂ دل

آپ کی اک نگہِ ناز اسے چھلکا دیتی — قابلِ شربتِ دیدار تھا پیمانۂ دل

ہم جبھی سمجھے تھے انجام، کہ جب فطرت نے — خاک اور خون سے تیار کیا خانۂ دل

جلنے والے سے الگ ہو گئے ہم مشربِ جاں — دے کے آگ اٹھ گئی وہ صحبتِ رندانۂ دل

تشنۂ جامِ محبت سے نہیں واقف ہیں — قدر کیا انکو جو توڑا کئے پیمانۂ دل

دہری زنجیر میں جکڑا ہے مقدر نے مجھے — اُس کا دیوانہ ہے دل اور میں دیوانۂ دل

ضبط کرتا ہوں مگر ڈر ہے کہ شامِ غم میں — کہیں تنگ آکے نہ کھل جائے سلح خانۂ دل

اب تو قطرہ نہیں، ہاں وہ بھی کبھی دن تھے کہ ہم — مست ہو جاتے تھے خود دیکھ کے میخانۂ دل

جائے امید و تمنا کا پتا ملتا ہے — اب بھی دلکش ہے مرے واسطے ویرانۂ دل

ہے تو مٹی کا مگر قدرتِ خالق بھی ہے — حُسن والے نہ بنا لیں کوئی پیمانۂ دل

دیکھ کر تفرقۂ مہر و جفا ہم سمجھے — ایک ہی وضع کا بنتا نہیں کاشانۂ دل

کائناتِ دو جہاں پاس ہے پھر تنگ نہیں — اور بھی کچھ ہو تو خالی ہے ابھی خانۂ دل

رُخِ رنگینِ حسیں ایک چمن ہے لیکن — روندنے کے لئے ہو سبزۂ بیگانۂ دل

حسن ہے خودبیں زمانہ ہے وہ کیوں گھبرائیں — اور یہاں کیا ہے مگر ہاں وہی ویرانۂ دل

مٹ گئے تصویرِ خرابات ہے اب تو، ورنہ — کعبہ کہتے تھے سب ایسا تھا صنم خانۂ دل

کہئے قصہ کوئی اربابِ وفا کا **ثاقب**

چھوڑیئے ذکر جفا کا کہ ہے بیگانۂ دل

۱۴۔ مارچ ۱۹۲۲ء

ڈوبے لہو میں قتل ہوئے تیغِ کیں سے ہم — سرکے نہ امتحانِ وفا کی زمیں سے ہم

سجدے کا کام آج نہ لینگے جبیں سے ہم — نقشِ قدم اُٹھائینگے اُنکے زمیں سے ہم

نادم ہیں آنیوالونکے قلبِ حزیں سے ہم — تا حشر اب نکل نہیں سکتے زمیں سے ہم

منہ پھیر کر چلے گئے ہر اک حسیں سے ہم — کیا خوش ہوئے ہیں مرکے دمِ واپسیں سے ہم

آنکھوں سے بہہ رہا ہے لہو قتل کیا ضرور — خنجر نہ دے جواب تو پوچھیں تمھیں سے ہم

نظارۂ ندامتِ قاتل نہ ہو سکا — آخر کو چھپ گئے نگہِ شرمگیں سے ہم

اے عشق کون ہے سبق آموزِ صبرِ دل — نالے تو سیکھ لینگے کسی دل حزیں سے ہم

غصے کے بعد تیغ زنی کا محل نہیں — پہلے ہی ذبح ہو گئے چینِ جبیں سے ہم

کرلیں سوالِ وصل کہ باتوں میں ہے مزہ — ہاں بھی اگر نہ ہو تو ہیں راضی نہیں سے ہم

ایذائے غیر سے جو ہوا نام بھی تو کیا — نادم تمام عمر رہے ہیں نگیں سے ہم

شایانِ دیدِ محفلِ عالم ضرور تھی — مجبور ہو گئے دلِ عزلت گزیں سے ہم

عالم کے حادثوں سے نباہیں تو کس طرح — پیدا وہ آسماں سے ہوے ہیں زمیں سے ہم

قاصد پیام دیدہ ور رخ لے کے جا مگر — جو دل کا حال ہو وہ کہیں گے انہیں سے ہم

نغمۂ جاں، نوحۂ اہلِ قفس ہے یہ — صیاد ذبح ہو گئے اس آفریں سے ہم

پہرے بٹھا دیئے ہیں جنوں نے حواس پر — رستہ نہیں کہ آپ میں آئیں کہیں سے ہم

بد قسمتی کی حد ہے کہ نزدیک ہو کے بھی
نا آشنا ہیں خانۂ دل کے مکیں سے ہم

رونے سے راز فاش ہوا دل کی کیا خطا
سیل آ گئی نہ روک سکے آستیں سے ہم

ہے ابتدائے عشق میں اتنا ہجوم یاس
آگے نہ راستہ ہو تو پلٹیں یہیں سے ہم

ثاقب ملالِ اہلِ حسد بھی ہے ناگوار
کیا خوش ہوں اپنی طبعِ سخن آفریں سے ہم

۹- فروری ۱۹۱۶ء

دل سے میں کہہ رہا ہوں تجھ پر ہوا فدا میں
دل مجھ سے کہہ رہا ہے او بے خبر جلا میں

زیرِ مزار جا کر ڈرتا فلک سے کیا میں
یوں مٹ کے رہ گیا ہوں جیسے کبھی تھا ہی میں

تڑپا دیا ہے دل کو شاباش ہم صفیرو
یونہی پھر اک صدا دو ٹوٹا قفس چلا میں

وہ نزع کی خموشی جام جہاں نما تھی
اک عمر کی کہانی دم بھر میں کہہ گیا میں

دل کی جراحتوں کے مرہم کہاں سے لاؤں
پھٹتا رہا وہ دامن جس کو سیا کیا میں

راحت ملی علایق دنیا کے قطع کر کے
گلشن میں بند کھولے کھاتا رہا ہوا میں

رکھتا ہے جذب کتنا کاشانۂ محبت
دیکھا نہ مڑ کے دل نے دیتا رہا صدا میں

پھر اور کس طرح سے اجڑے مکاں کو بیچتا
قصرِ لحد میں آ کر تصویر ہو گیا میں

صیاد نے چھڑایا مجھ سے وہ آشیانہ — اک عمر جس کی خاطر تنکے چنا کیا میں

کھل جائیگی حقیقت اس عاریت سرا کی — جس دن اُتار دونگا یہ جامۂ فنا میں

ناز و ادا کی چوٹیں سہنا تو اور شے ہے — زخموں کو دیکھ لیتا کوئی تو دیکھتا میں

کچھ بولتا تو کھلتے کاہیکو رازِ عالم — شمعِ خموش بنکر سب کی سنا کیا میں

دنیا کے اہلِ عبرت پڑھ لینگے یہ کتابت — مٹی پہ چھوڑتا ہوں اک نقشِ بوریا میں

جو ہم سفر تھے انکو اتنی خبر نہیں ہے — آگے نکل گیا ہوں یا پیچھے رہگیا میں

برقِ جمالِ وحدت تو ہی مجھے بتا دے — شعلہ تو دور بھڑکا پھر کس لئے جلا میں

کروٹ نہ لے سکا دل تیرا نظارہ کرکے — بزمِ جہاں میں دیکھوں کس کو ترے سوا میں

محشر نما تھا عالم اس تنگنائے دل کا — وہ بھیڑ حسرتوں کی دیکھی کہ کھو گیا میں

فرقت نصیب دل کو وصلت کا ہوش کب تھا — کہتا ہے مجھ سے کوئی تجھسے قریب تھا میں

ثاقب غزل نہیں تھی یہ ماجرائے دل تھا
جو کچھ تھا رازِ الفت باتوں میں کہہ گیا میں

۲۲- جون ۱۹۱۴ء

حسن کی وہ صورتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں — پردۂ دل میں لگا کر آگ پنہاں ہو گئیں

ٹپکے بھی آئینۂ رخسارِ خوباں ہو گئیں
خونِ اہلِ عشق کی بوندیں گلستاں ہو گئیں

چھپ گئیں آنکھوں سے ذرے زمیں نمایاں ہو گئیں
بستیاں اجڑی ہوئی ملک بیاباں ہو گئیں

دیکھتا کون اور سمجھاتا کون اس دل کی لگی
ہڈیاں جل جل کے شمعِ زیرِ داماں ہو گئیں

زندگی میں کیا مجھے ملتی بلاؤں سے نجات
جو دعائیں کیں وہ سب تیری نگہباں ہو گئیں

اس ہوائے دہر میں جمعیتِ خاطر کہاں
دل کو جانے دو یہ زلفیں کیوں پریشاں ہو گئیں

ضعف باقی ہے کوئی جس کا نہیں پرسانِ حال
قوتیں سب نذرِ عشقِ فتنہ ساماں ہو گئیں

لوٹ لی گردوں نے آخر دل کی ساری کائنات
کچھ تمنائیں تھیں وہ بھی وقفِ نسیاں ہو گئیں

دوستدارِ گل ہوں میں کس نے قفس سے کہہ دیا
مجھکو پا کر تیلیاں خارِ مغیلاں ہو گئیں

کم نہ سمجھو دہر میں سرمایۂ اربابِ غم
چار بوندیں آنسوؤں کی بڑھ کے طوفاں ہو گئیں

آرزوئے عالمِ فانی تھا آدم کا وجود
خواہشیں تھیں جو بہم گھل مل کے انساں ہو گئیں

خانماں برباد ہونے کا مجھ پہ احساں ہے کہ میں
اُن زمینوں میں نہیں جو بس کے ویراں ہو گئیں

میری آنکھیں شور تھا جنکی وفا کا ہر طرف
زخم دل میں پڑتے ہی دونوں نمکداں ہو گئیں

عقدہ ہائے غم سے وابستہ ہے اپنی زندگی
ہم کہاں یہ مشکلیں جس وقت آساں ہو گئیں

میں نثارِ دستِ قاتل مر کے زندہ ہو گیا
خنجر و شمشیر کی دھاریں رگِ جاں ہو گئیں

اک سرابِ دشت تھیں فصلیں شبابِ حسن کی — دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں

کیا وفاداروں کے جی ڈوبے ہیں جوشِ عشق میں — کشتیاں دل کی ہزاروں نذرِ طوفاں ہو گئیں

مجمعِ احباب کی روداد ثاقبؔ کیا کہوں
اب وہ اگلی صحبتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں

۱۵- فروری ۱۹۱۷ء

خود فراموشِ قفس ہم ہیں چمن یاد نہیں — غیر کے ہو گئے ایسے کہ وطن یاد نہیں

چاندنی حسن کی اچھی ہے، مگر ناز نکر — تجھکو اس چاند کا تاریک گہن یاد نہیں

اسکی محفل میں ہوا تھا کبھی اپنا بھی گزر — باتیں کچھ کی تھیں مگر مجھکو دہن یاد نہیں

شکوۂ ہجر کی خواہش نکر اے دل کہ تجھے — سامنا ہو، تو کوئی رنج و محن یاد نہیں

جلوۂ حلۂ جنت سے یہ خود رفتہ ہوا — میں نے کن ہاتھوں سے پہنا تھا کفن یاد نہیں

کیوں سُناتے ہو عبث اہلِ وفا کو باتیں — کہ انھیں طرزِ مکافاتِ سخن یاد نہیں

تفرقہ سازیِ گردوں کی یہ حد ہے کہ مجھے — مل کے بیٹھے تھے کبھی روح و بدن یاد نہیں

ہم تو مر مر کے سکھایا کیے لیکن اب تک — عشق کا حُسنِ خود آرا کو چلن یاد نہیں

طرۂ گیسوئے جاناں، تری نکہت کی قسم — میں نے دیکھا تھا، مگر مشکِ ختن یاد نہیں

کیا بتاؤں تجھے میں قیدِ محبت کیا تھی — دست و پا کو مرے زنجیر و رسن یاد نہیں

تیرے نظّارہ میں دل محو تھا ایسا دمِ ذبح — تیغ کا پھل مجھے اے سیبِ ذقن یاد نہیں

داغ گنتے ہوے گزرے ہیں قفس میں شب و روز — کس طرح کھلتے تھے گلہائے چمن یاد نہیں

قدر داں پاکے بہل جاتے ہیں آوارہ وطن — جب تو نکلے ہوے موتی کو عدن یاد نہیں

ذبح ہونے سے مرے انکو تعجب ہو تو ہو — اپنے ماتھے کی وہ خونریز شکن یاد نہیں

کون سنتا ہو یہ افسانۂ غم اے **ثاقب** — قابلِ اہلِ زمانہ کوئی فن یاد نہیں

۲۰ - فروری ۱۹۱۷ء

لاغری سے اک ورق ہوں دفترِ تاثیر میں — جان پڑ جائے جو کام آئے تری تعمیر میں

ہوگیا حرفِ غلط مٹکر غمِ جاں گیر میں — لکھنے والا اور کیا لکھتا مری تقدیر میں

کشفِ رازِ عالمِ باطن ہو حصہ حسن کا — حضرتِ یوسف کو کتنا دخل تھا تعبیر میں

اور دنیا تنگ ہو جائے تو کیا ہوگا مرا — پاؤں برسوں رکھ چکا ہوں خانۂ زنجیر میں

پیشِ عاقل بولتا ہے عالمِ نقش و نگار — کہہ گئی سب کچھ خموشی پردۂ تصویر میں

روکتا ہو لذّتِ دیدار سے آرامِ ذبح — نیند آتی ہو ہوائے دامنِ شمشیر میں

خون آنکھوں سے نکلتا ہو تو نکلے صبح کر — ہاں تمنا بھی نکلتی ہے مگر تاخیر میں

اور کچھ دن ساتھ رہ جائے تو سُن کر کھنیا — درد پیدا ہو چلا ہے نالۂ زنجیر میں

آسماں پیدا نہیں کرتا کبھی ظالم کی روک — ہم نے کانٹا آج تک دیکھا نہ راہِ تیر میں

اللہ اللہ کس قدر ہے وسعتِ بختِ سیاہ — ہجر کی راتیں سمائی ہیں مری تقدیر میں

ہو گئی ہو مشکلوں کو ضد تو کیا ٹالے ملیں — رہ گئے عقدے اُلجھ کر ناخنِ تدبیر میں

نامہ لکھتے وقت کیا جانے قلم کیونکر چلا — اضطرابِ دل نظر آنے لگا تحریر میں

ظالم و مظلوم، اُنکے زورِ بازو پر نثار — چھوڑتے ہیں دل پہ چٹکی لیکے پائے تیر میں

قابلِ جنبش تھا جبتک رو چکیں کڑیاں مجھے — آج سناٹا پڑا ہے خانۂ زنجیر میں

ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی دلِ سوزاں کی خاک — ایک چٹکی اور شامل ہو گئی اکسیر میں

غرقِ رحمت ہو کے دیکھا جوشِ دریائے کرم — عفو نے دھبا نہ چھوڑا دامنِ تقصیر میں

آہیں کرتا جا، کہ زورِ ناتوانی ہے بہت — جھک چلا ہے چرخ گر جائیگا دو اک تیر میں

جان لینے سے نہ کم ہو گی بہارِ زخمِ دل — پھول ہو جائیگا آکر پیکرِ تصویر میں

نالۂ دل تا بلب **ثاقب** نہیں پہونچا ابھی
اک تلاطم ہو رہا ہے عالمِ تاثیر میں

۱۸ جنوری ۱۹۱۷ء

کبھی حجاب میں تھا دل پر اب نہیں حجاب میں
اک آئینہ لگا ہوا ہے دیدۂ پُر آب میں

بتایئے رہے گی شمع کس طرح حجاب میں
یہ کیا سمجھ کے حسن کو چھپا دیا نقاب میں

ہے سیلِ اشک آنکھ میں تو دل ہے اضطراب میں
نہیں کچھ خوف ہے سوا جو کشتیاں ہیں آب میں

مری لحد پہ روشنی روا روی میں ہو گئی
کہاں کا نور آ گیا تھا حلقۂ رکاب میں

جنوں اسکو جانیے کہ شغلِ زندگیِ دل
لگا کے آگ دیکھتا ہوں خانۂ شباب میں

میں قابلِ خطاب ہوں یہ کم نہیں مرے لئے
وہ ہاں نہ ہو نہیں سہی لکھیں تو کچھ جواب میں

حواس تو ہیں منتشر خیال منتشر نہیں
جو دیکھتا ہوں جاگ کر وہ دیکھتا ہوں خواب میں

امیدِ زندگی کہاں ہے بعدِ صبحِ شامِ غم
یہی تو ایک رات تھی جو آ گئی حساب میں

اسیر میں تو ہو چکا خبر لو اپنے یاد کی
کمر سے آگے بڑھ چلی ہے زلف پیچ و تاب میں

دوا یہ کون سی ملی ترے شہیدِ ناز کو
نہ آنکھ میں وہ جوش ہے نہ دل ہے اضطراب میں

ازل کے سوختہ جگر کہاں سے لائینگے تری
لہو کی بوند دل میں ہے نہ قرصِ آفتاب میں

یہ کیا کہ مشکلیں مری ہوئیں نہ سہل آج تک
کبھی تو انقلاب ہے فلک کے انقلاب میں

عتابِ صبح رات کو بھی دشمنِ قرار تھا
کسی جبین کی شکن چھپی تھی فرشِ خواب میں

ثواب کہتے ہیں کسے دکھا دے حشر میں مجھے
کریم پہلی زندگی تو کٹ گئی عذاب میں

پکارتے پکارتے قفس میں تھک گیا ہوں میں
جو کوئی ہمصفیر ہو تو بول اُٹھے جواب میں

سنبھل چلا ہے حشر میں غریق موجۂ فنا
ابھر رہا ہے دل کا نام فردِ انتخاب میں

خیالِ عزّ و جاہ میں ہزار دن گزر گئے مگر
ستارہائے یوسفی نظر نہ آئے خواب میں

جو چشمِ اعتبار ہو تو سر جھکا کے دیکھ لے
حقیقتِ قصورِ دہر گنبدِ حباب میں

فغانِ ثاقبِ حزیں نہ اور ڈھونڈئیے کہیں
نہ یہ صدا ہے چنگ میں نہ یہ نوا رباب میں

۲۲-مارچ ۱۹۱۷ء

کبھی جاندار تھا میں اب تو اک تصویرِ بیجاں ہوں
خبر جسکی نہ پوچھی اہلِ منزل نے وہ مہماں ہوں

شکایت ہو تو کیونکر ہو بیانِ غم میں حیراں ہوں
نہ ہوتا صبر اگر دل میں تو کہہ دیتا پریشاں ہوں

نہ یوں مرتا نہ قلبِ اہلِ عالم پر اثر پڑتا
بہت کچھ آپ کی بیداد کا ممنونِ احساں ہوں

جو در کھولا تھا اپنے ہاتھ سے وہ قید خانہ تھا
بڑی مدت سے رہنِ حبسِ چاکِ گریباں ہوں

مٹایا گو بہت کچھ گردشِ افلاک و قسمت نے
مگر میں دفترِ عالم کی اک فردِ نمایاں ہوں

جنودِ حسرت و غم کا علم بردار ہوں ثاقب
گدائے بے نوا ہوں اور بے سر و ساماں ہوں

۵- مارچ ۱۹۰۹ء

کل تو سب کہتے تھے اک محفل ہے یہ زنداں نہیں
آج سناٹا پڑا ہے کیونکہ میں مہماں نہیں

چین سے تربت میں سوتا ہوں تو نازش کس لیے
یہہ عنایت موت کی ہے آپکا احساں نہیں

کھالیا پیراہن ہستی کو اشک شور نے
اب لہو آنکھوں سے نکلا ہے کہ جب داماں نہیں

سر اُٹھا کر روکتے ہیں کس لئے کانٹے مجھے
یہہ تو صحرا کی زمیں ہے کوچۂ جاناں نہیں

درِ دل کے شوق میں آ بیٹھتے ہیں فاقہ مست
خانۂ درویش ہے حاجب نہیں درباں نہیں

اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جب در سے اٹھاتا ہے کوئی
بے نوا ہیں جز متاعِ دل کوئی ساماں نہیں

مجھکو روتا دیکھکر کیوں بھاگتے ہیں اہلِ دہر
جو ڈبو دے غیر کو ایسا تو یہ طوفاں نہیں

بے خطا مجھکو اسیرِ دامِ رنج و غم کیا
جانور ہوں میں مگر صیاد بھی انساں نہیں

پاک دامن کے لئے تر دامنی بھی حسن ہے
تر کسی کے خونِ دل میں پنجۂ مرجاں نہیں

ذبح کر کے پوچھتا ہے کس لئے میرا لہو
میں بھی خوش ہوں ور تری تلوار بھی عریاں نہیں

امتحان گاہِ وفا میں کون رکھے گا قدم
آزمایش ثاقبِ جانباز کی آساں نہیں

۱۴- جون ۱۹۲۰ء

سب ہی میخانے میں لیکن پینے کا کام نہیں — جب میں جاتا ہوں تو پیمانے نہیں یا جام نہیں

کیوں ہی آنکھوں میں اندھیرا کہ ابھی شام نہیں — وہ لبِ بام ہیں، خورشید لبِ بام نہیں

سنگِ عالم کو تراشا ہی مرے نالوں نے — کونسا ہے وہ نگیں جس پہ مرا نام نہیں

ہٹ کہ پہرا درِ جاناں پہ ہے اک عالم کا — یہاں فریاد کا موقع ہے ترا کام نہیں

سو کے بیدار کی حالت کوئی کیا سمجھے گا — شبِ راحت ہی تری رات مری شام نہیں

ضبط و بیتابیِ غم دونوں سے واقف ہوں مگر — دل یہ کہتا ہے کسی ایک میں آرام نہیں

میرے نالوں سے تعجب میں ہے صیاد کہ کیوں — ہاں مگر خستۂ سودائے چمن عام نہیں

بے غرض ہو کے سوئے عشق ہوا مائل اے دل — یہ وہ آغاز ہے جس کے لئے انجام نہیں

پھنس گیا ہوں میں تڑپنے میں مدد کر اے درد — دل میں ٹھانی ہے کہ یا میں نہیں یا دام نہیں

بزم والوں میں نہ گن مجھکو نہ پروانوں کو — کیونکہ سنتا ہوں کہ اسمیں کوئی ناکام نہیں

تیرے چہرے کے ادھر ایک اندھیرا سا ہے — پاس آنے سے ہٹی کیوں جو مری شام نہیں

اپنے ہنسنے کی خبر لے مرے رونے کو نہ دیکھ — میں تو اس نالہ و فریاد سے بدنام نہیں

دل کے پیچھے ہے زمانے کا زمانہ، لیکن — کوچۂ عشق کوئی رہگزرِ عام نہیں

مانگے مجھ سے نہ اب چپ کے سوا اور جواب — تیرے آپ کا بھیجا ہوا پیغام نہیں

کیا رہوں منتظرِ حشر لحد میں **ثاقب**
میرے مرنے کا کسی ایک پہ الزام نہیں

۴- مارچ ۱۹۲۳ء

یہ نہ سمجھو کہ فلک بر سرِ بیداد نہیں — بات یہ ہے کہ مجھے عادتِ فریاد نہیں

کیوں تعجب ہو جو دل مائلِ فریاد نہیں — ظلم جو آنکو پسند آئے، وہ بیداد نہیں

دل میں ہے کثرتِ غم پر بھی وہی سناٹا — گھر میں اک بھیڑ لگی ہے مگر آباد نہیں

نام معلوم ہو قاتل کا، مگر حشر کے دن — جاننے والے سے کہتا ہوں مجھے یاد نہیں

نالہ کش میں ہوں، تو سب صبر نہ سمجھے دنیا — اس کا رونا ہو کہ وہ غم سے مرے شاد نہیں

فقط آواز پہ موقوف ہو آبادیِ دہر — جس جگہ شہرِ خموشاں ہو وہ آباد نہیں

گلشنِ رخ پہ نظر کرتے ہی دل صید ہوا — میں تو سمجھا تھا کہ اس باغ میں صیاد نہیں

کھو گیا دل، کی صدا ہو اثرِ غارتِ ہوش — یہیں پہلو میں ہے موجود مگر یاد نہیں

ہم تو ہر ذرے سے ویسی صدا سنتے ہیں — لوگ ویرانے کو کہتے ہیں کہ آباد نہیں

شکلِ غم جا کے ترے پاس بگڑ جاتی ہے — تیرے دل تک جو پہنچ جائے وہ فریاد نہیں

عشق اک جوہرِ عالی ہے تو کم ملتا ہے — تیشہ و سنگ بہت ہیں مگر فرہاد نہیں

حشر تک بجھ نہیں سکتے مرے داغوں کے چراغ — دل میں وزن تو ہیں لیکن گزرِ باد نہیں

عمر گزری ہے سکھاتے ہوئے تم کو لیکن — بیوفائی کا مرے دل کو سبق یاد نہیں

کتنے بیہوش ہیں یہ نشۂ دنیا والے — میکدہ یوں نظر آتا ہے کہ آباد نہیں

کون ہے جس سے کروں غم کی شکایت **ثاقب**
میں تو کیا محفلِ عالم میں کوئی شاد نہیں

۱۰۔۱۱۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء

وہ میرے ہوں نہوں مجھے اس کا گلا نہیں — اُس دل کو اضطراب ہو جس کا خدا نہیں

معشوق جانیں جنکو یہ دعویٰ روا نہیں — ہم عاشقوں کی صف میں تو کوئی خدا نہیں

بیجرم ہو کے عمر گزاری عذاب میں — یہ بھی نہ کہہ سکا کہ مری کچھ خطا نہیں

کب چونکتے ہو خواب سے اے خفتگانِ خاک — میں جب پکارتا ہوں کوئی بولتا نہیں

شاید بدل دے راہِ عمل وہ خلاف جو — ہر ظلم پر کہوں گا وفا ہے جفا نہیں

کیا وعدۂ وصال سے سنبھلے گا دل مرا — مدت سے جانتا ہوں کہ میری دوا نہیں

دشمن اگر نہ خوش ہوں تو منظور ہے وہ موت — غیروں کے کام آئے وہ میری قضا نہیں

مرتے ہو اس جہاں میں جن آبادیوں پہ تم
اُن بستیوں میں نام وفا ہے، وفا نہیں

سنتا تھا سرفروشوں سے مملو ہے کوئے دوست
لیکن یہاں تو ایک بھی میرے سوا نہیں

آغوشِ شامِ ہجر ہیں پیدا ہوا ہوں میں
جس دن سے آنکھ کھولی ہے کچھ سوجھتا نہیں

شامِ وصال شاہدِ غم ایک بھی نہ تھا
تھی درد سے اُمید سو وہ بھی اُٹھا نہیں

دو دو گواہ حشر میں ہیں تیرے اُنکے ساتھ
میری وفا نہیں ہے کہ اُنکی جفا نہیں

ثاقب قصور وار ہے یہہ اضطرابِ دل
طولِ شبِ فراق کی کوئی خطا نہیں

۲۷ - دسمبر ۱۹۲۶ء

میں جاگتا ہوں جہاں سو رہا ہے غفلت میں
مرے ہی سر یہ مُصیبت پڑی محبت میں

اب اور اس سے سوا کیا اثر ہو نالوں کا
کہ فرق آگیا ظالم کے خوابِ راحت میں

جوابِ زخمِ جگر دے رہا ہے ہنس ہنس کر
وہی تو دل ہے کہ جو خوش رہے مصیبت میں

تمام عُمر ہوئی صرف اور پھر نہ گھٹے
کچھ اتنے حصّۂ غم آگئے تھے قسمت میں

ہر ایک شام شہیدوں کا حال روشن ہے
لہو ہے تیل کہاں ہے چراغِ تربت میں

جگہ رہی نہیں دل میں جو غم اُٹھائیگی
سما رہی ہے مصیبت مری مصیبت میں

وہ وقت ہے کہ ہے مشکل مزاج پرسیِ دوست ۔ جہاں کا کھویا ہوا دل ملا قیامت میں

اب اس اندھیرے کی حد ہے کہ جسکی دہشت سے ۔ چراغ و شمع اترتے نہیں ہیں تربت میں

جگا رہے ہو جنھیں اُن میں دم نہیں باقی ۔ تمھیں گماں ہے کہ سوتے ہیں خوابِ راحت میں

نظارۂ شبِ فرقت نہیں ہوا حاصل ۔ کہ سرمہ کش ہو مری شامِ چشمِ عبرت میں

لحد سیاہ ہے **ثاقب** کوئی چراغ نہیں

اور اُس پہ شام ہوئی ہے دیارِ غربت میں

دہم ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء

درد تو میرے دل میں ہے نالوں میں ہاں اثر نہیں ۔ بیخبری جو ہے اُدھر اس لئے کچھ خبر نہیں

کیوں کوئی آئے اس طرف سایہ نہیں ثمر نہیں ۔ میرا نہالِ آرزو خشک ہے بارور نہیں

طور کا سوز ختم ہے اب تو کوئی اثر نہیں ۔ تو یونہی جل کہ شمعِ دل تیرے لئے سحر نہیں

صبحِ ازل سے جذب ہے حسن میں عشق کا اثر ۔ میں تو اُدھر کا ہو گیا آپ ہیں جو اِدھر نہیں

طولِ شبِ فراق بس میں تو وداع ہو چلا ۔ نالوں نے اُٹھ کے دور تک دیکھ لیا سحر نہیں

زردیِ رُخ سے کیا غرض جینے پہ اعتراض ہے ۔ قابلِ دید ہے جو شے اس پہ کوئی نظر نہیں

منکرِ تہمتِ دلی کاش کہیں سے دیکھ لے ۔ راہ ہے اور مرے قدم ایک بھی ہمسفر نہیں

تیرہ سرائے دہر میں، خانۂ زیست لُٹ گیا — ایک طرف تو دل نہیں، ایک طرف جگر نہیں

وہ جو گلوں پہ ہر گھڑی رکھتے تھے سایہ دھوپ میں — اُڑ گئے یوں کہ باغ میں ایک بھی ان کا پر نہیں

بزم میں ہے مری طلب، وہ بھی بروئے عیش کی — ڈھونڈتے ہو تم جہاں، حیف کہ میں اُدھر نہیں

درد کا نام مٹ گیا، دل جو مرا فنا ہوا — نالے کو موت آ گئی، اور کوئی نوحہ گر نہیں

میں نہ سہی نگہ سہی، جانے دے پاسباں اسے — بزم میں ہے زمانہ بھر، ایک مری نظر نہیں

اب کہاں وقتِ نازِ حسن، آؤ لحد سے اُٹھ چلیں — حشر اسی کا نام ہے، میر تمہارا گھر نہیں

دیکھ گئے تھے وہ مجھے کچھ تو ہیں کھو چکا ضرور — جانِ حزیں تو ہی بتا، دل نہیں یا جگر نہیں

ایک ہی کارواں ہے، قافلۂ سرشکِ غم — دل کا سوائے عشقِ دوست کوئی بھی راہبر نہیں

رعبِ جمال ہے فقط، وجہِ سکوتِ اہلِ دہر — ورنہ جہاں میں کون ہے جس کو مری خبر نہیں

خانۂ قبر میں ترا دل سے ہیں لطف ہوں — میرے لئے کھلا ہو جو ایسا تو کوئی در نہیں

بازوئے آسماں تو رہ، قلبِ حزیں پہ بار ہیں — قید میں ہوں تو کاٹ دو، حاجتِ بال و پر نہیں

ثاقب اس انجمن میں تو ہرزہ سرا ہوا تو کیوں
جبکہ بجز کمالِ عیب، تجھ میں کوئی ہنر نہیں

۸- اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء

سچ ہے کہ خواب دیکھتا ہوں قید خانے میں
سناٹا میرے دل کی طرح ہے زمانے میں

دم گھٹ رہا ہے آپ سے آپ آشیانے میں
اچھی نہیں چمن کی ہوا اس زمانے میں

خونباریوں کا مجھکو صلہ مل گیا کہ آج
کچھ رنگ بڑھ گیا مرے دل کے فسانے میں

پہلے تو آہِ سرد سے آتا تھا دل کو چین
اب کیا کروں کہ آگ لگی ہے زمانے میں

دیکھی سوائے شامِ غلامی نہ صبحِ عیش
آزادیاں تمام ہوئیں قید خانے میں

کام آئیں دل کے بھی یہ تلوّن مزاجیاں
میرے بھی دن پھریں کبھی تیرے زمانے میں

گلچین و باغباں کی نظر ہے اسی طرف
کچھ میرے بعد بھی ہے مرے آشیانے میں

جس میں بھرا ہوا ہے مری زندگی کا حال
دنیا کو نیند آتی ہے اب اس فسانے میں

مدت ہوئی کہ موت نے آکر چھڑا دیا
اب کون ڈھونڈتا تھا مجھے قید خانے میں

کیوں میرے داغِ دل کی ہے دشمن ہوائے دہر
ایسے چراغ بجھ نہیں سکتے زمانے میں

جب میں نہیں تو باغ میں اس کا مقام کیا
اچھا ہوا کہ لگ گئی آگ آشیانے میں

اے قصہ گو سرِ بزم مری داستان چھیڑ
نیند آ چلی ہے انکو کسی کے فسانے میں

برسوں نہ سوئے بعد مرے ساکنانِ دہر
آوازِ نالہ گونج رہی تھی زمانے میں

صد چاک دل رہا نہ ہوا دامِ زلف سے
زلفیں نکل نکل گئیں آ کے شانے میں

کیا پڑھ رہے ہیں دور سے اصحابِ اقتدار — میری جبیں یہ ہے، کہ ترے آستانے میں

بس اے شبِ فراق، نہ دے ذکرِ غم کو طول — کیا اور کوئی رات نہ ہوگی زمانے میں

مشکل ہے ہر ایک حرف تھا، دلکش ہر اک بیان — کیوں بولتا کوئی مرا قصہ سنانے میں

جو کھو چکا ہوں عالمِ ہستی میں آکے میں — جھک جھک کے ڈھونڈتا ہوں اُسی کو زمانے میں

چپ چپ سے ہیں پاسبان بھی ہیں اور رات بھی — کوئی نہ کوئی محو ہے میرے فسانے میں

رنگِ ملال و عیش ہو ثاقبؔ کہ شام و صبح
وہ سب ہے میرے دل میں جو کچھ ہے زمانے میں

۱۵۔ جنوری ۱۹۳۱ء

ظرف کم ظرفی سے بھر سکتا نہیں — پانی چلّو میں ٹھہر سکتا نہیں

دل میں اتنی بھیڑ ارمانوں کی ہے — آپ کا ناوک گزر سکتا نہیں

ایک نالے رہ گئے تقدیر میں — اور کوئی کام کر سکتا نہیں

چل بسا زندانِ غم سے وہ مریض — جس کو تم کہتے تھے مر سکتا نہیں

دل نہ ہو بلبل کا جبتک چاک چاک — گل کا شیرازہ بکھر سکتا نہیں

ہیں ادھر آنسو، اُدھر تاثیرِ غم — میں دوراہے میں ٹھہر سکتا نہیں

پہرے بٹھلائے ہیں اُنکی نیند نے　　نالۂ دل بھی گزر سکتا نہیں
دیکھا جان اپنی جو دل کھو چکا　　کیوں اسے مارو جو مر سکتا نہیں
نبض ہو یا دل ہؤا اسکا کیا علاج　　ڈوبنے والا اُبھر سکتا نہیں

حشر ہے ثاقب کو دو جلدی جواب
اس سے زائد میں ٹھہر سکتا نہیں

۱۸۔ نومبر ۱۹۲۱ء

ملتا جو کوئی ٹکڑا اس چرخِ زبرجد میں　　پیوند لگا دیتا میں نفسِ مجرد میں
بیداریِ فرقت میں تھا رمزِ قیامت کا　　جاگا ہوں کہ نیند آئے تاریکیِ مرقد میں
اس دفترِ ہستی میں تعلیم بہت کم ہے　　دو حرف نظر آئے دیباچۂ ابجد میں
گو خاک کا پتلا ہوں لیکن کوئی کیا سمجھے　　میں بھی کوئی شی ہوں جو گرد و ہے مری کد میں
ہے ضبط کی فرمائش اس دل سے بہت بیجا　　یہ قلزمِ لا ساحل کس طرح رہے حد میں
پہلو میں نہیں دل تو دل سوز ہی آجاتا　　اک شمع تو جل جاتی تاریکیِ مرقد میں

نالوں سے یہ کہتا ہوں ہمت سے نہ دل ہاریں
تاروں نے جگہ کر لی اس لوحِ زمرد میں

۷۔ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء

چاٹتا ہوں ہونٹ خوش ہو کر کسی کی یاد میں
روتے روتے اب مزہ ملنے لگا فریاد میں

یہ اضافہ کس لئے قیدِ دلِ ناشاد میں
جب قفس میں ہوں تو پھر کیوں ہوں دلِ صیاد میں

زندگی سے تنگ بیٹھا ہوں چمن کی یاد میں
گم ہوا اک جائے نشیمن بھی دلِ صیاد میں

قید ہونے سے مرے گھر میں اجالا ہو گیا
شمعیں داغوں نے جلا دیں خانۂ صیاد میں

اپنا قصہ ذکرِ گل یادِ نشیمن کر کے میں
چٹکیاں لیتا رہا شب بھر دلِ صیاد میں

چاٹ کر میرا لہو تیزی میں ہے ضرب المثل
خون جوہر ہو گیا ہے خنجرِ فولاد میں

۱۹۔ نومبر سنہ ۱۹۳۱ء

شکر ہے بوئے وفا شامل ہے بوئے دوست میں
اُڑ رہی ہے خاکِ دل میری کوئے دوست میں

وائے قسمت کب دیا گوشِ سماعت نے جواب
کچھ مزہ ملنے لگا جب گفتگوئے دوست میں

نازشِ دیر و کلیسا جو اسی میں سے بڑھی
کوئے دشمن تک گیا میں جستجوئے دوست میں

گوہرِ یکدانۂ دل گھلتے گھلتے گھل گیا
غرق تھا مدت سے فکرِ آبروئے دوست میں

زندگی سے دشمنی ہے کیا کروں مجبور ہوں
موت ہی مجھ کو نظر آتی ہے کوئے دوست میں

دل کو رکھا ذکر میں مشغول جب تک دم رہا
زندگی ثاقبؔ بسر کی گفتگوئے دوست میں

۷۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء

چمن کا ذکر کیا اب تو خدا کو یاد کرتے ہیں
خوشی صیاد کو ہوتی ہے جب فریاد کرتے ہیں

نہ شرماؤ اگر ہم شکوۂ بیداد کرتے ہیں
محبت ہے تمھاری عادتو نکو یاد کرتے ہیں

ہماری داستانِ غم رلاتی ہے زمانے کو
وہ ہم ہیں جو زبانِ خیر سے فریاد کرتے ہیں

خدا آباد رکھے ہمصفیرانِ گلستاں کو
جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہمکو یاد کرتے ہیں

اسیرانِ قفس خود بھی بہت کچھ کہہ گزرتے ہیں
چمن کے تذکرے آپس میں جب صیاد کرتے ہیں

نہیں معلوم ہے کس حال میں ہیں باغِ عالم میں
قفس والے بھی مجھکو دیکھکر فریاد کرتے ہیں

خود انکا حسن میری داد خواہی آپ سے کرتا ہے
وہ آئینہ لئے ہیں اور مجھکو یاد کرتے ہیں

عدو صیاد و گلچیں کیوں ہے ہیں میرے نشیمن کے
یہ تنکے بھی ہیں اس قابل جنھیں برباد کرتے ہیں

لحد پر چلنے والے تھم کہ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے
زمیں رکھتی ہے منھ پر ہاتھ جب فریاد کرتے ہیں

وہ خوبانِ جہاں اٹھکو نسے جنکا حسن سینچا تھا
وہی بعدِ فنا مٹی مری برباد کرتے ہیں

سرِ گورِ غریباں کچھ نہ پوچھو حالِ دل ثاقبؔ
زمانہ جنکو بھولا ہے ہم انکو یاد کرتے ہیں

۲۶- جولائی ۱۹۰۹ء

سوائے شامِ غم کب اشکِ چشمِ تر نکلتے ہیں
اندھیرا ہر طرف ہوتا ہے جب اختر نکلتے ہیں

رگِ جاں میں جو ڈوبے تھے وہی نشتر نکلتے ہیں
مبارک اے قفس بلبل کے پہلے پر نکلتے ہیں

اٹھاؤ ہاتھ میں تلوار پھر ہم تم کو دکھلا دیں
لہو میں ڈوب کر اہلِ وفا کیونکر نکلتے ہیں

چھپانے سے کبھی چھپتے نہیں جوہر شرافت کے
جھکے ہوتے ہیں سر جب میان سے خنجر نکلتے ہیں

کہاں ہے میکدے میں آج دورِ جامِ جمشیدی
نہ اب وہ پینے والے ہیں نہ وہ ساغر نکلتے ہیں

۲۱- جولائی ۱۹۱۳ء

ڈال لی عادت کہ خونِ آرزو دیکھا کروں
کم نہوں یوں بھی تمنائیں تو پھر میں کیا کروں

یہ گزرتے جائیں میں اور انہیں دیکھا کروں
زندگی کے چند دن ہیں انکو گن کر کیا کروں

دردِ دل کی خواہشوں کو کس لئے پورا کروں
آپ دیکھے جائیں تو میں عمر بھر تڑپا کروں

کیا علاجِ شوق جب تابِ تجلی ہی نہو
وہ نقاب الٹیں تو لازم ہے کہ میں سجدا کروں

دل لبھاتا ہے مجھے دکھلا کے ربطِ حسن و عشق
مجھ سے خواہش ہے کہ اپنے آپکو رسوا کروں

چھوڑے جاتا ہے مجھے اے دل تو جلدی کس لئے
اتنی مہلت دے کہ کوئی اور دل پیدا کروں

خوابِ ہستی دیکھکر اُٹھا ہوں اب وقتِ سحر
اے جوانی شام تیری یاد کر کے کیا کروں

۲۱- ستمبر ۱۹۱۱ء

کون ان لاکھوں اداؤں میں مجھے پیاری نہیں
نام لوں کس کس کا، مجھکو ایک پیاری نہیں

آگ کتنی لے کے نکلا تھا مرا دودِ جگر
وہ فضا ہے کون جسمیں کوئی چنگاری نہیں

پاس سے کیوں دیکھتے ہیں دوست اے آزارِ دل
پوچھتے ہیں کیا، مجھے تو کوئی بیماری نہیں

ہاتھ رکھکر اک زرا دیکھو تپِ غم کا اثر
یہ تمہارا ہی جلایا دل ہے چنگاری نہیں

دل نے رگ رگ سے چھپا رکھا ہے رازِ عشق کو
جسکو کہدے نبض ایسی میری بیماری نہیں

قید ہو کر میں نے کھولی ہمصفیروں کی زبان
کس گلستاں میں مرا ذکرِ گرفتاری نہیں

۶- مئی ۱۹۱۲ء

کہوں کیونکر کہ میں کچھ بھول آیا ہوں نشیمن میں
مرا صیاد کہتا ہے کہ کیا رکھا ہے گلشن میں

تماشا سوزِ دل کا دیکھ جا کر صحنِ گلشن میں
قفس میں ہوں، مگر شعلے بھڑکتے ہیں نشیمن میں

وہ کانٹے جنکو چن لایا ہوں میں وادیِ وحشت سے
نکالوں گا اگر وسعت ہوئی صحرا کے دامن میں

غنیمت ہی قفس فکرِ رہائی کیا کریں ہمدم
نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہی گلشن میں

مرے دل کی لگی کب زندگی میں بجھنے والی تھی
دبا دی دوستوں نے مدتوں تک آگ مدفن میں

۱۹- نومبر ۱۳۱۹ء

نکالے لاکھ ہمکو آسماں ہم کب نکلتے ہیں
وہ دروازے نہیں باقی جہاں مطلب نکلتے ہیں

بتوں پر کوئی عاشق ہی کوئی جو ذہن پر مرتا ہے
صباح و شام یوں ہی سیکڑوں مذہب نکلتے ہیں

تماشا ہی شبِ فرقت میں کیا جسکے نظارے کو
زمیں پر میرے آنسو چرخ پر کوکب نکلتے ہیں

بہار آکے نکلی ہے ہزاروں بار گلشن سے
اسیرانِ بلا دیکھیں قفس سے کب نکلتے ہیں

۲۳- مارچ ۱۸۹۲ء

پھیلا ہی حسنِ عارضِ روشن نقاب میں
کیا کیا تڑپ رہی ہے تجلی حجاب میں

مجھ سے دلیلِ عشق جو پوچھے وہ بے وفا
دل سامنے نکال کے رکھدوں جواب میں

افراطِ میکشی نے کیا مجھکو جزوِ مے
ساقی نے میری روح کو کھینچا شراب میں

شمشیر و سر کی لاگ فقط میرے دم سے ہے
سارا ہوا کا کھیل ہی موج و حباب میں

۶- جنوری ۱۹۰۴ء

عبرتِ دہر ہو گیا جب سے چھپا مزار میں — خیرہ جگہ تو مل گئی دیدۂ اعتبار میں

توڑ رہا ہے باغباں پنکھڑیاں بہار میں — کوئی تو ہو فدائے گل ایک نہیں ہزار میں

محو ہوں یادِ چہرۂ شاہدِ گلعذار میں — اب یہ خزاں نصیب دل جا کے ملا بہار میں

اڑ گئی آخر انکی نیند بعد ہمارے سکرِ [?] غم — کان لگے ہیں شام سے نالونکے انتظار میں

اوج نہاد طبع کی مٹ کے بھی شان رہ گئی — مر کے ہیں [?] گئے سوئے آسماں ملکے اڑا غبار میں

میرے لباسِ کہنہ سے چھٹتی نہیں ہیں انکی آنکھ — شاید الجھ گئی نظر جامۂ تار تار میں

تم نے شبِ فراق میں دیکھی نہیں جو حالتیں — آج وہ آ کے دیکھ لو عالمِ احتضار میں

جذبِ شمیم زلف ہے دانہ دام سے سوا — سیکڑوں دل کھنچ آئے ہیں گیسوئے مشکبار میں

فیصلہ ہو ہی جائیگا چھٹنے دے بھیڑ حشر کی

ثاقبِ دل حزیں ہے آج تو بھی کسی شمار میں

۱۸- جنوری ۱۹۰۵ء

آئنہ ہے سرنوشتِ زندگی ہر ہاتھ میں — کھول کے مٹھی تو ہے لوحِ مقدر ہاتھ میں

تھی وفاداروں کے دم تک پرسشِ قدرِ جفا — پھینک دو اب کیا لئے بیٹھے ہو خنجر ہاتھ میں

انقلابِ دہر کی تصویریں کی اُوٹ ہیں ۔۔۔ غور کر کچھ خاک کے ذرّے اُٹھا کر ہاتھ میں

کام بن جاتے ہیں خود تقدیر سیدھی چاہیئے ۔۔۔ خاک بھی اکسیر ہو جاتی ہے اکثر ہاتھ میں

ہمتِ ساقی کا پیمانہ تھی چلو بھر شراب ۔۔۔ جی میں آیا تھا ٹپک دوں لیکے ساغر ہاتھ میں

ساتھ ہی کھنچتی ہیں تصویریں شہود و غیب کی ۔۔۔ انگلیوں پر نقش ہیں قسمت کے چکر ہاتھ میں

پیشِ داور اس طرح ثاقب کھڑا ہوں روزِ حشر

داغِ حسرت دل میں ہیں عصیاں کا دفتر ہاتھ میں

۸۔ نومبر ۱۹۰۹ء

نیند آئے مجھے کیونکر اپنے ہی ستاتے ہیں ۔۔۔ جب آنکھ جھپکتی ہے آنسو نکل آتے ہیں

یہ بازپسیں ساعت کیا مجھکو مبارک ہے ۔۔۔ میں دہر سے جاتا ہوں سنتا ہوں وہ آتے ہیں

سوزِ غمِ الفت کو دیتے ہیں جگہ دل میں ۔۔۔ ہم خرمنِ ہستی میں خود آگ لگاتے ہیں

دشمن کو بھی جیتے جی اللہ نہ دکھلائے ۔۔۔ وہ خوابِ پریشاں جو مجھکو نظر آتے ہیں

گلچیں کو بگڑنے دے، ہاں تو نہ بگڑ جانا

اے بختِ نشیمن ہم گلشن میں بناتے ہیں

۲۔ فروری ۱۹۱۴ء

کیونکر نظر اُٹھاؤں اُدھر بزمِ عام میں — مُنھ دیکھتا ہوں یاس سے ساقی کا جام میں

پہلے یہ بے رخی تھی نہ یہ بے مروتی — اب نقص آ گیا مرے ماہِ تمام میں

طفلی سے چلتے چلتے آ گئے پیری کی راہ پر — ہم ہیں ہی جو تھک گئے دو تین گام میں

۱۰ - اکتوبر ۱۹۲۲ء

پھول سا قلب ہوا صبر کی سل رکھتا ہوں — جب سے کہتا ہے زمانہ کہ میں دل رکھتا ہوں

حشر میں میرے بلانے سے غرض کیا یارب — پاس کچھ بھی نہیں اک روئے خجل رکھتا ہوں

درد اور عشق کا کیا کام مرے پاس کس میں — نہ جگر رکھتا ہوں پہلو میں نہ دل رکھتا ہوں

دہم ماہ اکتوبر ۱۹۲۴ء

دلِ عزلت گزیں کو تذکرے فرمائے جاتے ہیں — مجھے دکھلا کے اب معنیِ غم سمجھائے جاتے ہیں

نہ ہوتا ہے نہ ہوگا کچھ علاجِ دل تسلی سے — جو مر جانے پہ مرتے ہیں وہ کیوں بہلائے جاتے ہیں

نصیحت صبر کی واعظ نہ کر ہم بیقرار دل کو — سفینے ہیں تلاطم میں تو کیوں ٹھہرائے جاتے ہیں

کہاں ہے آئینہ جو صورتِ صفا دیکھوں — ہر ایک دل میں غبار آ گیا تو کیا دیکھوں

ستارے گن کے بھی اب رات کٹ نہیں سکتی — یہ دل کہاں کہ جو کوئی ترے سوا دیکھوں

غموں کی بھیڑ مجھے وجہِ انتشار نہیں — خوش اس سے ہوں کہ زمانے کا اعتبار نہیں

غمِ فراق کی روداد مختصر یہ ہے — کہ بے قرار ہوں اور دل پہ اختیار نہیں

۱۸- مارچ ۱۹۳۲ء

میں کہہ رہا ہوں باغ ہو گل ہوں بہار ہو — تقدیر کہہ رہی ہے کہ غم کے شکار ہو

شک اپنے اضطراب میں ہو طولِ ہجر سے — شب کو ہو کیوں قرار جو دل بیقرار ہو

کیا گزری شامِ ہجر، نہ پوچھو کہ ہے عبث — کہنے کو سب کہوں میں اگر اعتبار ہو

عاشق کو ضبط و صبر سے کیا کام ہو مگر — کھل جائے اُنکا حال اگر اختیار ہو

دھرا رہا ہے قصۂ ظلم و ستم کو دل — ہوں منتظر کہ حشر میں سیری پکار ہو

میں تشنہ کامِ مرگ ہوں قاتل ادھر بھی دیکھ

تلوار چاہتا ہوں، مگر آبدار ہو

۲۴- اکتوبر ۱۹۲۵ء

یا مرگِ خدا داد ہو، یا انکی نظر ہو — عالم کی بھری بزم میں کوئی تو ادھر ہو

لے آئی انھیں ساتھ مری نزع کی ہچکی — ڈوبی ہوئی آواز میں اتنا تو اثر ہو

بن جاتے ہیں لاعلم بہانے کے لئے دوست
وہ بےخبری میں ہے جسے میری خبر ہو

باقی ہے شبِ ہجر کہ آنسو ہے مژہ پر
ڈوبے یہ ستارہ تو زمانے میں سحر ہو

محشر میں کروں دعویٔ خوں اپنا تم پر
لازم ہے جدھر تم ہو مرا دل بھی ادھر ہو

شمشیرِ قضا کھینچ کہ جھکی ہے مری گردن
فیصل ہے یہ قصہ جو نہ سودا ہو نہ سر ہو

چاہا تھا کہ بڑھ جاؤں رہِ عشق سے آگے
منزل ہی نہ چلنے دے تو کس طرح سفر ہو

طولِ شبِ فرقت کو نہ چاہوں تو کروں کیا
گردوں مری سنتا تو میں کہتا کہ سحر ہو

ویرانہ جہاں دیکھ لیا راہِ سفر میں
بڑھتا ہوں اسی سمت کہ شاید مرا گھر ہو

منہ دیکھ کے میرا نہ سمجھنا کہ میں خوش ہوں
دل کھو کے ہنسی آئے جو میرا سا جگر ہو

زنجیر کا شکوہ نہیں اے تنگیٔ زنداں
میں چل کے دکھا دوں جو کوئی راہ گزر ہو

شاکی ہیں فقط ہجر کی رات تو تنہا نہیں ہوں
غم ایک طرح کا ہے وہ شب ہو کہ سحر ہو

جو دل سے نکلتا ہے وہ پروردۂ دل ہے
غیرت نہ ہو نالے میں تو ممنونِ اثر ہو

ویرانہ ہی اچھا ہے کہ ویراں تو نہ ہوگا
گھر ہو، تو نہ دیوار ہو اس گھر میں نہ در ہو

اٹھ بیٹھ سے میری شبِ غم ہٹ نہیں سکتی
تکئے سے اٹھائیں وہ سر اپنا تو سحر ہو

میں نزع میں ہوں راہ مسافر کی نہ روکو
آجاؤ کہ آنا ہے، مرا زادِ سفر ہو

سنتا ہوں مرادو ں کی صفیں گرد ہیں اُنکے
محفل تو بہت خوب ہے دیکھوں جو گزر ہو

ثاقبؔ سخنِ خوب بجز مشق نہیں ہے
یہ عیب جو بڑھ جائے زیادہ تو ہنر ہو

۲۱- نومبر ۱۹۲۶ء

جو دل ہے خوب وہ مقبولِ عام ہو کہ نہ ہو
نگیں میں عیب نہیں ہے تو نام ہو کہ نہ ہو

حجاب پڑ نہیں سکتا نگاہِ الفت پر
سخن طراز ہیں آنکھیں کلام ہو کہ نہ ہو

بنا لیا ہے نشیمن محبتِ گل میں
یہ اپنی سعی تھی دیکھوں مقام ہو کہ نہ ہو

عوض جفا کے جفا دل سے ہو نہیں سکتی
حرامِ عشق تو ہے وہ حرام ہو کہ نہ ہو

یہ قیدِ الفتِ گل کم نہیں ہے اے صیاد
پھنسا ہوا ہوں ازل سے میں دام ہو کہ نہ ہو

قریب ہو کے نہ سننا دلیلِ الفت ہے
پکارے جاؤ کوئی ہم کلام ہو کہ نہ ہو

نہیں ہے فاصلہ مابینِ انحطاط و عروج
غروبِ مہر ضروری ہے بام ہو کہ نہ ہو

جہاں میں آتے ہی چھیڑا ہے دل نے قصۂ غم
مگر طویل ہے دیکھوں تمام ہو کہ نہ ہو

کماں لئے ہوئے ہے قسمتِ قدر انداز
ہدف ہوں میں فلکِ نیل فام ہو کہ نہ ہو

ابھی سے کہتا ہوں محتاجِ عفو ہوں سن لے
کہ تیرے سامنے تابِ کلام ہو کہ نہ ہو

یہ زندگی تو غموں میں گزر گئی ثاقب
مری بلا سے کوئی شاد کام ہو کہ نہ ہو

۲۰۔ نومبر ۱۹۱۳ء

تسلّی دو نہ مجھکو اہلِ فریاد رہنے دو — مرے بیت الحزن کو کچھ دنوں آباد رہنے دو

چمن والو یہ تنکے آشیاں کے چھپ نہیں سکتے — نشانی کچھ تو بہرِ خانماں برباد رہنے دو

یونہی ہر دستبردِ چرخ سے اُجڑی ہوئی منزل — مرے پہلو میں تم میرا دلِ ناشاد رہنے دو

اسیرو وہ تمنائیں مرادیں تا قفس لائیں — نصیبوں کی شکایت شکوۂ صیاد رہنے دو

ہمارا امتحاں ہوگا جب اُسکا وقت آئیگا — زباں ہے نرم ذکرِ خنجرِ فولاد رہنے دو

جو میرے دل میں بھرتے ہو محبت اُس سے جلتی ہے — یہی نیر آج بہرِ سینۂ حسّاد رہنے دو

میں دشمن کا نہیں دشمن اثر جو کچھ ہو مجھپر ہو — مرے نالو مرے صیاد کو آباد رہنے دو

نہ رو کو مجھکو رونے سے اگر ہنسنے نہیں دیتے — یہ دل تمکو مبارک ہاں لبِ فریاد رہنے دو

حریفانِ وفا سے ہم سمجھ لینگے قیامت میں — اُنھیں آباد رہنے دو ہمیں برباد رہنے دو

نشاں جویانِ وحدت کو قرار آیا نہ آئیگا — رہا گردش میں اب تک سبحۂ زہاد رہنے دو

عبث جھلا رہا ہے باغباں گلچیں کے کہنے سے — کہا کس نے کہ میرا آشیاں آباد رہنے دو

میں چھپ کے پیتا ہوں اپنے دوستوں کو دعویٰ خوں سے ۔۔۔ گواہی کو تم اپنا خنجرِ فولاد رہنے دو
دلِ گم گشتہ یوں گمنام ہو جائیگا کچھ دن میں ۔۔۔ کہ تم خود یاد رکھو اور نہ مجھکو یاد رہنے دو

نہ کرنا دوستو جلدی علاجِ زخمِ پنہاں میں
محبّت کا سبق ثاقب کو کچھ دن یاد رہنے دو

۹۔ اگست ۱۹۱۸ء

تیرگی چھپ جائیگی خود صبح ظاہر بھی تو ہو ۔۔۔ اشک تھم جائینگے لیکن رات آخر بھی تو ہو
منزلِ وحدت یہ جانا کام ہر اک کا نہیں ۔۔۔ راہ اچھی ہے مگر کوئی مسافر بھی تو ہو
لبِ دوا زخموں کا بھر جانا کوئی مشکل نہیں ۔۔۔ زخمیوں کی محفلِ ظالم میں خاطر بھی تو ہو
لیٹنا آساں ہے آنکھیں بند کرنا سہل ہے ۔۔۔ میرے سو جانے پہ راضی چشمِ ساحر بھی تو ہو
سو طرح کے درد ہیں لاکھوں مرض پھر اس سے کیا ۔۔۔ میں کہوں سب کچھ مگر جب کوئی ماہر بھی تو ہو
بندہ و معبود کے مجرم ہو دیکھا چاہیئے ۔۔۔ تم فقط ظالم نہیں سنتا ہوں کافر بھی تو ہو
اُن پہ دعویٰ قتل کا محشر میں آساں ہے مگر ۔۔۔ بادفا کا خون ہے خنجر پہ ظاہر بھی تو ہو

ہو نہیں سکتی ہیں پوری خواہشیں احباب کی
شعر ثاقب کیا کہے پہلے وہ شاعر بھی تو ہو

۳- فروری ۱۹۲۲ء

جو نیم جاں ہو قاتل کیوں اُس پہ مہرباں ہو
پہلو ہے کب سے خالی دل ہو تو امتحاں ہو

کچھ شکوۂ فلک ہو کچھ شکرِ امتحاں ہو
لب پر رہے تبسّم دل میں غمِ نہاں ہو

عشقِ بہار کیوں ہے جب کہہ چکا مقدر
کُنجِ قفس میں ہم ہوں گلشن میں آشیاں ہو

میرا شبابِ غم بھی ہے دیکھنے کے قابل
عبرت گہِ جہاں میں کیا اک تمھیں جواں ہو

حد اپنی دوڑ کی تھی قاتل کے سنگِ در تک
دیکھیں لہو رگوں کا اب کس طرف رواں ہو

شبہائے غم کو یوں جھیلا ہے دل کہ بعد تیرے
راتوں کٹے دامنوں پر تیری ہی داستاں ہو

چشم و جبیں میں باہم کیوں ہے نزاعِ بیجا
مطلب نیاز سے ہے در ہو کہ آستاں ہو

دنیا میں کیا ٹھکانا ہم سے بلاکشوں کا
منزل وہی ہے اپنی آفت کا گھر جہاں ہو

دل کی رگوں کی صورت تنکے بھی جل رہے ہیں
وقفِ ستم ہیں دونوں ہیں دل کہ آشیاں ہو

ناز و نیاز اپنی اپنی جگہ ہیں دونوں
دیکھو کہ میں کہاں ہوں سمجھو کہ تم کہاں ہو

دل کو وداع کر لے جانِ حزیں تو نکلے
اے میرے اشکِ حسرت پہلے تو ہی رواں ہو

ثاقب مری خوشی سے یادِ خدا ہے توأم
جب آئے وصل کی شب تو صبح کی اذاں ہو

۵- نومبر ۱۹۲۲ء

یوں جھیلتا ہوں ہجر کی شبہائے تار کو — ہر صبح یاد کرتا ہوں شامِ مزار کو

سنتا ہے کون شکوۂ پائے فگار کو — گردوں نے راستے میں جگہ دی ہے خار کو

نازاں نہیں تیرگی پہ ہے شامِ مزار کو — لاؤں کہاں سے ہجر کی شبہائے تار کو

در سیکڑوں قفس میں ہیں پھر بھی اسیر ہوں — کیسا مکاں ملا ہے غریب الدیار کو

گرنے لگی ہے قیمتِ دل آنسوؤں کے ساتھ — کس نے الٹ دیا ورقِ اعتبار کو

جب زلف دیکھ لی ہے تو چہرہ بھی دیکھ لوں — گردش نہیں ہے کیا مرے لیل و نہار کو

آوازۂ چمن کی امید اور میرے بعد — چپ کر دیا فلک نے زبانِ بہار کو

خود آسماں کو نقشِ وفا سے ہے دشمنی — تم کیوں مٹا رہے ہو نشانِ مزار کو

ثاقبؔ یہ شعر جن میں جھلک خونِ دل کی ہے
دکھلا رہے ہیں کیفیتِ قلبِ زار کو

۲۴- نومبر ۱۹۲۳ء

رسم دنیا ہے کوئی خوش ہو کوئی ناشاد ہو — جب اجڑ جائے نشیمن تو قفس آباد ہو

بانٹ لیں دنیا کو ہم تم مل کے عیش و رنج میں — ایک جانب قہقہے ہوں اک طرف فریاد ہو

کٹ گئیں عمریں قفس میں شوقِ آزادی ہو کیا   اب خدا ہی ہے جو گلشن آج تک آباد ہو

مٹ چکے یہ دل تو پھر پوچھیں مزاجِ حسن دوست   صید ہی نابود ہو تو کس لئے صیاد ہو

خانماں بربادِ الفت اور تمنائے وصال   جسمیں دل رہتا ہے وہ گھر کس طرح آباد ہو

داستانیں ہیں مگر ثاقب جہانمیں دل کہاں
یہ کوئی قصہ نہیں تھا جو کسی کو یاد ہو

۲۷- مارچ ۱۹۱۴ء

آوارۂ صد غربت کر دیگا وطن مجھکو   صیاد کے پر دسے میں ماریگا چمن مجھکو

الفت کے علاقونکو غم سہنے سے کیا مطلب   مذکورِ نشیمن کیا بھولا ہے چمن مجھکو

دیوانگیِ دل میں ہر سمت اسیری ہے   ہر جادۂ عالم ہے آفت کی رسن مجھکو

کچھ ساتھ نباہے جو ملتا ہے وہ مشکل سے   دی جان تو ہاتھ آیا دو گز کا کفن مجھکو

اک عمر ہوئی ثاقب صحرا میں بسر پھر بھی
کہتا ہے ہر اک ذرّہ آوارہ وطن مجھکو

۸- مئی ۱۹۱۳ء

آنکھ کھولے ہوں مقدر کچھ مجھے دکھلائے تو   جان کو روکوں کہانتک آنیوالا آئے تو

جب میں جانوں تو مرا دل ہی مرے کام آئے تو　　وہ نہیں تو ہی سہی کوئی مجھے بہلائے تو

اک علامت عشق کی ہی زخم میں کہتا نہیں　　دیکھئے دل کو ذرا لیکن جو دیکھا جائے تو

قید ہے تقدیر میں وہ گھر ہو میرا یا قفس　　طائرِ دل مضطرب ہے جال وہ پھیلائے تو

۴- فروری ۱۹۲۲ء

سیکڑوں نالے کروں لیکن نتیجا بھی تو ہو　　یاد دلواؤں کسے جب کوئی بھولا بھی تو ہو

چشم پوشی کو زمانہ جانتا ہے خیرگی　　آنکھ میں کھولوں مگر برقِ تجلی بھی تو ہو

دل ابھی پہلو میں تھا کس نے لیا میں کیا کہوں　　نام کس کا لوں کسی کو میں نے دیکھا بھی تو ہو

دغا ہے حسن میں گو ہیں مگر حسین کہو　　قمر میں داغ ہے اس بت کو مہ جبین کہو

بلا سے دشمنِ گیسو پڑے ہوئے ہیں تو ہوں　　جو مارِ دل ہیں انھیں مارِ آستین کہو

۹- مارچ ۱۹۱۳ء

کیوں نہ اچھا ہو جہاں میں خنجر و آہو کا ساتھ　　جب خدا نے کر دیا ہو دیدہ و ابرو کا ساتھ

ہے شبِ تاریک رونق چاند کی ہوتی نہیں　　حسنِ خوباں کو ہے زیبا چہرہ و گیسو کا ساتھ

بوستانِ دہر میں کیا خوش ہوں ہوئے وصل سے　　ایک ہی دم کیلئے ہے پھول اور خوشبو کا ساتھ

بزمِ خوباں کے نظارے گر نو ہی ہوتے رہے — چھوٹ جائیگا کسی دن دل کا اور پہلو کا ساتھ
کشتگانِ ہجر اس انداز پر راضی نہیں — کیوں انھیں دکھلائیے شمشیر اور بازو کا ساتھ
دل کی جنبش اٹھ ہوئی گردن جھکا کر رو دیئے — ساتھ غم کا ہی زمانے میں فقط قابو کا ساتھ
شامِ فرقت خوب ہی اس وصلِ دردانگیز سے — خوش ہوئے ہمیں یسا کہاں آنکھونکا اور آنسو کا ساتھ
دوستیِ غم پہ مرتا ہوں خدا آگاہ ہے — دے نہیں سکتا یہ دل دنیائے عشرت جو کا ساتھ
دور ہی سے دیکھ لیتے ہم خرامِ ناز کو — گرد غبار رہ نہ دیتا اس قدر دل جو کا ساتھ
یہ زبانِ مادری **ثاقب** سے چھٹ سکتی نہیں
باتوں باتوں میں دیا کرتا ہے وہ اردو کا ساتھ

۶ - دسمبر ۱۹۲۵ء

دل تو میرا ہی مگر رہتے ہیں آزادی کے ساتھ — وہ حوادث دشمنی ہی جنکو آبادی کے ساتھ
کون میری بات پوچھے کون ہو میرا شریک — جب میں رہتا ہوں ہمیشہ خانہ بربادی کے ساتھ
منحصر ہو ظرف کی وسعت پہ انعام کریم — سیل رہتی ہی ہمیشہ دامنِ وادی کے ساتھ
گھر تو ہی دیگا تو ہو گا ورنہ میرا گھر کہاں — میں سفر میں جا رہا ہوں خانہ بربادی کے ساتھ
ہے اسیری بد مگر شکلِ اسیری بد نہیں — کیا مضر ہی قمریونکو طوق آزادی کے ساتھ

خانۂ صیاد میں جشنِ اسیری تھا مرا
آگیا میں بھی کہ غم پیدا ہے شادی کے ساتھ

کتنے اونچے جائینگے آوازہ ہائے حسن و عشق
ہے جہاں فریاد میں ایک ایک فریادی کے ساتھ

میں طریقِ عشق خود چلکر بتاتا ہوں مگر
ہوتی آئی ہو کہ چلتے ہی نہیں ہادی کے ساتھ

سوزِ دل پر بھی تو **ثاقب** ناز کا موقع نہیں
یہ بھی مٹ جائیگا اکدن خاکی و بادی کے ساتھ

۲۷- دسمبر ۱۸۹۴ء

رخ و زلف کا ہوں فسانہ خواں یہی مشغلہ یہی کام ہے
مجھے دن کا چین عذابِ جاں مجھے شب کی نیند حرام ہے

ترے انتظار میں ہے تعب یہ مریضِ ہجر ہے جاں بلب
کہیں آبھی وعدہ خلاف اب کہ یہاں تو کام تمام ہے

کہوں حسرتوں کا ہجوم کیا درِ دل تک آکے وہ بے وفا
مجھے یہ سُنا کے پلٹ گیا کہ یہاں تو مجمعِ عام ہے

نہ وہ مہر و ماہ کی تابشیں نہ وہ اختروں کی نمایشیں
نہ وہ آسماں کی ہیں گردشیں نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

مرے دم پہ عشق میں ہے بنی تجھے وعظ وپند کی ہے پڑی
مرے ناصحا تجھے بندگی تری دوستی کو سلام ہے

نہ ستائیں وہ نہ ستائیں وہ ادھر آئیں وہ ادھر آئیں وہ
نہ سہی مجھی کو بلائیں وہ یہ خیالِ باطل وخام ہے

تپِ غم سے ہوتی ہے اب مفر کہ طبیبِ مرگ ہی چارہ گر
مرا قصّہ آج ہے مختصر مری داستان تمام ہے

ہے کہاں وہ ساقیِ تندخو کہ ہے میکدے میں یہ ہا یو ہو
کہیں سرنگوں ہیں خم وسبو کہیں شیشہ ہے کہیں جام ہے

نہیں دل کو فکر یہ بے سبب گیا دن کہاں ہوئی رات کب
مجھے روزِ وصل یہ ہے عجب ابھی صبح تھی ابھی شام ہے

نہ وہ میہمانِ حریمِ دل نہ خیال اس کا مقیمِ دل
ہوئی قطع رسمِ قدیمِ دل نہ پیام ہے نہ سلام ہے

کہیں حسن والوں کے درمیاں یہ غزل سُنی تو کہا کہ ہاں
یہ ہے نظمِ **ثاقبِ** خوش بیاں یہ اُسی کا طرزِ کلام ہے

۱۳- جنوری ۱۸۸۶ء

مستِ مئے الفت ہوں تری عشوہ گری سے
ساقی مجھے مطلب نہیں شیشے کی پری سے

وہ تیر فگن دل جو بنا تا ہے نشانہ
ارمان لپٹ جاتے ہیں ناوک کی سری سے

آہوں سے ہے مقصود فقط جی کا بہلنا
ورنہ مجھے ایذا نہیں دردِ جگری سے

ثاقب کو ہے یا رب تری رحمت کا سہارا
اندیشۂ فردا نہیں دامن کی تری سے

۱۶- اکتوبر ۱۸۸۶ء

دشمنِ جاں پر مرا دل ہی تو ہے
سامنے قاتل کے قائل ہی تو ہے

تنگ ہیں نالوں سے وہ میں ضبط سے
کیا کروں ہر طرح مشکل ہی تو ہے

دل میں ہیں وہ میں ہوں محوِ جستجو
کیا ہے یہ تحصیلِ حاصل ہی تو ہے

کوئے رسوائی کہاں ثاقب کہاں
ہاں طبیعت ہی تو ہے دل ہی تو ہے۔

۴- مئی ۱۸۸۹ء

مجھ میں اب جان کہاں عشق میں مرنے کے لئے
سانس چلتی ہے فقط دم ترا بھرنے کے لئے

دل میں اک جوش غموں کا تھا کدھر آئے آپ
کس نے چھینٹے دیئے دریا میں اُترنے کے لئے

صاف کہدیجئے وعدہ ہی کیا تھا کس نے
عذر کیا چاہیئے جھوٹوں کو مکرنے کے لئے

اے پریشانیِ دل تیرے اثر کے قربان
کُھل پڑے اُنکے گندھے بال بکھرنیکے لیئے

مول لے مفت کا جھگڑا کوئی دیوانہ ہے
اُنکے سر کون چڑھے دل سے اُترنیکے لیئے

ساتھ ہی وعدۂ فردا کے قیامت آئی
کچھ بھی مہلت نہ ملی اُنکو مکرنے کے لیئے

۱۷ - مئی ۱۸۹۱ء

یہ آہ و فغاں کیوں ہو دلِ زار کے آگے
کہتے ہیں کہ روتے نہیں بیمار کے آگے

پھر موت کا ہے سامنا اللہ بچائے
پھر دل لئے جاتا ہے ستمگار کے آگے

بکنے کے لئے آپ نہ بازار میں آئے
بھجوا دیا یوسف کو خریدار کے آگے

منعم کو مبارک یہ نقیب اور جلودار
اللہ ہی اللہ ہے نادار کے آگے

ضد کرتے ہو کیوں تیر نہ ہو جیئنگے ہدف تک
ارمان ہزار دل میں ہیں دلِ زار کے آگے

سرگرمِ سخن ہوں دلِ وارفتہ سے اسطرح
جیسے کوئی باتیں کرے دیوار کے آگے

۲۲ - مارچ ۱۸۹۳ء

آپ اُدھر وعدہ کی شب سوتے رہے
ہم اِدھر اشکوں سے منہ دھوتے رہے

صبح کو رازِ گل و شبنم کھلا — ہنسنے والے رات بھر روتے رہے

لوٹنے والے ہماری نیند کے — رات بھر کس چین سے سوتے رہے

کاوشِ غم کی حقیقت کیا کہیں — خون تھوکا یا لہو روتے رہے

کھل گیا ثاقب دمِ آخر کہ ہم
زندگی کا ہر نفس کھوتے رہے

۱۴ جنوری ۱۸۹۵ء

تیز مجھ پر ہی ستمگر کی چھری ہوتی ہے — کیجیے کیا کہ لگی دل کی بری ہوتی ہے

منع کرتا ہے تڑپنے سے قفس میں صیاد — نالے کرتا ہوں تو گردن پہ چھری ہوتی ہے

ہر بدی کرتی ہے انسان کو دنیا میں ہلاک — سمِ قاتل ہے وہ عادت جو بری ہوتی ہے

اہلِ دل عشق میں دم مار سکیں کیا ممکن — رگِ جاں کے لئے ہر سانس چھری ہوتی ہے

بیٹھ کیوں بادہ کشوں میں کہ ہوں گم ہوش و حواس — صحبتِ اہلِ خرابات بری ہوتی ہے

۴ مئی ۱۹۰۱ء

مانا یہ کہ ساون کی گھٹا اور ہی کچھ ہے — سب کچھ ہے مگر زلف سا اور ہی کچھ ہے

آہوں کو مری غیر کی آہیں نہ سمجھنا — جو آگ لئے ہو وہ ہوا اور ہی کچھ ہے

بڑھ اتنا کہ ٹھہرا ہوا دل انکا تڑپ جائے ‏ اے دردِ محبت یہ دوا اور ہی کچھ ہے

زینت ہوئے قاتل کے لئے ظلم کے اُسلوب ‏ بیرحم کے ہاتھوں کی حنا اور ہی کچھ ہے

غیروں کو دکھایا مرا دل کھول کے مٹھی ‏ مجھسے دمِ پرسش یہ کہا اور ہی کچھ ہے

نازاں ہے عروسِ گلِ تر سر کو جھکائے ‏ تم کان میں کہدو کہ حیا اور ہی کچھ ہے

۹- فروری ۱۹۰۲ء

روتے روتے شام ہوئی ہے کب تک اشک بہائیں گی

بہتے بہتے تھمتے ہیں دریا آنکھیں بھی تھم جائیں گی

جاتے جاتے جسم سے جانیں اہلِ وفا کی جائیں گی

آتے آتے دل لینے کی تمکو راہیں آئیں گی

اُلٹی اُلٹی باتیں اُن کی مقصد تک پہونچائیں گی

سیدھی سیدھی راہیں مجھکو باتوں میں مل جائیں گی

چونکو چونکو صبحِ پیری غفلتِ خوابِ جوانی سے

اُٹھو اُٹھو سونے والو راتیں پھر بھی آئیں گی

آئیں آئیں ساری بلائیں صدقے ہوں پر انکے ‏ مٹتے مٹتے مٹ گئے ہم اب کسکی خاک اُڑائینگی

لاتے لاتے کام میں الفت لائے گی زنجیروں کو
بڑھتے بڑھتے زلفیں تیری طوقِ کمر ہو جائیں گی

ہوتے ہوتے ہوگا ظالم واقف رسم الفت سے
رفتہ رفتہ میری وفائیں راہ پر اس کو لائیں گی

آؤ آؤ قتل کے بعد اب دفن میں جلدی کاہے کی
بیٹھو بیٹھو دم تو لے لو لاشیں بھی اُٹھ جائیں گی

بھرتے بھرتے آہوں کو دل خالی کر ہی ڈالیں گے
جلتی جلتی زنداں سے اب گرم ہوائیں آئیں گی

بیٹھے بیٹھے دیکھے جاؤ اُلجھن وقتِ آخر کی
چپکے چپکے میری سانسیں کچھ تم کو سمجھائیں گی

ٹکرا ٹکرا کر یہ ناوک خاک سے مجھ تک آئیں گے
نیچی نیچی اُن کی نگاہیں میرا دل پا جائیں گی

بگڑے بگڑے تیور اُن کے عقدہ لاحل ہوں لیکن
بنتے بنتے اُن کی زلفیں یہ گتھی سلجھائیں گی

سنتے سنتے نالے میرے دل اُن کا بھر آیا ہے
اَللہ اَللہ آج تو آہیں دل میں بہت اترائیں گی

رکھدے رکھدے تیر و کماں کو چھد گئے دل مشتاقوں کے
نازک نازک باہیں تیری او قاتل دکھ جائیں گی

مخفی مخفی ظلم کئے تھے پردہ اُٹھا محشر نے
کیسے کیسے راز کھلے ہیں اب آنکھیں شرمائیں گی

اُبلے اُبلے شیشے مے کے بزم میں ساقی لایا ہے
اُلٹے اُلٹے جاموں سے اب آنکھیں منہ برسائیں گی

مانو مانو کہنا مانو آئیں گے وہ خود دل تھامے
ثاقبؔ ثاقبؔ تیری دعائیں کھنچ کے انکو لائنگی

۱۲-اگست سنہ ۱۹۰۳ء

نہ مطلب سننے والوں سے نہ پروا رنگ محفل کی
جہاں بیٹھے وہیں ہم نے کہانی چھیڑ دی دل کی

نظر آتا ہے وحشت خانۂ زنداں میں سناٹا
کہاں ہیں آج کڑیاں جھیلنے والے سلاسل کی

ہجوم نامرادی ہر طرف، ہر کیا قدم اٹھیں
مری مایوسیوں نے راہ کھوٹی کی ہر منزل کی

ازل سے ہر کا ہر خشک و تر رہینِ حوادث ہے — موافق ہیں دریا کی ہوائیں اور نہ ساحل کی

۲۴ - اکتوبر ۱۹۰۲ء

میکدے میں ہیں سنبھالے ہوئے مے نوش مجھے — آج کیا پی ہے کہ آتا ہی نہیں ہوش مجھے

دل کہاں آئے جو دریا کی طرح جوش مجھے — کر دیا خاطرِ افسردہ نے خاموش مجھے

داد و بیداد کا قصہ ہوا فیصل یعنی — ہو گیا سب ترے آتے ہی فراموش مجھے

عاشقِ زار ہوں مرتا بھی ہوں جیتا بھی ہوں — خلشِ غم ہے کبھی نیش کبھی نوش مجھے

غش کے عالم میں پڑا رہتا ہوں اللہ اللہ — آپ جاتے ہیں تو آتا ہی نہیں ہوش مجھے

سرِ شوریدہ کو خنجر کے حوالے کر دوں — آج اس بار سے ہونا ہے سبکدوش مجھے

سوزِ الفت کا مرقع ہے ترے پیشِ نظر — دیکھ ہر رنگ میں جلتے ہوئے خاموش مجھے

تم بھی جاتی ہوئی دنیا کا تماشا دیکھو — اہلِ ماتم لئے جاتے ہیں سرِ دوش مجھے

جان حاضر ہے لئے جاؤ امانت اپنی — پھر خدا جانے رہے یا نہ رہے ہوش مجھے

جیتے جی موت کا خلعت نہ پہن لوں ثاقب

یوں بھی آخر کبھی ہونا ہے کفن پوش مجھے

۶- دسمبر ۱۹۰۳ء

دم کشاکش میں ہے اندیشے گرانجانی سے ‏ سانس لینا مجھے دشوار ہے آسانی سے

اسقدر گھر مرا آباد ہے ویرانی سے ‏ دیکھتا ہوں در و دیوار کو حیرانی سے

جان دی میں نے تہِ تیغ اس آسانی سے ‏ خود بھی دیکھا کیا قاتل مجھے حیرانی سے

راز کھولا مرا اس الفتِ جسم و جاں نے ‏ رنگ چہرے کا اڑا صدمۂ روحانی سے

مرمٹا یوں کہ مری خاک بھی ڈھونڈے نہ ملی ‏ کچھ کھلا حال تو اوراقِ پریشانی سے

میں نے اظہارِ محبت میں جو کھولی تھی زبان ‏ پا گئے وہ مجھے اندازِ ثنا خوانی سے

خود مرے کیف کی تصویر بنے اہلِ نشاط ‏ ہے تماشا تری محفل مری حیرانی سے

بہت اچھی تھی مری بادیہ گردی اے قیس ‏ دو گھڑی جی تو بہلتا تھا پریشانی سے

حیرتِ عشق میں چپ ہوں نہ شکایت ہے نہ شکر ‏ نہ مذمت سے ہے مطلب نہ ثنا خوانی سے

گو تری بزم میں کی میں نے بہت خودداری ‏ دل جگہ چھوڑ چلا جنبشِ روحانی سے

طول اس جھگڑے میں کھینچا کہ ہوا دیوانہ عشق ‏ زلف الجھے نہ مرے دل کی پریشانی سے

دلِ ثاقب تو وہی خاک کا پتلا تھا مگر

لے اڑا عشق ترا عالمِ روحانی سے

۲۔ نومبر سنہ ۱۹۰۳ء

غش بھی آیا مری پرسش کو قضا بھی آئی
بے مروت تجھے کچھ شرم و حیا بھی آئی

موسمِ حسن تو تھا فصلِ جفا بھی آئی
ساتھ ہی ساتھ جوانی کی ادا بھی آئی

دم کا آنکھوں میں اٹکنا بھی مبارک نہ ہوا
وقت کی بات تم آئے تو قضا بھی آئی

میں شبِ وصل یہ سمجھا کہ سحر بھی کچھ ہے
وہ جو آئے تو موذن کی صدا بھی آئی

اُن مریضوں کی عیادت کو وہ اب نکلے ہیں
موت جا کر جنھیں مٹی میں ملا بھی آئی

کر دیا سوزِ دروں نے مجھے شمعِ سرِ بزم
بن گئی دم پہ اگر پاس ہوا بھی آئی

کان یوں اُنکے بھرے ہیں مری فریادوں نے
نالے سمجھے جو کوئی اور صدا بھی آئی

پھر بھی **ثاقب** نہ اڑی طالعِ خفتہ کی نیند
آہ جا کر مری گردوں کو ہلا بھی آئی

۱۷-دسمبر ۱۹۰۷ء

دل کو محوِ لذتِ آزار رہنے دیجئے
خوش رہے جب حال میں بیمار رہنے دیجئے

کچھ دفا کچھ ظلم کے آثار رہنے دیجئے
خون میں ڈوبی ہوئی تلوار رہنے دیجئے

مجھکو یہ غم کیوں اسے بیمار رہنے دیجئے
دل کو یہ ضد عشق کا آزار رہنے دیجئے

آپ اپنی شہرتیں سنئے زبانِ دہر سے
داستانِ یوسفِ بازار رہنے دیجئے

ہے رخِ رنگیں کی زینت پردۂ شرم و حیا
توڑیئے کیوں باغ کی دیوار رہنے دیجئے

دل کے سودے میں یہ طرزِ بحث بے مطلب نہیں
ہے مری سمجھی ہوئی تکرار رہنے دیجئے

یادگارِ عشق ہے یہ صحبتِ تیغ و گلو
اور دم بھر حلق پر تلوار رہنے دیجئے

آج اُس کوچہ میں دل کہتا ہے مجھ سے بار بار
آنکھ سوئے روزنِ دیوار رہنے دیجئے

روح و جاں میرے لئے دونوں ہیں دل ہی کیا جگر
آپ جسکو جانیے بیکار رہنے دیجئے

شرم آئی کس لئے آئینہ رکھا کس لئے
جسکو دیکھا اس سے آنکھیں چار رہنے دیجئے

دل میں رہکر کیجیئے گا کیوں علاجِ زخمِ تیر
آپ ہیں تو روزنِ دیوار رہنے دیجئے

یہ دلِ پُر داغ خود اپنے لہو سے ہے نہال
ابر بالائے سر گلزار رہنے دیجئے

آپ یوسف ہیں تو باندھی ہے کمر کیوں قتل پر
کوئی دم تو رونقِ بازار رہنے دیجئے

گھٹ کے مر جائیں گے ہم قیدی جو روزن ہوں گے بند
راہ بھر آہِ آتشبار رہنے دیجئے

کیوں مرے سینے سے اُٹھیے پھیر کر مجھ پر چھری
ناتواں ہے دل مگر یہ بار رہنے دیجئے

رو دیئے جبتک لہو رلوائے **ثاقب** دردِ دل
آنکھ کو جبتک رہے خونبار رہنے دیجئے

۶- مارچ ۱۹۰۵ء

ہے یہ آئینہ محفل سے اور تو آئے | کوئی تو ہو جو کبھی دل کے روبرو آئے

مرے لہو سے اگر ہو کے سرخرو آئے | ملو تو برگِ حنا میں وفا کی بو آئے

وہ آنسوؤں کی صفائی سے یہ گماں ہے عبث | دل و جگر میں رہا کیا ہے جو لہو آئے

شبِ وصال بھی تا صبح مطمئن نہ رہا | ابھی تھی رات کہ پیغامِ آرزو آئے

بیانِ برقِ تجلّی چھڑا ہو اب سرِ طور | عجب نہیں مرے دل کی بھی گفتگو آئے

وصال و ہجر میں چھپتا ہے دل کا حال کہیں | تجھے تو پیاس سوا ہو جلے تو بو آئے

جو مے کے دینے میں پیرِ مغاں کو تھا انکار | دلوں کو توڑنے کیوں شیشہ و سبو آئے

عجب اثر ہے دمِ ذبح انکی آنکھ میں خون | کٹیں کہاں کی رگیں اور کہاں لہو آئے

کیا سوال تو اس در سے یہ صدا آئی | اُسے جواب ہے جو لیکے آرزو آئے

جہاں میں ہیں سبکبار کب شگفتہ مزاج | چمن سے کے پھول لئے بارِ رنگ و بو آئے

مری زبان کو کاٹا سمجھتا ہے صیاد | نکال لے کہ نہ یہ ہو نہ گفتگو آئے

جھٹک رہی ہو مرا خون اپنے دامن سے | تمہاری تیغ ہے پھر کیا دغا کی بو آئے

مدد دے اتنی تڑپنے میں انقلابِ جہاں | جو میرے دل میں نہاں ہو وہ روبرو آئے

بڑھا بڑھا کے مرا دل لگا دیئے تلوار | جگہ جفا کی سوا ہو اگر نمو آئے

اودھ کے پھولوں سے دل میں بسا ہوا **ثاقب**
جہاں رہوں میں وہیں بو سے لکھنؤ آئے

۲۳- نومبر سنہ ۱۹۰۹ء

وقتِ رخصت کس قدر تاثیر میرے دل کی ہے
جو نگاہِ یاس بسمل کی وہی قاتل کی ہے

مجھ میں جو کچھ ہے وہ اپنا ہی سمجھ لے شامِ غم
جان رہنے دے امانت یہ مرے قاتل کی ہے

مجھکو آئینِ وفا نے دل نہ سکھلا وقتِ ذبح
لے نہ تڑپونگا اگر مرضی یہی قاتل کی ہے

کس لئے مرتا ہوں تجھے کچھ علم ہے اے زندگی
موت کی جو شکل ہے صورت وہی قاتل کی ہے

اک نہ اک مہماں ہے میرے پاس دل ہو یا جگر
میں نہ سمجھا آجتک کس پر نظر قاتل کی ہے

۱۵- نومبر سنہ ۱۹۱۱ء

قفس کے پاس دل تھامے ہوئے صیاد بیٹھا ہے
اسیرِ غم خدا جانے تری آواز میں کیا ہے

بتوں تک خیر تھی اب دل تجلی پر بھی آیا ہے
کہاں تک جال پھیلائے ہوئے میری تمنا ہے

شبِ وصلت میں بھی اک ہجر کا انداز پیدا ہے
ادھر میں ہوں ادھر وہ ہیں حیا حائل ہے پردا ہے

گرے پڑتے ہیں میکش بے پئے یہ کیا تماشا ہے
وہ گردش ہو رہی ہے چشمِ ساقی کو کہ توبا ہے

تڑپتا ہوں شبِ فرقت میں وہ آئیں تو سمجھا دوں
کوئی یہ کہکے لے آئے چلو دیکھیں تماشا ہے

فروغِ حسن آنکھوں میں ہی بھر چھپنے سے کیا حاصل — زرا سی اوٹ باقی ہے جو حائل ہے نہ پردا ہے

نہ ہوتا کچھ اثر دل پر محبت کا تو بہتر تھا — جسے بیمار سمجھے ہو وہ مر جائے تمہیں اچھا ہے

قفس کی تیلیاں اچھی ہیں تنکوں سے نشیمن کے — یہ سب کچھ ہے مگر صیاد دل پر کیا اجارا ہے

نظر کر غور سے آئینۂ اسرارِ ہستی پر — جسے تو زندگی سمجھا ہے وہ دھوکا ہی دھوکا ہے

یہ طولِ عمر کی حد ہے کہ تیرا ساتھ دیتا ہوں — شبِ فرقت مجھے ہمراہ لیتی جا تو اچھا ہے

وہ دل تھامے ہیں میری زندگانی جنکو دوبھر تھی — جنازہ دردمند کا کوچۂ قاتل سے اُٹھا ہے

مری ناکامیوں پر ہنس رہے ہو دل میں سوچو تو — مقابل آسماں ہے جسکا وہ کیسی تمنا ہے

قفس مجھکو نشیمن ہو گیا خوفِ اسیری سے — کوئی تنکا کھڑکتا ہے تو پہروں دل دھڑکتا ہے

بڑھا دیتا ہے ہمت عشق، اربابِ تمنا کی — برا ہے حالِ دل لیکن کہے جاتا ہوں اچھا ہے

صدائیں دیکے ہمنے ایک دنیا آزما دیکھی — یہی سنتے چلے آئے بڑھو آگے یہاں کیا ہے

مراد آنے کا رستہ دیکھتی ہے زندگی ثاقب

وہ دل رکھتا ہوں میں پہلو میں جو عینِ تمنا ہے

۴- اپریل ۱۹۱۳ء

یہ اک معمورۂ غم ہے لہو کا ذکر ہی کیا ہے — مرا دل چاک کر دیکھو تمنا ہی تمنا ہے

سپیدی آئی اُن بالوں پہ جن پر تیرا سایا ہے | شبِ فرقت مرا سر اب ترے دامن کا دھبا ہے

خبر لیلیٰ کو کیا پہلو میں کون اُٹھ اُٹھ کے گرتا ہے | یہ تصویرِ دلِ مجنوں ہے یا محمل کا پردا ہے

تمھاری یاد میں خوش ہوں کہ رو دیتی ہیں یہ آنکھیں | زہے خونِ جگر جو رات دن صرفِ تمنا ہے

حسد کی آگ یہ ہے اے تجلی دیکھ لے مڑ کر | غش آیا ہے جو موسیٰ کو تو کوہِ طور جلتا ہے

قفس اور آشیاں کا فرق اے صیاد سُن مجھ سے | یہ تیری دستکاری ہے اُسے میں نے بنایا ہے

خرابِ بادۂ الفت ہے مجھ سا کون اے ساقی | سوا ہے کیفِ مستی اور پھر مے کا تقاضا ہے

مرا یہ زرد چہرہ دیکھ رکھ آئینہ ہاتھوں سے | جو میری شکل ہے ظالم وہی تیرا بھی نقشا ہے

وہ ساکت ہیں صدا ڈوبی ہوئی ہے کہنے والے کی | یہ ذکرِ غیر کیسا ہو نہ ہو میرا ہی قصّا ہے

زمانے کی بھری محفل کی آبادی مٹانے کو | بہت کچھ حسن نے اس آفتِ جاں کو سنوارا ہے

نزاعِ خواب و بیداری وہ فیصل کر نہیں سکتے | مقابل میرے نالوں سے جوانی کا تقاضا ہے

فراغت ہے جنھیں رونے سے وہ بھی سو نہیں سکتے | شبِ فرقت کی سرحد پر مرے نالوں کا پہرا ہے

زمانے میں ہے انکی شوخیِ رفتار سے ہلچل | تعجب ہے کہ کیوں بیٹھا ہوا نقشِ کفِ پا ہے

سوادِ شامِ غم پر کیوں دیئے دیتا ہے جان اپنی | دلِ ناداں سیاہی پھیل لینے دے ابھی کیا ہے

یہ دل کی راز داری ہے کہ زورِ ناتوانی ہے | دھواں اُٹھتا نہیں ہے چند اک مدت سی جلتا ہے

پتا اس یوسفِ گم گشتہ کا اب تک نہیں ملتا
مگر احباب کہتے ہیں کہ **ثاقب** کا دل آیا ہے

۲۰- ستمبر سنہ ۱۹۱۱ء

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

آیئے حالِ دلِ مجروح سنیئے، دیکھئے
کیا کہا زخموں نے کیوں ٹانکے صدا دینے لگے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

سننے والے رو دیئے سنکر مریضِ غم کا حال
دیکھنے والے ترس کھا کر دعا دینے لگے

جز زمینِ کوے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

آئینہ ہو جائے میرا عشق اُنکے حسن کا
کیا مزہ ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

سینۂ سوزاں میں **ثاقب** گھٹ رہا ہے وہ دھواں
اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

۲۱- اپریل سنہ ۱۹۱۲ء

بیتابیِ دل دیکھکے تڑپا ہے جگر بھی — ہاں ہاے قدر انداز کوئی تیر ادھر بھی

تم دیکھ لو چھپکر مجھے ہو گی نہ خبر بھی — وہ زخم ہے دل میں جو اُدھر بھی ہے ادھر بھی

میری شبِ غم کیوں ہے زمانے سے نرالی — دنیا ہے یہاں شام بھی ہوتی ہے سحر بھی

دل ہو گیا مجروح کماں اب نہ اُٹھاؤ — تھم جاؤ اسی تیر پہ مرتا ہے جگر بھی

صیاد سے باتیں کروں یا ذکرِ نشیمن — شق ہو کہیں دل کہ اُدھر بھی ہے ادھر بھی

اندیشۂ فرقت سے پریشاں نہ ہو اے دل — دو ایک گھڑی جھیل نکل جائیگا ڈر بھی

یارب یہ سکت دل کی صدا میں کہاں تھی — نالوں میں کچھ آواز ملاتا ہے جگر بھی

اے آتشِ غم تو نے کسی کو نہیں چھوڑا — اک داغ لئے آتی ہے عالم میں سحر بھی

جیب دیکھکے خوش دل نہ سمجھ اہلِ جہاں کو — ظالم ترے کردار سے دیتی ہے خبر بھی

لشکر بھی وہی بھیڑ ہے پہلو میں غموں کی — دل کھو کے میں سمجھا کہ کوئی شے ہے جگر بھی

برباد نکر عشق میں آبادیِ غم کو — جی جائے تمنا ترے مرنے سے تو مر بھی

گو رازِ تجلّی تھا نہاں پردۂ غش میں — ہم دور سے دیکھا کئے کیا شے ہے خبر بھی

تنہا ہے دعا شب وہ ڈرانی ہے کہ توبہ — بیٹھا ہے کسی امن کے گوشے میں اثر بھی

چین اب کسی کروٹ مجھے آتا نہیں اے دل — لے آگیا ظالم تری باتوں میں جگر بھی

گلشن کیطرف منہ کئے بیٹھا ہوں قفس میں — شاید کوئی دمساز نکل آئے ادھر بھی

اے جان تبا تجھکو کروں کس کے حوالے — تلوار بھی گردن پہ ہر قاتل کی نظر بھی

پہلو کوئی آسایشِ دل کا نہیں **ثاقب**

تنہائیِ فرقت تو اُدھر بھی ہے اِدھر بھی

۱۵- اپریل ۱۹۱۲ء

آئینۂ عبرت ہے مرا دل بھی جگر بھی — اک درد کی تصویر اُدھر بھی ہے ادھر بھی

کیا تم سے شکایت مجھے قسمت سے گلہ ہے — پھرتا ہے مقدر تو پلٹتی ہے نظر بھی

اس کو بھی نکال اے دلِ پرداغ کے گلچیں — کانٹا ہے مرے پہلوئے خالی میں جگر بھی

بس نالۂ دل بس، مجھے اُمید نہیں ہے — منہ دیکھنے والوں میں ہی ظالم کے اثر بھی

ملنے سے بھی اُنکے نہوئی دل کو تسلی — وصلت کی مسرت بھی ہے صبح کا ڈر بھی

تھامے ہیں کلیجا وہ مرے دل کو دکھا کے — اک تیر کی تاثیر ادھر بھی ہے اُدھر بھی

ہوش اُڑتے ہیں گم گشتگیِ اہلِ عدم سے — اس دشتِ سیہ روز میں عنقا ہے خبر بھی

بسکہ ترے ہاتھوں کی حنا جب سے ہوا دل — اک خون کا چھلّو نظر آتا ہے جگر بھی

ٹکڑے تھا کلیجا مرا خود جورِ فلک سے — پہلو سے گئی چھان کے دل اُنکی نظر بھی

تنہائیِ فرقت میں کوئی پاس نہ ٹھہرا — رخصت ہوا آخر کو دعاؤں سے اثر بھی

ہر خوف سے پہلو کا بچانا نہیں اچھا — اے امن طلب حشر میں کام آئیگا ڈر بھی

کیا زخمِ دل امید رکھے اس سے کہ جس نے — دیکھا نہ کبھی چاکِ گریبانِ سحر بھی

روداد ہے کیا شہرِ خموشاں کی الٰہی — اس باب میں خاموش ہیں اربابِ خبر بھی

تصویر بنا دیجئے مجھکو کسی صورت — لے جائیے پہلو سے مرا دل بھی جگر بھی

سد حادثۂ دہر کی ٹوٹی نہ اجل سے — جاتی نہیں اُن تک مرے مرنے کی خبر بھی

یہ حکمِ محبّت ہے کہ دل اس پہ فدا ہے
ثاقب جسے دیکھا نہ کبھی ایک نظر بھی

۲۰۔ جنوری ۱۹۱۵ء

وہی الفت ہے جسکو نشتر زنی کا کام آتا ہے — لہو دیتی ہے دل کی رگ جو تیرا نام آتا ہے

قفس کے راستے پر خود دلِ ناکام آتا ہے — ادھر کو پاؤں اٹھتے ہیں جدھر سے دام آتا ہے

شبِ غم آگئی جلنے کا پھر پیغام آتا ہے — لباسِ آتشیں پہنے چراغِ شام آتا ہے

یہ کتنی دور بیٹھا ہوں میں آخر بزمِ ساقی میں — ہزاروں ہاتھ پر دم لیکے مجھ تک جام آتا ہے

بلا سے ہو گیا خالی مرا پہلو تو ہونے دو — وہی دل کام کا ہے جو کسی کے کام آتا ہے

تمنا تھی کہ میں تنہا رہوں بزمِ محبت میں
زبانِ دہر پر لیکن اُسی کا نام آتا ہے

خمارِ مے کو روکے ہوں نہیں ساقی کی پروا کیا
جما ہی لوں تو کھنچکر آپ مجھ تک جام آتا ہے

شبِ غم ہی تو ہو اے دل نہ گھبرا طولِ محنت سے
ہمیشہ آفتوں کے بھیس میں آرام آتا ہے

مرے ظلمت کدے میں بھی کبھی جلوہ دکھا اپنا
سنا ہی تجھکو جلنا اے چراغِ شام آتا ہے

ترے رُخ نے اسیرِ حلقۂ گیسو کیا مجھکو
یہ کیا معلوم تھا پھولوں میں چھپکر دام آتا ہے

فنا ہو جائے دل تو کل کی منزل آج ہی طے ہو
مرے آگے ابھی سے عشق کا انجام آتا ہے

یہ شوقِ دیدِ قاتل ہی تمنائے شہادت میں
رگِ گردن میں کھنچکر خونِ ہفت اندام آتا ہے

بھلا ساقی سے کیا مانگوں کہ میکش راہ روکے ہیں
نہ جاتی ہی صدا اس تک نہ مجھ تک جام آتا ہے

تمھارے سامنے سوزِ دلی کیا زور دکھلائے
سحر کی آنکھ سے چھپکر چراغِ شام آتا ہے

محبت میں اگر جیتا ہوں تو خود ننگِ ہستی ہوں
جو مرتا ہوں تو اس ظالم کے سر الزام آتا ہے

شکایت ظلمِ خنجر کی نہیں غم ہی تو اتنا ہے
زبانِ غیر سے کیوں موت کا پیغام آتا ہے

شبِ غم خون ہو کر دل تو بہہ نکلا ہی آنکھوں سے
رہا بس اک جگر وہ دیکھئے کس کام آتا ہے

ادھر اتری گلے سے اور اُدھر اُٹھا دھواں **ثاقب**
یہ کیسی آگ لے کر میکشوں تک جام آتا ہے

۴- نومبر ۱۹۱۳ء

تیغ کے ہمراہ میرا دل کفِ قاتل میں ہے — موت ہی آسان لیکن جان کس مشکل میں ہے

ذکر کیوں رازِ محبت کا بھری محفل میں ہے — کس لئے پوچھے کوئی جو کچھ ہی میرے دل میں ہے

مجھکو بارِ دوش سر بھی الفتِ قاتل میں ہے — بس وہی میری تمنا ہی جو اُسکے دل میں ہے

جتنی عالم میں ہے بیچینی وہ میرے دل میں ہے — یا الٰہی کونسا معشوق اس محمل میں ہے

وصل و فرقت کی نزاعیں ہو چکیں طے وقتِ ذبح — ایک جھگڑا جسم و جاں کا آخری منزل میں ہے

بعد میرے کیا ہوئی وہ دلفریبی حسن کی — شام ہی سے آج سناٹا تری محفل میں ہے

موت پر راضی نہیں ہوتی حیاتِ مستعار — فطرتی جھگڑا ازل ہی سے حق و باطل میں ہے

عاقبت بینی سے شوقِ دل کا بس چلتا نہیں — اک قدم ہی راہ میں تو اک قدم منزل میں ہے

ہاتھ میں رنگِ حنا ہو اور نہ پھیلے رازِ عشق — ناخنوں پر آ گیا ہو وہ جو تیرے دل میں ہے

غم سے محبوبِ جہاں ہوں میں تو اسکا کیا عجب — شمع جلتی ہو مگر جب دیکھئے محفل میں ہے

گو ٹھہر سکتے نہیں دم بھر گرفتارانِ عشق — پھر بھی آبادی غضب کی کوچۂ قاتل میں ہے

راحتیں بھی صورتِ ایذا میں ہیں تقدیر سے — شام آفت کی طرح سایہ مری منزل میں ہے

سامنے آتے ہی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا — قیس اتنا دیکھ تو لیتا کہ کیا محمل میں ہے

کس قدر دشوار ہیں اہلِ عدم کے راستے   یا وہ جس منزل میں کھاتا تھا اسی منزل میں ہے

کچھ نظر آتا نہیں مجھکو بتا اے سوزِ غم   جل رہی ہے شمع محفل میں کہ میرے دل میں ہے

سو دعائیں اک صدا میں دیتا ہے کوئی   شاید ارمانوں کا اک جھرمٹ دلِ سائل میں ہے

مجھ سے آگے آچکا ہے طالعِ بد کا اثر   پہلے ہی سے ذرش کا نشونکا مری منزل میں ہے

میں ہوں یا دل ہو چراغِ داغ ہو یا شمع ہو   جلنے والا اک نہ اک ہر دم تری محفل میں ہے

راہِ الفت میں دھرا کیا ہے بھٹکنے کے سوا   دیکھنا دل کو کہ پھر پھر کر اسی منزل میں ہے

دمبدم آواز دیتی ہے خدنگِ ناز کو   خون کی اک بوند جو باقی ہمارے دل میں ہے

ایک طوفانِ بلا امڈا ہے ثاقب دور تک

سر اٹھائے ہے وہ کانٹا جو مری منزل میں ہے

۶-اپریل ۱۹۱۵ء

ہر آہِ نزع میں دلِ حسرت مآل کی   اک داستاں ہے عمرِ دو روزہ کے حال کی

کب سے ہے غم خبر نہیں کچھ ماہ و سال کی   گنتا ہوں ایک عمر سے گھڑیاں ملال کی

سب کچھ ہے تیرے ساتھ خبر میرے حال کی   یا داستانِ عشق کی ہے یا جمال کی

اپنا سا زور کر کے تھکے منعمانِ دہر   مٹھی نہ کھل سکی مرے دستِ سوال کی

الزامِ قید سب ہوسِ زندگی پہ ہے — صیاد کی نہ کوئی خطا ہو نہ جال کی

اتنا بدل دیا تھا مرا رنگ ہجر نے — منہ دیکھتی رہیں مرا آئینِ وصال کی

سنیئے کہ جاگ جاگ کے برسوں کیا ہے یاد — یہ داستانِ غم نہیں خوابِ خیال کی

ہاں پائے حرص روک کے تاروں کے سر کو دیکھ — کشتی زمیں میں ڈوبتی جاتی ہے مال کی

جس دل میں زخم تھے وہ لہو ہو کے بہہ گیا — اچھا ہوا خلش تو مٹی اندمال کی

اوراقِ شامِ غم شبِ فرقت سے جا ملے — آخر کتاب ختم ہوئی میرے حال کی

کیوں آؤ دور ہی سے سنو میری سرگذشت — تمکو خدا دکھائے نہ صورت ملال کی

یادِ مریض ایک مرض ہے خدا بچائے — بھولے سے پوچھیئے نہ خبر میرے حال کی

کچھ آگے بڑھ چلے ہیں شفیعانِ روزِ حشر — تاثیر تو ضرور رہی انفعال کی

اترے ہوئے ہیں قافلۂ ہستی و عدم
ثاقب عجب وسیع ہے منزل خیال کی

۹ - اپریل ۱۹۱۵ء

لب پر ہے مُہرِ عشقِ مصیبت مآل کی — کس منہ سے دل کریگا شکایت جمال کی

اک کیفِ بیخودی میں کٹی شبِ وصال کی — اچھا ہوا خبر نہ ہوئی اپنے حال کی

حیران ہوں کدھر سے بلا آئی جال کی — دھوکا دیا زمیں نے کہ گردوں نے چال کی

سر گشتگانِ عشق کو منزل سے کیا غرض — گرد اُٹھ کے بیٹھتی نہیں رنج و ملال کی

داغِ چمن کے ساتھ ہزاروں ہی زخم ہیں — دل میرا چھان ڈالا ہی چادر نے جال کی

ہر قطرہ خونِ دل کا ہی قاتل سے نوردار — یارب دراز عمر ہو روزِ سوال کی

جز رنج و غم کچھ اور نہ دیکھا تمام عمر — راحت بھی تھی مگر وہی خواب و خیال کی

ٹھوکر سے خاک میں بھی ملا دو تو خوب ہی — مٹی نہ ہو خراب دلِ پائمال کی

کیونکر متاعِ ہوش لُٹی کچھ خبر نہیں — میں نے تو صبح و شام بہت دیکھ بھال کی

بند آنکھ کر کے بیٹھ کہ پہلو میں دل رہے — عالم نظر فریب ہی دنیا ہے جال کی

طے کر رہا ہوں کب سے تجھے اے شبِ فراق — اب کتنی دور رہ گئیں راتیں وصال کی

سجدے میں جاکے سر کو اُٹھانا پڑا مجھے — رحمت نے بات رکھ لی مرے انفعال کی

بھر جائینگے کبھی نہ کبھی خاکِ قبر سے — زخموں کو احتیاج نہیں اندمال کی

ثاقب عذابِ غم سے عجب گو مگو میں ہوں
یارائے ضبط ہے نہ زباں عرضِ حال کی

۱۲-اپریل ۱۹۱۵ء

غم دوسروں کا ہی نہ خبر اپنے حال کی | دنیا نئی ہی جوشِ جنوں میں خیال کی

میں اور صبح، ہے یہہ تمنا محال کی | جتنی مری حیات شب اتنے ہی سال کی

ہمت شکن جہاں میں جفا ہے جمال کی | ہوتے ہی عشق پڑ گئی عادت سوال کی

زخمِ گلو سے ابروئے قاتل نے چال کی | دل تک شگاف دیکھئے پھوٹ اس ہلال کی

اچھے نصیب تھے کہ گلستانِ دہر میں | دو دن کی زندگی بھی غموں نے وبال کی

سنکر سوالِ وصل وہ چیں بر جبیں ہوئے | نکلی خوشی کی بات میں صورت ملال کی

برسوں سے صاف کرتا ہوں اشکوں سے لوحِ دل | تصویر چاہتا ہوں رخِ بے مثال کی

خواہانِ دید ہوں مگر آگے ہے برقِ طور | مشکل میں ڈالدیگی سہولت سوال کی

ہاتھوں سے دل گیا تو مگر کیا فریب تھا | سمجھا نہ میں کہ چشمِ فسونگر نے چال کی

کھلتی نہیں حیات میں بے منتِ اجل | بے لاگ بندشیں تری زلفوں کے جال کی

آؤ تو ہم دکھائیں تمھیں اک نیا جہان | آباد ہے خیال میں دنیا مثال کی

بدلا مزاجِ دہر مٹا دل، تھکے طبیب | حالت وہی رہی مرضِ لازوال کی

کس سنگدل کا در ہے کہ ملتا نہیں جواب | ٹکرا کے پھر رہی ہیں صدائیں سوال کی

ہر رگ لہو اگلتی ہے منہ اپنا کھول کر | زخم ایک ہو تو فکر کروں اندمال کی

ہے کونسا یہ صید کہ دم توڑتا ہی یوں   صیاد ڈھونڈتی ہیں رگیں تیرے جال کی

پہونچا دیا کلام کو ثاقب نے عرش پر
تقلید کر کے میر سے صاحب کمال کی

۷- اپریل ۱۹۱۹ء

کھنچا دل مردمک کے روبرو معلوم ہوتا ہے   بجائے اشک آنکھوں میں لہو معلوم ہوتا ہے

رلایا در پہ تیرے مجھکو شغل جبہہ سائی نے   یہ کیسا تھا تیمم جو وضو معلوم ہوتا ہے

حنا کے دیکھنے والے تو محشر میں نہیں ملتے   ترے ہاتھوں میں میرا ہی لہو معلوم ہوتا ہے

یہ ماہ و مہر سمجھا ہی جبیں و دل جنھیں واعظ   مجھے اک جام مے اور اک سبو معلوم ہوتا ہے

چراغ عقل بھی گل ہو شب غم کی سیاہی سے   نہ میں معلوم ہوتا ہوں نہ تو معلوم ہوتا ہے

شب فرقت کی آفت وصل میں منھ سے نہیں دیتی   وہی انداز میرے روبرو معلوم ہوتا ہے

یہ کتنے زخم تھے گھٹنے پہ جنکو داغ کہتے ہیں   ہر اک جا دامن دل پر رفو معلوم ہوتا ہے

بلائے عشق کی ذلت میں رونا ترک ہو کیونکر   یہی پانی تو میری آبرو معلوم ہوتا ہے

۲۲- اکتوبر ۱۹۱۳ء

ڈر گیا ہوں اسقدر ہجراں کی شام تار سے   بند کر لیتا ہوں آنکھیں سایۂ دیوار سے

دعویِ منصور پر اتنا تحیر چھا گیا
اس درازی پر نہ نکلا کچھ زبانِ دار سے

آج اکیلا ہوں یونہی کرتا رہا نالے اگر
ایک دن آواز نکلے گی درو دیوار سے

بادیہ پیمائیوں نے اور بھی رسوا کیا
دامنِ دل سو جگہ نکلا زبانِ خار سے

اک دلِ صد چاک ہو وابستہ ہر موئے لعت
کون شانہ مل سکا زلفوں کے ہر ہر تار سے

شب کو زنداں میں مرا سر پھوڑنا اچھا ہوا
آج کچھ کچھ روشنی آنے لگی دیوار سے

ہو کے قیدی سو نہیں سکتا اسیرِ زنجیرِ غم
آنکھ کھل جاتی ہے کڑیوں کی بہم تکرار سے

عشق کو حسنِ حقیقی کا پتا ملتا نہیں
جب سے یہ دوکان اُٹھی ہے مصر کے بازار سے

عالمِ وحدت میں دل تھا سائلِ یاس و امید
در کو دیکھا جب آئی کچھ صدا دیوار سے

اک نہ اک امیدِ بیجا سر بچاتی ہے مرا
دل سبک ہونے نہیں دیتا مجھے اس بار سے

آج سنتے ہیں وہی قبروں پہ آ کر رو گئے
کل جو کہتے تھے کہ یہ تعویذ ہیں بیکار سے

طولِ فرقت سے ہوئے میرے مرض و صلت نصیب
ربط پیدا ہو گیا آزار کو آزار سے

اب نہ آنا برہمیِ انجمن کا وقت ہے
حسرتیں ملنے کو آئی ہیں دلِ بیمار سے

آئینہ بنکر نہ جا اے دل مقابل حسن کے
تو کوئی سودا نہیں لیلوں جیسے بازار سے

ایک شب میں کس قدر جلکر ہوا ہوں میں فنا
مدتوں نکلا دھواں گھر کے درو دیوار سے

اک زمانہ ہو گیا روتے ہوئے ثاقبؔ مگر
دل مرا واقف نہیں اب تک کسی غمخوار سے

۲۴- اکتوبر ۱۹۱۳ء

خوف ہو صیاد سے یا برقِ آتشبار سے
میں اٹھا یا آشیانہ ہی اٹھا گلزار سے

داد پائیگا بھلا کیا حشر کے بازار سے
نامِ قاتل چھپ سکے گا زخمِ دامندار سے

پھٹ پڑا اک آسماں بلبل کے دل پر رات کو
رکھ دیا پھولوں نے منہ شبنم نے جسدم پیار سے

تیغ اٹھاؤ کس لئے شکوہ نزاکت کو ہو کیوں
کام لینا آگیا ہے ابروئے خمدار سے

بیچ کر بیٹھا ہوں اک ساغر پہ عقل و ہوش کو
اب تو میں کاہیکو اٹھونگا درِ خمار سے

اپنے دامن کو بچائے جوششِ فصلِ بہار
کانٹے اونچے ہو چلے ہیں باغ کی دیوار سے

کیا شکایت زندگی کی کیا طبیبوں کا گلہ
کب کوئی بیمار سنبھلا عشق کے آزار سے

وعدۂ وصلت پہ داغِ دل کی کیفیت نہ پوچھ
جھلملا جاتی ہیں شمعیں صبح کے آثار سے

فائدہ یوں خاک کے ڈھیروں سے آئیگا نہیں
دیکھ قبروں کو مگر چشمِ اولوالابصار سے

امتحاں گاہِ عنادل کاش گل بھی دیکھتے
جو قفس کی تیلیاں ہیں کم نہیں تلوار سے

طور پر اندازۂ حسنِ جہاں پیمانہ پوچھ
خود گری برقِ تجلی پہلے ہر ہشیار سے

دامن و جیب و گریباں ساتھ تھے پہلے مگر میں اکیلا بچ کے نکلا وادیِ پُر خار سے

ابتدائے عشق نے دھوکا دیا ثاقبؔ مجھے
فرق کچھ آساں نہیں تھا سہل کا دشوار سے

۷۔ اگست ۱۹۱۷ء

رسا تھی نزع میں ہر آہِ غم فزا میری رُلا گئی انھیں ڈوبی ہوئی صدا میری

اُٹھا ہی دیگا کوئی، پردۂ شبِ فرقت ادھر تو نالۂ دل ہیں اُدھر دعا میری

کہیں جہاں میں نہو ذکرِ بیگناہیِ دل کہ جانتا نہیں قاتل مرا خطا میری

وہ نزع ہی میں سہی آئے تو سرِ بالیں نہو شفا تو نہو تھی یہی دوا میری

یہہ دل نصیب نہیں ہر جو ہمصفیروں کو کسی دہن سے نکلتی نہیں صدا میری

بتائیے تو جسے آپ سُن کے روئے تھے وہ داستان کسی غیر کی تھی یا میری

کہوں میں یا نہ کہوں شوق اہلِ حشر کو ہے سُنی نہیں گئی، دیکھی ہوی جفا میری

صدائیں جا کے پھر آتی ہیں دامنِ شب میں یہہ خوف ہر کہ پلٹتی نہو دعا میری

کچھ استخوان ہیں جو نذرِ آتشِ دل ہیں اب آئیگی بھی تو کیا پائیگی قضا میری

مریضِ ہجر ہوں میں کیا ہوی شب و صلت کوئی بتلائے کسے مل گئی دوا میری

وہ روسے قبر پہ کچھ یاد آگیا شاید | یہ دل تو خیر، مگر ہاں، وہی وفا میری
جہاں میں آکے جو رویا تو عمر بھر نہ ہنسا | اس ابتدا ہی سے ظاہر تھی انتہا میری
وہ سر جھکائے ہیں محشر میں دم بخود ہو ہیں | انھیں کی شرم تھی جو ہو گئی حیا میری
نصیب دیکھو گری آکے شمع تربت پر | کبھی کی بیٹھی ہوئی آہ نارسا میری
پسینے حشر کے دن آرہے ہیں آخر کار | کہا تھا میں نے کہ لیلو کبھی دعا میری
بس ایک نسخۂ غم لکھ گیا تو پھر نہ چھٹا | تمام عمر نہ بدلی گئی دوا میری
لحد کی گوشہ نشینی سے فائدہ نہ ہوا | نہیں ہوں میں تو کہانی ہے جا بجا میری

چراغ قبر نہ اک شب بھی جل سکا ثاقب
یہ کس زمانے سے دشمن ہوئی ہوا میری

۱۸۔ نومبر ۱۹۱٦ء

جو کل نہیں آج کیا کریں گے | عالم کا خراج کیا کریں گے
دنیا سے شہیدوں کو علاقہ | سر ہی نہیں تاج کیا کریں گے
اُن آنکھوں سے ہو امید ہو کر | بیمار علاج کیا کریں گے
ہم خاکِ زمیں پہ سونے والے | شاہوں سے مزاج کیا کریں گے

جاہل ہیں جو معنیِ وفا سے — الفت کی وہ لاج کیا کرینگے
رہنے دو ہماری عادتوں کو — ہم رسم و رواج کیا کرینگے
جمعیتِ دل ہے خوب لیکن — آشفتہ مزاج کیا کریں گے
جو بسترِ غم پہ کچھ نہ بولے — وہ قبر پہ آج کیا کریں گے
دو روز کی زندگی ہے ثاقب
ہم کشور و تاج کیا کریں گے

۱۷- نومبر ۱۹۱۶ء

دیر ہوئی کہ آسمان برسرِ اختلاف ہے — ایک مجھی پہ ہے عتاب سب کی خطا معاف ہے
جل کے بھی میں نے اُف نہ کی الفتِ دل دہی رہی — برسوں دھواں گھٹا کیا پھر بھی سینہ صاف ہے
راستیِ وفا تجھے کس سے مقابلہ پڑا — شیوۂ حسنِ مہ رخاں ہے تو گزاف لاف ہے
وقت ہے امتحان کا کھینچ سکو خدا کرے — خیر برا ہو میں نہیں تو ہوں تیغ تو خوش غلاف ہے
واہ رے ہمت کرم آتشِ عشق پھونک کے — میں نے کہا خطا ہوئی دل نے کہا معاف ہے
خواہشِ امتیاز سے مل گئی عیب کو جگہ — کیسی ہی ٹھیک بات ہو حسن کو اختلاف ہے
مطلبِ شاد ومی الم کُن میں نہاں ازل سے تھا — عالمِ حسن و عشق بھی جلوۂ نون و کاف ہے

آمد و رفت میں ہیں محو حسرت و غم کے قافلے — کعبۂ دل کے گرد روز اک نیا طواف ہے

آپکا تھا گناہگار میں نہ کہ ابر و باد کا — میرا مزار تھا جہاں اب وہ زمین صاف ہے

خوب تھا قصۂ قفس سنتے جو میرے ہم نوا — قید میں ہے کہ مر گیا اس میں بھی اختلاف ہے

ثاقبِ دل حزیں تجھے دوست کوئی ملے تو کیوں

ایک وہی خفا نہیں سارا جہاں خلاف ہے

۲۳- مارچ ۱۹۱۷ء

ایک ایک گھڑی اسکی قیامت کی گھڑی ہے — جو ہجر میں تڑپا دے وہی رات بڑی ہے

یہ ضعف کا عالم ہے کہ تقدیر کا لکھا — بستر پہ ہوں میں یا کوئی تصویر پڑی ہے

بیتابیِ دل کا ہے وہ دلچسپ تماشا — جب دیکھو شبِ ہجر مرے در پہ کھڑی ہے

دیکھا تو زمانہ گلۂ ہجر سے کم تھا — سمجھا تھا کہ فرقت سے شبِ وصل بڑی ہے

رونے سے حیا شمع کی ظاہر ہو تو کیونکر — عریاں ہے مگر بیچ میں محفل کے کھڑی ہے

اب تک مجھے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا — کیا جانئے کس آنکھ سے یہ آنکھ لڑی ہے

گر جاؤں جو میں وادیِ الفت میں عجب کیا — مقصد ہے مرا سخت تو منزل بھی کڑی ہے

کب آؤ گے وقت آ گیا دنیا سے سفر کا — وقفہ ہے کوئی دم کا نہ ساعت نہ گھڑی ہے

کہدیئے وہ مجھے کو جہیں آنے نہیں دیتے — اپنا ہے خیال اُنکو مجھے دل کی پڑی ہے

ہمّت کو نظر پا نہیں سکتی کسی صورت — دل کوئی بُرا ہو، جو کوئی آنکھ بُری ہے

اے حشر نمائندۂ رفتار ٹھہر جا — اُس زلف کے صدقے جو ترے پاؤں پڑی ہے

تڑپا دیا دل گوندھ کے گیسوئے شبِ وصلت — میں جانتا تھا میٹھی یہ پھولوں کی چھڑی ہے

بالائے جبیں خون جب آیا تو عرق کیا — اے جلوہ گہِ حُسن تری دھوپ کڑی ہے

آدھی سے زیادہ شبِ غم کاٹ چکا ہوں — اب بھی اگر آجاؤ تو یہ رات بڑی ہے

آرائشِ گیسو کو حسیں مانگ رہے ہیں
ثاقبؔ کی غزل کیا کوئی موتی کی لڑی ہے

۱۲۔ جنوری ۱۹۱۸ء

اپنے ہی دل کی آگ میں آخر پگھل گئی — شمعِ حیات موت کے سانچے میں ڈھل گئی

تھا ضعف پر تڑپنے کی حسرت نکل گئی — جو آہ کی وہی مری کروٹ بدل گئی

دل رو دیا جو شمع سرِ بزم جل گئی — بے ساختہ اک آہ دہن سے نکل گئی

صرفِ جہانِ عشق ہوا خونِ دل مرا — دنیائے غم فقیر کی جھولی سے پل گئی

گلشن میں تھی بہار زمانہ ہوا جسے — میرے اسیر ہوتے ہی وہ رُت بدل گئی

تابِ کلام چاہتی ہے سرگزشتِ دل
کچھ کہہ سنائینگے جو طبیعت سنبھل گئی

دورِ فلک تھا جسکے بجھانے کی فکر میں
وہ شمعِ رات صبح سے پہلے ہی جل گئی

آنسو تو خیر، محنتِ جانکاہِ دل کو دیکھ
مژگاں کی خشک شاخ ریاضت سے پھل گئی

ہمدم چمن کی خیر منا، آشیاں تو کیا
دو چار دن اگر یہ ہوا اور چل گئی

تاثیرِ ہجر کون بتائے کہ میں تو میں
ہوتے ہی شام دہر کی صورت بدل گئی

آتے ہی اُنکے ختم ہوا وقتِ واپسیں
جانِ حزیں گئی تو مگر بے محل گئی

جلنے کی سیر دیکھ تو لیتی شعاعِ حُسن
یہ کیا کہ دل میں آگ لگا کر نکل گئی

کل ایک جانگداز تبسم میں برق کے
برسوں میں جو بسائی تھی بستی وہ جل گئی

سحرِ نگاہ ہیں نہ کہوں پھر تو کیا کہوں
چٹکی نہ تھی جو میرے کلیجے کو مل گئی

ہوکر نڈھال دل کی بحالی محال ہے
بجلی تو ہے نہیں کہ گری اور سنبھل گئی

ہے کچھ اُمیدِ زیست قفس میں مجھے اگر
اپنی ہی داستاں سے طبیعت بہل گئی

مارا مجھے اشارۂ ابروئے دوست نے
تھی گفتگوے صلح کہ تلوار چل گئی

صیاد مانتی نہیں قیدِ قفس کو روح
کیا اس کا اعتبار رہی یا نکل گئی

اے سوزِ عشق بس، کہ دل خوں شدہ ہے ختم
اک بوند ہے خدا نہ سنائے کہ جل گئی

اب تو صدائے نالۂ دل ہی سرودِ بزم　　کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی

ثاقب وہی ہے سلکِ گہرہائے شبچراغ
جو نظم میری فکر کے سانچے میں ڈھل گئی

۲۴- مئی ۱۹۱۶ء

مختار ہی بندہ کوئی مجبور نہیں ہے　　پھر کیا ہے جو دل پر مرا مقدور نہیں ہے

یا رات نہیں یا دلِ رنجور نہیں ہے　　مانندِ اجل صبح بھی کچھ دور نہیں ہے

جب خون میں ہی جوش تو پی جائیے کیونکر　　زخموں کا لہو بادۂ انگور نہیں ہے

شب کٹ گئی ہشیار رہو اے بسملِ فرقت　　کھول آنکھ کہ یہ صبح ہے کافور نہیں ہے

برسوں سے ہوں میں رہروِ صحرائے محبت　　پاس آ کے پہونچ جاؤں تو کچھ دور نہیں ہے

آئینۂ معکوس ہے یہ عالمِ ہستی　　جو میری تمنا ہے وہ منظور نہیں ہے

دھوکے میں جلا جلوہ گہِ حسن میں آ کے　　سمجھا تھا کہ محفل ہے کوئی طور نہیں ہے

رگ رگ کی کھٹک عشق میں دیکھی نہیں اب تک　　پھر کیا ہے اگر شیشۂ دل چور نہیں ہے

بھر جائیگا اک روز جو گردش ہے فلک میں　　یہ عمر کا ساغر کوئی ناسور نہیں ہے

مدت ہوئی گو عشق میں جلتے ہوئے دل کو　　پھر بھی تو چراغِ شبِ دیجور نہیں ہے

موہوم ہے امید رہائی کی قفس میں — ممکن ہے مگر دہر کا دستور نہیں ہے

محتاج ہوئی زندگیِ غیر پہ مر کے — جب شمع کو موت آئی تو کافور نہیں ہے

تلوار جو کھینچے ہو اُسے کہتے ہیں سرکش — جو سر کو جھکائے ہو وہ مغرور نہیں ہے

نزدیک سمجھ حشر ہو یا پیکِ اجل ہو — ملنا جسے منظور ہے وہ دور نہیں ہے

جس طرح بسر ہوتی ہے **ثاقبؔ** تہہِ گردوں

اس طرح کا جینا مجھے منظور نہیں ہے

٢٣- مئی سنہ ١٩١٦ء

گدا ہوں اور طرب کا سوال ہوتا ہے — پُر آبِ دیدہ جامِ سفال ہوتا ہے

جہاں میں آپ ہی اپنی مثال ہوتا ہے — وہ دل جو آئینہ دارِ جمال ہوتا ہے

خیالِ منزلِ الفت وبال ہوتا ہے — وہ سختیاں ہیں کہ غیر اپنا حال ہوتا ہے

میں طولِ محنتِ زنداں بتا نہیں سکتا — یہاں نہ ماہ ہے پیدا نہ سال ہوتا ہے

فدائے نشۂ الفت کہ غم سے فارغ ہوں — مجھے خبر نہیں کیسا ملال ہوتا ہے

قمر کے دل میں اگر داغ رہ گیا تو یہی — کہ ایک رات کا مہماں کمال ہوتا ہے

برشے دوش ہو زلفِ دراز کیوں نہ ہے — خیالِ صید میں کاندھے پہ جال ہوتا ہے

حکایتِ ستم و جورِ خوب ہے لیکن — یہ رنج ہے کہ انھیں انفعال ہوتا ہے

شمارِ عمر ہیں شبہائے ہجر کی سحریں — کہ ایک رات میں طے ایک سال ہوتا ہے

وفا بٹھادے جسے جوشِ دل کے تھالوں میں — ریاضِ دہر میں بس وہ نہال ہوتا ہے

جو کچھ ملے تجھے للہ جمع کرتا جا — فقیر سے بھی کسی دن سوال ہوتا ہے

بگاڑ بخت کا اے ہمصفیر کیا بنتا — اک آشیاں کا بنانا محال ہوتا ہے

رسیدگیِ ثمر ہے پیامِ ہجرِ شجر — زمانہ دشمنِ اہلِ کمال ہوتا ہے

یہ بے نقابیِ ماہِ دو ہفتہ خوب نہیں — زمانہ دشمنِ اہلِ کمال ہوتا ہے

نثارِ طولِ شبِ ہجر ہوں کہ سمجھا ہوں — ترے فراق سے تیرا وصال ہوتا ہے

امید و بیم میں ہے گردشِ کرشمۂ ناز — کوئی مریض تو کوئی بحال ہوتا ہے

زمانِ ہجر یہ گزرا کہ سوچنے پر بھی — یونہی سا کچھ مجھے دل کا خیال ہوتا ہے

چھلکتے دیکھے ہیں ساغر مگر پیا نہ کبھی — کہ تشنہ لب مرا جامِ سفال ہوتا ہے

اسیریِ قفس ایسی نہ تھی، کہ مر جاتا — مگر فراق میں جینا محال ہوتا ہے

بدل بدل کے جہاں اعتبار کھو بیٹھا — خوشی میں بھی مرے دل کو ملال ہوتا ہے

شبِ فراق میں گھٹ گھٹ کے منتظر ہوں میں — کہ اس زوال کو کب تک کمال ہوتا ہے

مجالِ نالہ و فریاد اب کہاں ثاقبؔ
زبانِ حال سے اظہارِ حال ہوتا ہے

۱۴- نومبر ۱۹۱۵ء

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

لہو تھا تمنا کا، آنسو نہیں تھے
بہائے نہ جاتے تو ہرگز نہ بہتے

وفا بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا وعدہ
گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے

ہجومِ تمنا سے گھٹتے تھے دل میں
جو میں روکتا بھی تو نالے نہ رہتے

میں جاگونگا کبتک وہ سوئینگے تا کے
کبھی چیخ اٹھوں گا غم سہتے سہتے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

بتاتے ہیں آنسو کہ اب دل نہیں ہے
جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا
زمانہ ہوا مجھکو چپ رہتے رہتے

مری ناو اس غم کے دریا میں ثاقبؔ
کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

۱۴ - نومبر سنہ ۱۹۱۴ء

محبت ہو گئی تھی عشق کو آنے مرے دل سے — کہ نکلا قاتل و مقتول میں کچھ فرق مشکل سے

خموشی پر مری کیوں بدگمانی ہو مرے دل سے — وہ کیا نالے کرے جو سانس بھی لیتا ہو مشکل سے

فروغِ حسن اُنکا ہیں تو میں پتھر بھی کہدے گا — وہ عالم ہے کہ آئینہ نہیں ہٹتا مقابل سے

نمایاں ہو بہت کچھ عشق کی منزل میں آسانی — مرے دل کی تمنا جب نکل سکتی ہو مشکل سے

اسیری ہی مقدر میں تو کوئی غیر کیوں چھیڑے — قفس ہو اور میں بیٹھا ہوا باتیں کروں دل سے

سوادِ ظلم مظلوموں کا ماتم آپ کرلے گا — بجھی ہیں جب کبھی شمعیں دھواں اُٹھا ہے محفل سے

مرے دل کا سفینہ ہے اس آفت خیز دریا میں — جہاں چلتی ہیں طوفانی ہوائیں دور ساحل سے

نہیں معلوم نقشِ بوریا بگڑا کہ باقی ہے — اسی کو چھوڑ کر بستر اُٹھاتا کوئے قاتل سے

یہ بیتابی کا عالم ہے کہ کوئی تھم نہیں سکتا — لہو فریاد بنکر اُڑ رہا ہے دامنِ دل سے

حدِ ہستی بہت کچھ نیستی تک کھینچ لایا ہوں — ملا دونگا کسی دن کھینچ منزل کو منزل سے

ستمگارانِ عالم رحم کے ہاتھوں سے مٹی دو — وہ ارماں ساتھ ہیں میرے جنھیں پالا تھا مشکل سے

کنارے بحرِ ہستی کے یہ ہو کر غرق ہوتا ہوں — مجھے کشتی ڈبونی تھی نہ تھی امید ساحل سے

دیا کرتے ہیں لو ہر وقت جنکی قبر کے پتھر — یہ شمعیں گل ہوئیں کیونکر ہوائے تیغِ قاتل سے

مرے چھوٹے ہوئے صحرا کی گرد اب تک نہیں بیٹھی
ندا دیتا ہے ہر ذرہ کہ میں گزرا ہوں منزل سے

وہی مطلب سمجھتے ہیں مری فریاد کا ثاقب
جو آسانی سے مرتے ہیں مگر جیتے ہیں مشکل سے

۲-اپریل ۱۹۱۵ء

کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہوگا مرے دل سے
نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہہ دوں عنادل سے

چھری ہے ہر نفس سر پر قدم ہے کام قاتل سے
عدم کی شاہراہیں مل گئی ہیں اک رگِ دل سے

ہوا خواہِ محبت ہے تو پہلے ہاتھ دھو دل سے
سہولت عشق کی منزل میں پیدا ہوگی مشکل سے

تعجب خیز ہے معجز نمائی عشقِ صادق کی
تمنائے دلِ مجنوں نکل آئی ہے محمل سے

چل اے ہمدم ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لیں
اگر دل بیٹھ جائیگا تو اُٹھ جائینگے محفل سے

زیادہ کر رہی ہے بیوفائی طولِ فرقت کو
تمہارا فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے مرے دل سے

امید و نا امیدی کا بہم ہونا وہی جانے
کہ جسنے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہے ساحل سے

فدائے کس مپرسی دل کا مطلب خوب ہی نکلا
جنازہ مر کے بھی اُٹھتا نہیں ہے کوئے قاتل سے

فریبِ عشق نے حد سے بڑھایا پاسِ الفت کو
تعلق ہو گیا آخر دلِ مجنوں کو محمل سے

نہ سمجھا معنیِ گور و کفن سمجھا تو یہ سمجھا
تھکا تھا میں لپٹ کر سو رہا دامانِ منزل سے

مرے پائے بیاباں گرد کو زنداں سے کیا مطلب
اگر کانٹے نہ پائیگا تو الجھیگا سلاسل سے

تڑپتا ہوں شبِ غم یوں کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا
بتا اے نامرادی کون سی باتیں کروں دل سے

ادھر میں سر بکف پہونچا عدالت گاہِ محشر میں
لہو کی بو ادھر آنے لگی دامانِ قاتل سے

وہی میں ناخدا تھا کشتیِ دل جسکو لے ڈوبی
مرا قصہ کوئی کہدے سبکسارانِ ساحل سے

وہ جس دن آ گئے شمعیں چڑھانے قبر پر **ثاقب**
اسی دن روشنی داغوں کی پھوٹی پردۂ دل سے

۳۔ مئی سنہ ۱۹۲۳ء

اٹھاؤں شمع کو کیا حسرتِ ارماں کی محفل سے
ترے ناوک کو پہلو سے نکالوں بھی تو کس دل سے

بڑھی یہ ناتوانی عشق میں بیماریِ دل سے
سنبھالا بھی لیا دم توڑنے والے نے مشکل سے

کسی بسمل کو جو حاصل ہوا شمشیرِ قاتل سے
وہی مجھکو مزہ ملتا ہے اس کھٹکے ہوئے دل سے

کہیں کشتیِ دل ڈوبی ہے موجیں کیا بتائینگی
زباں ہوتی تو میں کچھ پوچھتا لبہائے ساحل سے

فشارِ غم بس اب تو ضبط میں بھی آگ لگتی ہے
لہو جلتا ہوا رسنے لگا ہر گوشۂ دل سے

ہوئی عمرِ دو روزہ ختم ارمانوں کے جھرمٹ میں
اٹھایا آسماں نے لاکھ میں اُٹھا نہ محفل سے

لباسِ بے لباسی میں کہیں مجنوں نکلتا ہے
نہیں بے وجہ یہ سرگوشیاں آج دو کی محمل سے

وہی شب جو کسی کی ایک کروٹ میں گزر رہی ہے
مرے گھر آکے مثلِ روزِ بد کٹتی ہے مشکل سے

بس اے کشتیِ دل بیڑا تباہی کے حوالے کر
کنارے آچکی ہے عمر میں ہی دور ساحل سے

فقط اک اہلِ زنداں کیا انھوں نے بھی سنے ہونگے
مرے نالے بہت اونچے گئے شورِ سلاسل سے

دعائیں دیں مرے بعد آنیوالے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

مری آنکھیں بھی روتی رہیں تو اسکی پرسش کیا
یہ پوچھو خون کیوں برسا کیا ابروئے قاتل سے

غموں کے آسرے پر ہجر میں تھی زندگی ثاقب
خلش بڑھتی جو یہ کانٹے نکلتے دامنِ دل سے

۲۰- فروری سنہ ۱۹۱۹ء

بے سبب تڑپا نہ میں نے بے محل فریاد کی
دل پھڑک اٹھا جو کوئی حسن نے ایجاد کی

حسنِ گل نے کی مدد شاید دلِ ناشاد کی
میرے نالوں پر طبیعت آگئی صیاد کی

اُٹھکے دیکھ اے درد کون آج آگیا برسونکے بعد
ہلکے زنجیرِ درِ زنداں نے کیوں فریاد کی

دل اگر تڑپا نہیں، آنسو اگر ٹپکے نہیں
آپ نے کیونکر مری بیتی کہانی یاد کی

سبز باغ اچھا مجھے دکھلا رہا ہے گھات میں
ڈالیوں کے بیچ میں خم ہے کمر صیاد کی

کوچۂ دشمن تو ہے گر تو نہیں اے کوئے دوست
بن ہی جائیگی کہیں تربت دلِ ناشاد کی

اپنے ہاتھوں مٹ گیا دل ذبح انکو کیا کہوں
مدتوں تڑپا جو بھولے سے کبھی فریاد کی

کاٹنا پتھر کا بھی اچھا نہیں کیا ذکر دل
دھار الٹی ہو گئی تھی تیشۂ فرہاد کی

شکوۂ ہجر حسین کا دل ہی دیگا کچھ جواب
بیخودیِ عشق اس میں کیا خطا صیاد کی

آگ ہی یا زخم ہے اب ذکرِ خونِ دل کہاں
میرے پہلو میں ہیں تصویریں تری بیداد کی

فاتحہ پڑھتے ہیں وہ جب جا وہیں ہوتی ہی قبر
یوں ہوائے دھر نے مٹی مری برباد کی

کوئی چھوٹا تو اسیری سے مری شکرِ خدا
میں قفس میں ہوں مگر نیند اڑ گئی صیاد کی

روک کر اپنی زباں ثاقب سنو اور دل کی بات
چپکے چپکے سیر دیکھو عالم ایجاد کی

۲۸ - جنوری ۱۹۱۷ء

رہے فریاد میں گیسوئے خوباں دیکھنے والے
ڈرے ہیں تو نہ خوابِ پریشاں دیکھنے والے

غروبِ مہر دل کے ڈوبنے کا ایک نقشہ ہے
سحر دیکھینگے اب کیا شام ہجراں دیکھنے والے

ہیں ایسے بھی جو کانٹا یاد میں چبھنے نہیں دیتے
انھیں دیکھا ہے تڑپتے دل میں پیکاں دیکھنے والے

مرے ہاتھوں سے انکے ہاتھ کی قوت زیادہ ہے
نظر دلبر کریں چاکِ گریباں دیکھنے والے

بہت آسان ہے دل توڑنا ابرِ گل تر کا
قفس میں جا بسے گلچیں کا داماں دیکھنے والے

میں تڑپوں یا نہ تڑپوں امتحاں ہیں وقتِ آخر ہے ۔ ادھر دل دیکھنے والا ادھر جاں دیکھنے والے

علاجِ دردِ دل اور ونکے جلنے سے نہیں ہوتا ۔ جلائیں شمع پھر کیا شامِ ہجراں دیکھنے والے

مری فرقت کی شب کٹتی نہیں شکوہ کرے دل کس سے ۔ بڑے سوتے ہیں اس مشکل کو آساں دیکھنے والے

مرا رونا شبِ فرقت تماشا گاہِ انجم ہے ۔ مگر ڈوبینگے آخر کو یہ طوفاں دیکھنے والے

میں گم ہوں صحنِ عالم سے تو قاتل چھپ نہیں سکتا ۔ لگا لینگے پتا اسکو پشیماں دیکھنے والے

کہے جا بندھ چلا ہو داستاں کا رنگ محفل میں ۔ مری سننے لگے ہیں وے جاناں دیکھنے والے

فراقِ خواب بس کر انتظارِ شوق اب دم ہے ۔ تھکے جاتے ہیں طولِ شامِ ہجراں دیکھنے والے

زبردستی کی رخصت اہلِ دل نشتر سمجھتے ہیں ۔ خود اٹھے جاتے ہیں دنیا کو مہماں دیکھنے والے

بیانِ ماجرائے عشق سے کیا فائدہ ثاقب
یقیں کرتا نہیں کوئی مگر ہاں دیکھنے والے

۳۱ - جنوری ۱۹۱۷ء

تماشا ہو گئے سیرِ گلستاں دیکھنے والے ۔ لہو رو دیا کئے گلشن کا داماں دیکھنے والے

میں وہ آئینۂ عبرت نما ہوں بزمِ ہستی میں ۔ نظر کرتے ہی ہو جاتے ہیں حیراں دیکھنے والے

شہادت گاہِ دل اچھی نہ ناکامی کی منزل آخر ۔ بہت روئینگے منسکر کو یہ جاناں دیکھنے والے

دور دورہ حسنِ عیبِ گل چھپاتا ہے مگر پھر بھی
کھٹک جاتے ہیں داماں دیکھنے والے

مزارِ گُل دلِ آفت رسیدہ کی طرح شق ہے
ادھر دیکھا اُدھر درِ منعم کے ساماں دیکھنے والے

مری میت اُٹھاتا ہے تو کوئی یوں نہ آ کر دے
کہاں ہیں آج سیرِ جسمِ بیجاں دیکھنے والے

اکیلا تیرے دروازے کو میں تکتا ہوں اور مجھ کو
بہت سے ہیں ترے در پر نگہباں دیکھنے والے

کوئی صحرا ہے محشر، خیر ہوگا، دیکھ ہی لینگے
ڈرینگے کیا جنونِ فتنہ ساماں دیکھنے والے

یدِ بیضائے موسیٰ یہ نہیں ہے داغِ پنہاں ہے
نظر نیچی کریں جیبِ گریباں دیکھنے والے

اندھیرا ایک سا تھا زندگی بھی راہ بھولی تھی
چلے آئے لحد تک شامِ ہجراں دیکھنے والے

فتیلونکی رگوں پر جو گزرتی ہے گزرنے دیں
کھڑے ہوں دور ہی لطفِ چراغاں دیکھنے والے

شبِ فرقت کی تاریکی نہ دیکھی ایک نے ثاقب
بہت ہیں جلوہ ہائے داغِ سوزاں دیکھنے والے

۸۔ نومبر ۱۹۱۴ء

ہیں لن ترانیاں وہی حسنِ غیور کی
کیا راہ مانگنے کو چلیں کوہِ طور کی

کچھ حد نہیں رہی مرے غم کے وفور کی
تصویر بن گیا ہوں فنائے سرور کی

دل میں بھی جلوہ گر وہی صورت ہے نور کی
بیکار لو لگی ہے مجھے کوہِ طور کی

آنکھوں کو تم رلاؤ کہ ہیں مجرمِ نگاہ
کیوں بستیاں جلاؤ دلِ ناصبور کی

سمجھا نہ تھا کہ جرم ہے کوئی سوالِ دید — اے برقِ حسن دل نے خطا تو ضرور کی

اچھی ہی ہر طرح رخِ محبوب بے نقاب — اک وجہ ہی مگر شبِ غم کے ظہور کی

کچھ کھو کے سیکھ شیوۂ تحصیلِ مدعا — بیہوش ہو کے دیکھ ادا برقِ طور کی

نالوں کے واسطے شبِ غم کیا مفید تھی — اُنکے قریب آ گئی آواز دور کی

ممنونِ انقلاب نہیں کشتگانِ عشق — حالت ہی ایک طرح دلِ ناصبور کی

چپکے پڑے تھے کب سے شبِ انتظار میں — سنتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے آواز صور کی

شب ہو رہی ہے اہلِ جفا کی نگاہ میں — کیا ہولناک صبح ہے یومِ النشور کی

جانے دو مرنے والے پر اتنا عتاب کیوں — کیا فائدہ سزا سے دلِ بے شعور کی

اے چارہ ساز میری رگِ جاں ہی خارِ عشق — پھر میں نہیں اگر یہ خلش دل سے دور کی

صبحِ قفس خدا نہ دکھائے اسیر کو — ہوتی ہیں دل کے پار صدائیں طیور کی

سن دو گھڑی فسانۂ ویرانۂ عدم — کچھ چپکے چپکے کہتی ہیں لوحیں قبور کی

ٹھہرا کے بجھ گئی ہی ابھی اُنکی شمعِ بزم — نالہ نہیں تو آہ کسی نے ضرور کی

پھرتا ہوں راہِ عشق میں **ثاقب** تباہ حال
جاگیر چھین لی شبِ غم نے سرور کی

۱۵ ستمبر ۱۹۱۷ء

عجب کہ آپ شناسا نہیں ہیں تربت کے ابھی تو ابھرے ہوئے نقش ہیں محبت کے

زمینِ حشر پہ آثار ہیں قیامت کے وہ جی اٹھے ہیں جو مارے ہوئے تھے فرقت کے

دل ایک طرح کا ہونا محال ہے لیکن بہت ہیں لوگ زمانے میں ایک صورت کے

رہینِ الفتِ دیرینہ ہیں ہم مذاق مرے بگولے اور نہ صدقے ہوں میری تربت کے

مثالِ ابر میں روتا تو ہوں مگر اے دل ستارے کاہے کو ڈوبینگے شامِ فرقت کے

بٹا ہے خانۂ دل جان لینے والوں میں کہیں ہیں عشق کے بستر کہیں مصیبت کے

یونہی تھا غرقِ عرق حشر میں تمام جہان بڑھا دن اور جو دفتر کھلے شکایت کے

یہ شامِ تار یہ رونا پسند ہے مجھکو حیات بخش ہیں چشمے دیارِ ظلمت کے

زیادہ ہم سے کہیں یہ خموش ویرانے جو سننے والے ملیں داستانِ عبرت کے

زمینِ حشر کے جھٹکے وہ تھے خدا کی پناہ کہ ٹوٹ ٹوٹ گئے سلسلے قرابت کے

کفن سے منہ نہ چھپاؤ مرا جہاں والو حجاب کچھ تو ہٹیں چہرۂ حقیقت کے

جو ٹھہرے آپکے پہلو میں دل تو میں مجرم ٹھکانے دیکھئے تو دشمنانِ راحت کے

میں سن چکا دل و بلبل کی بحث بیجا ہے وہ اپنی شکل کے ہیں بھول اپنی صورت کے

نشیمن اور چمن دونوں ایک حال میں ہیں　　کچھ آگے پیچھے پڑے تھے قدم مصیبت کے

نصیب شاہوں کو ہو گنج و کشور و دیہیم
یہ چند شعر ہیں **ثاقب** ہماری قسمت کے

۳-مارچ ۱۹۲۲ء

میں دیکھوں مجھ میں کب تک طاقتِ پرواز آتی ہے
چمن سے ہر گھڑی آوازِ پرآوازآتی ہے

بلائے بد ہے عشقِ مہوشاں لیکن کروں کیا میں
نہ دل ہے ترک پر راضی نہ قسمت باز آتی ہے

نہیں معلوم میں کیسا مریضِ غم ہوں عالم میں
کہ ٹھوکر کھا کے بستر تک نگاہِ ناز آتی ہے

چھری کو دیکھ کر محشر میں کہتے ہیں وفا والے
یہ کس دل کا لہو ہے جس سے بوئے راز آتی ہے

بہار آئیگی پھر صیاد، لیکن یہ سمجھ دل میں
بڑی مشکل سے جا کر طاقتِ پرواز آتی ہے

اسی کو جیتیں وہ کھویا ہوا دل وقفِ حسرت ہے
کہ ہر جانب سے پہچانی ہوئی آواز آتی ہے

کبھی پروانے شمعِ بزم سے واقف نہ تھے لیکن
اجل انجام کی صورت میں بے آغاز آتی ہے

وہ خوش ہوتے ہیں میری بے اثر فریاد سے **ثاقب**
سمجھتے ہیں صدائے پردہ ہائے ساز آتی ہے

۲۔ جولائی ۱۹۱۵ء

بڑے شباب پہ دردِ فراقِ مستی ہے — نہ ہو شراب تو پھر دل گھٹا برستی ہے
نہ شمع روتی ہے آ کر نہ برق ہنستی ہے — میں جب سے قبر میں ہوں بیکسی برستی ہے
سنے تو کون سنے میکدے میں واعظ کی — یہاں وہی ہیں جنھیں شغلِ مے پرستی ہے
میں سخت جاں نہیں خنجر بھی تیز دم لیکن — نگاہِ یاس ہے، قاتل کی تیز دستی ہے
بھرے ہوؤں کو بھرا کرتے ہیں کرم والے — جہاں ہے سبزہ گھٹا بھی وہیں برستی ہے
غلط ہے زیرِ نگیں ہو کے دعویِ وسعت — بس ایک حلقۂ خاتم فضائے ہستی ہے
ہزار خواہشِ دل ہے مگر نہ مانگوں گا — سبوئے میکدہ پر وقتِ تنگدستی ہے

میں سنکے آیا تھا، آبادیِ عدم لیکن
کوئی نظر نہیں آتا، یہ کیسی بستی ہے

چمن نہ دیکھ، نشیمن کو دیکھ اے بلبل
بہار ہی میں کبھی آگ بھی برستی ہے

جلاوں شمع تو آخر جلا کے دیکھوں کیا
ہر ایک رات یہاں شغلِ غم پرستی ہے

نہیں ہے دہر میں یارا ے دم زدن **ثاقب**
بس ایک سانس میں سطے ماجرائے ہستی ہے

۲۲- جنوری ۱۹۱۵ء

سوزِ غم سے ہر رگِ دل جلکے شعلا ہو گئی
میری خاطر سردیِ موسم بھی عنقا ہو گئی

کچھ نہ کچھ تو دیکھ ہی لیتے ہیں مشتاقانِ دید
برق جب چمکی چراغِ طورِ سینا ہو گئی

ہر اندھیرے میں اُجالا ہے اگر دل ہو نصیب
رات کالی تھی مگر تصویرِ لیلیٰ ہو گئی

زندہ جاوید ہوں فیضِ شہادت گاہ سے
بڑھتے بڑھتے دل کی بیماری مسیحا ہو گئی

دل کو پھنستے دیکھکر دامِ جمالِ ناز میں
خوبیِ قسمت اڑی ایسی کہ عنقا ہو گئی

حالِ دل پوچھو نہ بے کھوئے ہوئے کو کھو گیا
جانے والی چیز تھی کیا جانئے کیا ہو گئی

قیدِ غم بھی دل لگی ہے ہنسنے والوں کے لئے
عندلیب آکر قفس میں اک تماشا ہو گئی

آسماں کو دیکھکر سمجھا ہیں طولِ شامِ غم
صبح اتنی دور جا پہونچی کہ تارا ہو گئی

اہلِ ہمت کی ذرا سی آنکھ کا کیا پوچھنا　　امتحاں دینے پہ جب آئی تو دریا ہو گئی
اس سویدائے شبِ غم کے نظارے کے لئے　　تیرگی پھیلی ہوئی عالم کی یکجا ہو گئی
طینتِ آدم میں تھی اللہ کیا نشو و نما　　ایک مٹھی خاک یوں پھیلی کہ دنیا ہو گئی

دل کی دل ہی میں رہی ثاقب تمنائے حرم
عمر صرفِ جلوۂ دیر و کلیسا ہو گئی

۲۰- جنوری ۱۹۲۶ء

دوستوں سے دور کر کے خوش نہیں وحدت پہ بھی　　رشک آتا ہے فلک کو عالمِ غربت پہ بھی
گردبادِ دشت، یہ صحرا نوردی تا بہ کے　　شامیانہ ایک چھوٹا سا مری تربت پہ بھی
روزِ محشر کے اجالے میں کھلا میرا لہو　　تم تو تم، دھبا ہے دامانِ شبِ فرقت پہ بھی
ایک میں ہوں جو گناہ دشمنی پر ہوں نثار　　ایک وہ دل ہیں جو خوش ہوتے نہیں الفت پہ بھی
ہے دھواں جلتے دلوں کا ہر طرف بالائے طور　　آج چھائی ہے گھٹا خمخانۂ وحدت پہ بھی
برق کے گرنے سے ماتم ایک ہی ہوتا تو خیر　　آشیاں کے ساتھ آنچ آئی مری حسرت پہ بھی
وہ چراغِ دیر ہو یا جلوۂ شمعِ حرم　　روشنی کوئی تو آ جاتی مری تربت پہ بھی
میرے عصیاں گو زیادہ ہیں مگر تیری قسم　　میں نہ مانوں گا کہ زورِ جرم ہو رحمت پہ بھی

طاقتِ فریادِ بیکسی آزمانا کیا ضرور ۔۔۔ میں تو آنِ قلبِ عالم ہوں گئی حالت یہ بھی

عشق کے پہلے جو عالم تھا کبھی تھا دشمنِ خیر ۔۔۔ وہ نہ کہتا تھا کہ آجاتا ہے دل آفت یہ بھی

کم رہیں کیوں قصرِ شاہی سے غریبوں کے مزار ۔۔۔ شمع تو سونا چڑھا دے منزلِ عبرت یہ بھی

محشرِ رفتار دیکھا، اب اُٹھا کر آنکھ دیکھ ۔۔۔ سایہ افگن ہے قیامت اس قد و قامت یہ بھی

یادِ عاشق یہ نہیں، ذکرِ خدا سمجھو اسے ۔۔۔ آؤ، دم بھر فاتحہ پڑھ لو مری تربت یہ بھی

باتیں اہلِ فقر سے کیوں ہوں کہ ہے خوفِ سوال ۔۔۔ منعمو یہ ہوشیاری نشۂ دولت یہ بھی

ہنسنے والوں کو ہنساتا جا، مگر اے آسماں ۔۔۔ اِک نگاہِ لطف اہلِ درد کی حالت یہ بھی

قابلِ جنبش رکھا پرتوِ رخ نے مجھے ۔۔۔ دل سنبھل جائے تو ڈالو نگا نظر صورت یہ بھی

دل مرا کیا چیز ہے جا دیکھ قصرِ مصر میں ۔۔۔ عشق نے کھینچا تھا اک خطِ دامنِ عصمت یہ بھی

راز ظاہر ہو نہ ہو اسمیں خطا میری نہیں ۔۔۔ حُسن پردہ ڈالتا ہے چہرۂ غیرت یہ بھی

جبہہ سائی کر رہا ہے سنگِ در پر دل مرا ۔۔۔ مر گیا شاید کہ راضی ہو گیا ذلت یہ بھی

حسن کی طاقت سے باہر تھی مری تاثیرِ آہ ۔۔۔ رُخِ خوبانِ جہاں اس ظلم کی عادت یہ بھی

بات کہتے ہیں دکھا دیتی ہے یہ رنگیں چمن ؎
ناز ہے **ثاقب** کو اپنی خاک کی طینت یہ بھی

۴۔ اکتوبر ۱۶ء ۱۹

اسیرِ عشقِ مرض ہیں، تو کیا دوا کرتے
جو انتہا کو یہ سمجھتے تو ابتدا کرتے

اگر زمانے میں اپنے کبھی وفا کرتے
دہانِ زخم تڑپنے پہ کیوں ہنسا کرتے

مریض لذتِ فریاد کہہ نہیں سکتے
جو نالے کام نہ آتے تو چپ ہوا کرتے

ہم اُن سے مل کے بھی فرقت کا حال کہہ نہ سکے
مزہ وصال کا کھوتے اگر گلا کرتے

مذاقِ درد سے ناواقفی نہیں اچھی
کبھی کبھی تو مری داستاں سنا کرتے

شبِ فراق گوارا نہ تھی مگر دیکھی
اب اور خاطرِ مہماں زیادہ کیا کرتے

درِ قفس نہ کھلا قدرِ صبر کر صیاد
تڑپتے ہم تو پہاڑوں میں راستا کرتے

اسے جلا کے آسے آگ دی بُرا نہ کیا
جگر جو رکھتے تھے آخر وہ دل کو کیا کرتے

زبان والوں سے سُن سُن کے ہے یقیں ثاقب
کہ بولتے تو صنم بھی خدا خدا کرتے

۶۔ اکتوبر ۱۷ء ۱۹

سب ڈھونڈتے ہیں مجھ کو گم ہوں جو گلستاں سے
تنکے بھی جھانکتے ہیں جھک جھک کے آشیاں سے

جو پر گرے قفس میں لاؤں انھیں کہاں سے
اب فاصلہ نہ پوچھو مجھ سے اور آشیاں سے

تقدیر راہبر ہے میں کچھ نہیں سمجھتا | جاتا ہوں میں کدھر کو آتا ہوں میں کہاں سے

انکار کیجئے کیوں سب راز کھل چکے ہیں | کچھ میرے حالِ غم سے کچھ آپکے بیاں سے

نالوں کو راستے میں کب تک کوئی نہ ملتا | آخر کو صبح ہوتے ٹکرا گئے اذاں سے

اک خوانِ دعوتِ دل اور دہر کی بلائیں | مہمان آرہے ہیں کھنچکر کہاں کہاں سے

کچھ دور گرد آئی ہم بیکسوں کے پیچھے | یوں دوستی بڑھائی منزل نے کارواں سے

وہ حفظ کی علامت، لٹنے کی یہ نشانی | نالوں کو کیا علاقہ آوازِ پاسباں سے

اے سرزمینِ تربت سونے دے تھک گیا ہوں | اک عمر جنگ کرتے گزری ہے آسماں سے

پھولوں سے تو چھٹا میں ہاں اب یہ دیکھنا ہے | کبتک بنی رہیگی گلچیں و باغباں سے

یہ زندگی کی حالت ہی دیکھنے کے قابل | خوش ہوجئے گا یوں تو اک روز داستاں سے

ثاقب کھلے نہیں کچھ اسرار اس گلی کے
جاتا ہے جو پلٹ کر آتا نہیں وہاں سے

۱۸- اکتوبر ۱۹۱۷ء

قاتل، حجاب اٹھا آخر غمِ نہاں سے | بجلی سی کوندتی ہے کٹتی ہے رگ جہاں سے

اک دل تھا جو نہ پلٹا جا کر درِ بتاں سے | لاؤں فلک کی خاطر اب دوسرا کہاں سے

خنجر پہ بھی نہ پایا دامن پہ بھی نہ دیکھا ‌ ‌ ‌ سرکا نہ قطرۂ خوں میدانِ امتحاں سے

برباد میری صورت کوئی جہاں میں کیوں ہو ‌ ‌ ‌ صحرا کی گرد بیٹھے اُٹھتا ہو میں جہاں سے

کیا دشمنِ نشیمن پُرزور آندھیاں تھیں ‌ ‌ ‌ برسوں گرے ہیں تنکے دامانِ آسماں سے

آئی ہے شامِ فرقت گھبرا رہا ہوں تنہا ‌ ‌ ‌ جو غمگسارِ دل تھا لاؤں اسے کہاں سے

یونہی اگر ستایا دکھتے ہوئے دلوں کو ‌ ‌ ‌ اک دن لہو گرے گا مینائے آسماں سے

صحرائے عشق دفتر ہے میرے سوزِ غم کا ‌ ‌ ‌ پھوٹے وہیں پہ چھالے اٹھا قدم جہاں سے

اُبھرا ہوا نہ دیکھا نقشِ وفا کسی کا ‌ ‌ ‌ خوش دل ملا نہ کوئی اس لفظِ بے نشاں سے

کیا یادِ رفتگاں میں دل پر گزر رہی ہے ‌ ‌ ‌ یہ اُس سے پوچھئے جو بچھڑا ہو کارواں سے

ثاقب نہ پوچھئے کچھ اندوہِ شامِ فرقت
کہنے میں جب نہ آئے تو کیا کہوں زباں سے

۱۸ - جون ۱۹۱۷ء

ہو کے بیحس اور کیا پایا دلِ رنجور نے ‌ ‌ ‌ روشنی اپنی اُٹھا رکھی چراغِ طور نے

المدد اے خضر میری ناتوانی دیکھ کر ‌ ‌ ‌ کچھ زیادہ پاؤں پھیلائے ہیں راہِ دور نے

دیکھئے تو آکے شامِ ہجر کے نقش و نگار ‌ ‌ ‌ بخت کی تصویر کھینچی ہے شبِ دیجور نے

عشق کی معراج تو حق تھی مگر تقدیر سے — جا سکے تھوڑی ہی دور ہمت ہار دی منصور نے

زورِ سیلِ غم نہ پوچھو دیکھتے ہی دیکھتے — دیدۂ یعقوب سے بستر اُٹھایا نور نے

دہر میں سنگِ حوادث کی خبر تھیا ضرور — کاسۂ چینی سے باتیں کی نہیں فغفور نے

لگ نہ جائے آگ ناسوروں کی صورت میں کہیں
گھر بنایا کیوں مرے دل کی طرح زنبور نے

۲۵ ۔ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

میں رو رہا ہوں جو دلکو تو بیکسی کے لئے — وگرنہ موت تو دنیا میں ہر کسی کے لئے

شبِ فراق کی روزانہ آفتیں، توبہ — یہ امتحان تو ہوتا کبھی کبھی کے لئے

بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا — مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کیلئے

وسیع بزمِ جہاں ہے تو ہو مجھے کیا کام — جگہ ملی نہ مری حسرتِ دلی کے لئے

یہ اور دامنِ قاتل سے چھوٹ جائیگا — لہو میں جوش تو برسوں سے تھا اِسی کیلئے

نہ آنکھ بند کروں میں تو کیا کروں یارب — وہ آرہے ہیں تماشائے جانکنی کے لئے

بُلا کے مجھکو نکالا ہے اپنی محفل سے — وہ نیکیاں نہیں اچھی جو ہوں بدی کیلئے

قفس میں آج تماشائے غم ہے قابلِ دید — تڑپ رہا ہوں میں صیاد کی خوشی کیلئے

تمام ہو گئے ہم اک نگاہِ قاتل سے — رگیں گلے کی تڑپتی رہیں چھری کے لئے

فروغِ حسن بڑھا دل کی بے نوائی سے — فقیر ہو گیا شانِ تونگری کے لئے

قفس میں چپ رہو ہمنشیں تو کیا کروں کہ یہ قید — نہ دوستی کے لئے ہے نہ دشمنی کے لئے

تمام بزم میں چھایا ہوا ہے سناٹا — چھڑا تھا قصۂ دل آنکھ کی دل لگی کے لئے

شکایتِ چمنِ دہر کیا کروں **ثاقب**

ہوا خلاف ہے لیکن کسی کسی کے لئے

۲۰- مارچ سنہ ۱۹۲۰ء

شامِ فراق کچھ نہیں آتا نظر مجھے — چھپکر جلائیں کیوں مرے زخمِ جگر مجھے

برسوں سے شامِ ہجر ہے کُحلِ بصر مجھے — دیکھی تو تھی یہ یاد نہیں ہے سحر مجھے

چپ رہنا قیدِ غم میں مگر میرے ہمصفیر — کرتے ہیں محوِ نالہ کشی چھیڑ کر مجھے

تم دور رہو تو کس لئے دل میں مقام ہے — میں پاس ہوں تو کیوں نہیں اپنی خبر مجھے

بگڑا ہے حسن و عشق کے ہاتھوں نظامِ دہر — بیجا خیال ہے ادھر اُنکو اُدھر مجھے

نقشِ قدم میں نقشِ وفا دیکھ دیکھ کر — کرتی ہے یاد کھوکے مری رہگزر مجھے

قائل ہوں میں کہ محفلِ تقدیر بھی جواد — حصہ ملا سبھوں کو خوشی کا مگر مجھے

سودائے عشق ضعف سے ٹتا نہیں کبھی — اس لاغری میں بار ہوا اپنا سر مجھے

پردے سے باہر آ گیا اب زندگی کا راز — دیکھو تو دیکھ جاؤ کبھی اک نظر مجھے

نالوں سے بھی اُچاٹ ہے دلِ شامِ غم یہ کیوں — شاید وداع کر کے گیا ہے اثر مجھے

شوقِ بہارِ باغ میں تنکے چُنے تو ہیں — دیکھوں جو دیکھنے دے اسیری کا ڈر مجھے

دل والے جانتے ہیں مگر کہہ رہا ہوں میں — تڑپا رہی ہے شدتِ دردِ جگر مجھے

حدِ زندگی کی جھیل کے پھر بھی نہیں سکون — لیجائیگی یہ وحشتِ دل اب کدھر مجھے

کیا قبر پر جلائے ہیں احباب نے چراغ — اس سمت سے تو کچھ نہیں آتا نظر مجھے

نالوں نے کر دیا مری عزلت کا راز فاش — شب کو بھی اب چھپا نہیں سکتا ہے گھر مجھے

درباں کی نظر میں ہوں میں اجنبی تو کیا — مدت سے جانتا ہے ترا سنگِ در مجھے

دنیا نئی قفس کی ہے اپنے سوا جہاں — ڈھونڈے سے بھی ملا نہ کوئی نوحہ گر مجھے

کیا جانے کوئی کُند چھُری تھی کہ اور کچھ — اک چیز ذبح کرتی رہی رات بھر مجھے

غربت میں راہ کٹتی ہے ثاقب مرے سبب
قصہ سمجھ رہا ہے مرا ہمسفر مجھے

۱۴۔ ستمبر ۱۹۲۳ء

سحر کو بھی مری محفل میں برہمی نہ ہوی — تمام رات ہوی درد میں کمی نہ ہوی
غرورِ حسن تمنائے دل کا دشمن تھا — وہ کون دن تھا کہ جس دن خوشی نہ ہوی
اُمنڈ رہی ہے مرے دل کے ساتھ برسوں سے — یہ کوئی نہر ہوی آنکھ کی نمی نہ ہوی
میں اپنے قتل کا شاکی نہیں ہوا تو ہوا — یہ رنج ہے کہ ترے ظلم میں کمی نہ ہوی
لحد یہ آنے کے انداز سیکڑوں تھے مگر — خوش آئی وضع انھیں وہ جو ماتمی نہ ہوی
اُلٹ اُلٹ گئے دل میرے انتقال کے بعد — یہ کیا کہ آپ کی زلفوں میں برہمی نہ ہوی
ہزاروں اُٹھ گئے آغوشِ دہر سے لیکن — عجیب گھر ہے زمانہ جہاں غمی نہ ہوی
یہ جسم روح بہی خواہ کا رہا دشمن — تمام عمر کبھی صلحِ باہمی نہ ہوی

ہر ایک کے لئے کھنچنا روا نہیں ثاقب
بھوؤں کا حسن ہی کیا ہے اگر خمی نہ ہوی

۱۷ جولائی سنہ ۱۹۲۰ء

کردیا روح کو جانے کا اشارا کس نے — مرکے بھی نہ کھلا راز کہ مارا کس نے
آزمائش تھی زمانے کی مری عزلت میں — میں نے در بند کیا جب تو پکارا کس نے
ایسی ہی کاہشِ غم ہے کہ ہوں بیدل ورنہ — جیتے جی اپنی اجل کی ہے گوارا کس نے

بے نشاں ہر دلِ صد چاک تو اک مدت سے | سچ بتا دے تری زلفوں کو سنوارا کس نے
نہ تو پانی تھا نہ کوشش تھی بتا اے رحمت | چاہ سے حضرتِ یوسف کو ابھارا کس نے
دیکھ کر خوں مرا کیوں ہے یہ بے گفت و شنید | کھل ہی جائیگا دمِ حشر کہ مارا کس نے
ہو نہ ہو دل تھا، اک آواز ابھی آئی ہے | اور پھر خانۂ زنداں میں پکارا کس نے
کچھ دنوں سے اثرِ غم نہیں لیتا مرا دل | اس کو بتلا دیا جینے کا سہارا کس نے
شمعِ تربت مری شایانِ توجہ تو نہ تھی | کر دیا بادِ صبا تجھکو اشارا کس نے
باتیں سب صحنِ چمن تک تھیں مگر قید کے بعد | ہمصفیروں میں مجھے آکے پکارا کس نے
میرے قاتل کے سوا جس نے مرا سر کاٹا | غیر کے بوجھ کو عالم میں اتارا کس نے
میں تھا وہ جس نے جلایا شبِ تیرہ میں چراغ | ورنہ اجڑی ہوئی منزل کو سنوارا کس نے
شامِ فرقت مری رو تی ہوئی آنکھوں کے سوا | اور پیدا کیا تھا صبح کا تارا کس نے

خوش دلوں میں اثرِ غم ہے نمایاں **ثاقب**
بزمِ خوباں میں کیا ذکر ہمارا کس نے

۲۴ - اگست سنہ ۱۹۲۰ء

اپنے گھر میں ہوں مگر دل مائلِ فریاد ہے | وادیِ غربت کا سناٹا ابھی تک یاد ہے

خوفِ گردوں سے کہ ہر دم مائلِ بیداد ہے ۔۔۔ نیچے نیچے خاک کے ملکِ عدم آباد ہے
چہرۂ گلرنگ کے جلوے سے دل کیوں شاد ہے ۔۔۔ حسن کے پردے میں عشقِ خانماں برباد ہے
یادگارِ دہر ہے یہ خود فراموشی مری ۔۔۔ آپکو بھولا ہوں اوروں کا فسانہ یاد ہے
ایک ہی تختے پہ ظاہر ہے دو رنگیِ فلک ۔۔۔ ہے چمن آباد میرا آشیاں برباد ہے
نغمہ سنجانِ گلستاں پر یہ شب کیسی کٹی ۔۔۔ صبحدم تا دورِ شورِ نالہ و فریاد ہے
ایک میرے دم سے ہی آوازۂ گل ہے ۔۔۔ میرا ہر نالہ بہارِ گلشنِ ایجاد ہے

اک بلائے جاں ہے ثاقبؔ وسعتِ صحنِ خیال
ملکِ ہستی قید خانہ بہرِ آدم زاد ہے

۲۵- فروری ۱۹۱۸ء

نہ آسمان ہے ساکن نہ دل ٹھہرتا ہے ۔۔۔ زمانہ نام گزرنے کا ہے گزرتا ہے
طویل عمر بھر اس پہ یہ اشکباریِ دل ۔۔۔ نہ ختم ہوتا ہے پانی نہ جام بھرتا ہے
پُر آب دیدۂ آئینہ ہو کے پچھتایا ۔۔۔ کہ دیکھتا ہے وہی اُسکو جو سنورتا ہے
وہ میری جان کا دشمن سہی مگر صیاد ۔۔۔ مری کہی ہوئی باتوں پہ کان دھرتا ہے
ہمیں ہیں وہ جو اُمیدِ فنا پہ جیتے ہیں ۔۔۔ زمانہ زندگیِ بے بقا پہ مرتا ہے

ابھی ابھی درِ زنداں پہ کون کہتا تھا ادھر سے ہٹ کے چلو کوئی نالے کرتا ہے
وہی سکوت سے اک عمر کاٹنے والا جو سننے والا ہو کوئی تو کہہ گزرتا ہے
حریفِ بزم میں چھیڑا کریں مگر ثاقب
وہ دل جو بیٹھ گیا ہو کہیں ابھرتا ہے

۱۶- نومبر ۱۹۲۰ء

رائگاں ہیں کوششیں چلتی نہیں تدبیر کی دل اٹھائے دیتی ہیں ناکامیاں تقدیر کی
رات کے آتے ہی سو سو بار رہتا ہوں حلال ہے صدا ہر نالۂ شبگیر میں تکبیر کی
قوتِ دیوانگی تھی ورنہ کیا آسان تھا قیدِ تنہائی میں کڑیاں جھیلنا زنجیر کی
شامِ آفت میں کوئی تو ہو گیا پرسانِ حال موت نے تقدیم کی جب آپ نے تاخیر کی
اپنی اپنی ہمتیں ہیں لے لیا اپنا جذبِ شوق میرے ہی دل میں جگہ نکلی تمہارے تیر کی
ماتمِ دل میں کئی دن سے ہے ثاقب نوحہ خواں
بیگناہوں پر ستم عادت ہے چرخِ پیر کی

۱۳- نومبر ۱۹۲۰ء

وصل کی امید بڑھنے بڑھنے تھک کر رہ گئی صبحِ کاذب اور کیا کرتی چمک کر رہ گئی

دل شبِ غم کاٹ لایا دم ہوا لیکن ہوا — اک کلی تھی جو سحر ہوتے مہک کر رہ گئی

ناشناسِ روئے خوش حالی ہے طبعِ غم نصیب — جب مسرت سامنے آئی جھجک کر رہ گئی

مجھکو جلنے دے ابھی اے موت کیوں دنیا کہے — آگ کیسی تھی جو سینے میں بھڑک کر رہ گئی

کوئی کیا دیکھے بہارِ روئے قاتل بعدِ ذبح — کیوں کھلے وہ آنکھ جو حسرت سے تک کر رہ گئی

میرے دل کے زخم اور انکی شماتت دیکھئے — ہنس دیے کشتِ تمنا جب لہک کر رہ گئی

کیا تمنا تھی یہ بیتابی جسے رکنا پڑا — تنگ تھا صحنِ قفس بلبل پھڑک کر رہ گئی

لوگ کہتے ہیں کھلا تھا رات بھر بابِ قبول
کس طرف میری دعا ثاقب بھٹک کر رہ گئی

۵- فروری ۱۹۱۲ء

ہر اک تنکے میں ہے تاثیر عشقِ روح فرسا کی — نشیمن کیا ہے اک چھوٹی سی بستی ہے تمنا کی

محبت قیس کی خود ہو گئی مشکل کشا آخر — جدھر دیکھا ادھر موجود تھی تصویر لیلیٰ کی

بناؤں آشیاں کیا پھنس گیا ہوں باغِ عالم میں — یہ کیا کم ہے کہ بے خواہش ہوا کھاتا ہوں دنیا کی

دکھا کر آتشِ گل حسن نے چھیڑا محبت کو — ہرے تنکوں میں بلبل نے بھی آخر آگ پیدا کی

نہ تڑپے جو وہ پیشِ حسنِ خرمن سوز کیوں جائے — غشی عالم کی تھی اک دل لگی برقِ تجلی کی

مریضِ ہجر تو نے آنکھ دیکھی ہے مسیحا کی　　بہت سے ناتواں اچھے ہیں پھر کیوں جان دیتا ہے

یہی تھا عمر بھر کا ساتھ جو دیکھا شبِ غم میں
کہ ثاقب رات بھر جاگا کیا تقدیر سویا کی

۲۴ - دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء

ظلم اپنوں پر جفا جو کس لئے　　اے فلک شبنم کے آنسو کس لئے
ڈھونڈتے ہیں سب تجلی گاہِ دوست　　قمریوں کی ورنہ کو، کو، کس لئے
دور گیں گردن کی کٹ سکتی نہیں　　پھر یہ خنجر اور بازو کس لئے
خواہشِ دنیا ہے عشق و حسن سے　　ورنہ پھر میں کس لئے تو کس لئے
بے ثمر گر فیض کے خواہاں نہیں　　سرو رہتے ہیں لبِ جو کس لئے
تم یہی سمجھو کہ ہے فرقت میں چین　　اہلِ غم بدلیں گے پہلو کس لئے

سر بکف حاضر ہے ثاقب دیر سے
کھنچ رہی ہے تیغِ ابرو کس لئے

۲۱ - اگست سنہ ۱۹۲۰ء

وہ روحِ بخشِ جاں تھے جاں کاہ بنکے نکلے　　کچھ دم تھے پاس میرے جو آہ بنکے نکلے

زخموں کے دہن آکر اس چاندنی میں دیکھو جو داغِ دل تھے مخفی وہ ماہ بنکے نکلے
طفلی کی بیگناہی پیری کی روسیاہی آئے تھے ہو کے رہبر گمراہ بنکے نکلے
وہ یوسفی مصائب سو آفتوں سے اچھے نکلے جو بندِ غم سے تو شاہ بنکے نکلے

افشاں شرر کی جنکر ڈوبی ہے خونِ دل میں
ثاقب پھر اور کیونکر یہ آہ بنکے نکلے

۶- فروری ۱۹۲۱ء

دل کے ہوتے بھی کہیں درد جدا ہوتا ہے اک فقط موت کے آجانیسے کیا ہوتا ہے
ظلم سے ذکرِ وفا اور سوا ہوتا ہے اُنکی ہر ایک بُرائی میں بھلا ہوتا ہے
شُہدا نعمتِ دُنیا کی طلب بھول گئے خون کے گھونٹ میں ایسا ہی مزا ہوتا ہے
خود فراموشیِ الفت ہی علاجِ غمِ دہر بیخبر ہوش میں آنا ہی بُرا ہوتا ہے
امتحاں گاہ تری محفلِ دلکش ہے مگر میں بھی دیکھوں کہ کوئی دل کے سوا ہوتا ہے
تم سے کہتا ہوں مرا خون مرے دل پہ سہی رسم دنیا ہے کہ اپنوں سے گلا ہوتا ہے
بزم سے اُٹھ تو چلا میں کہ تحمل تھا لیکن رونے والوں سے بھلا کوئی خفا ہوتا ہے
دیکھ ہی لیتے ہیں سب نازو ادا کی صورت آئنہ آپ کا نقشِ کفِ پا ہوتا ہے

نالۂ دل کے اثر کا نہ کرو مجھ سے گلہ | مجھکو کیا علم کہ کس طرح رسا ہوتا ہے

توبہ، توبہ ہے یہی عشق کی باطل نظری | سنگ بتخانے میں آتے ہی خدا ہوتا ہے

کیا سبب کچھ تجھے معلوم ہے اے ابرِ بہار | دل کے مرجھانے سے کیوں زخم ہرا ہوتا ہے

وہ کہیں یا نہ کہیں میں ہوں اثر سے واقف | یوں اُٹھتا ہے وہ نالہ جو رسا ہوتا ہے

روشنی دل کی ابھی ہے کہ ہیں کھوئے ہوئے ہوش | دیکھنا ہے شبِ تاریک میں کیا ہوتا ہے

ہجر کے درد کو بڑھنے دے کہ ہے مژدۂ وصل | وہی گھٹتا ہے جہاں میں جو سوا ہوتا ہے

بدنصیبی ہو تو ہر خوب کی خوبی ہے فضول | صبح کا وقت ستاروں کو بُرا ہوتا ہے

دل تو دل سر بھی کبھی ہوتا ہے ممنونِ فراق | جس میں ہے عشق یہ سودا وہ جدا ہوتا ہے

میرے راضی برضا ہونے سے سب راضی ہیں | ورنہ جو ہے وہ شکایت سے خفا ہوتا ہے

اولیں مرحلۂ عشق ہے جب حسرتِ موت | کوئی بتلائے کہ پھر بعد میں کیا ہوتا ہے

بیم و امید سے کس طرح نکل جاؤں کہ دل | نہ ٹھہرتا ہے جہاں میں نہ فنا ہوتا ہے

منتظر نزع میں جب ہے، تو اُسے جیتا سمجھ | دم کا رُک رُک کے نکلنا بھی گلا ہوتا ہے

شبِ تاریک میں نکلا تو ہے دیکھوں ثاقب

نارسا رہتا ہے نالہ کہ رسا ہوتا ہے

۴۔ فروری ۱۹۲۲ء

میری قسمت میں یہی لکھا ہی پھر کیا کیجئے ۔۔۔ بند میری آنکھ ہو اور آپ دیکھا کیجئے

لاکھ راہیں ہوں نکلنے کی تو پھر کیا کیجئے ۔۔۔ دل کو کوئی صورت نہیں ہے جسکو دکھلا کیجئے

حال اہلِ عشق غیروں سے نہ پوچھا کیجئے ۔۔۔ آپ بھی ویسا ہی دل پہلو میں پیدا کیجئے

دل نظر سے پہلے کھنچ جائے تو اسکا کیا علاج ۔۔۔ ہو سکے تو آپ مشتاقوں سے پردا کیجئے

عقل حیراں ہے کہ وہ بھی حشر میں ہیں دل بھی ۔۔۔ کسکو عزت دیجئے اور کس کو رسوا کیجئے

ایک سے لیتے نہیں ہیں دوسرے کا انتقام ۔۔۔ جرم ہے دل کا تو کیوں خونِ تمنا کیجئے

کوچۂ الفت کے ہر ذرے سے آتی ہے صدا ۔۔۔ لیکے امیدیں کسی در پر نہ بیٹھا کیجئے

الٹی سانسیں دل کی حالت کہہ رہی ہیں وقتِ نزع ۔۔۔ آپ ان خاموش باتوں کو بھی سمجھا کیجئے

واہ وا اے بےحسیِ عشق کیا کہنا ترا ۔۔۔ دل پہ چل جائے چھری آنکھوں سے دیکھا کیجئے

ہے حجابِ معصیت پھر بھی ہیں عریاں روزِ حشر ۔۔۔ عارفوں کی بھیڑ میں کس کس سے پردا کیجئے

پہلے دل کہتا تھا دیکھے جا دل سوئے اہلِ حسن ۔۔۔ اب یہ فرمائش ہے آنکھوں سے کہ رو دیا کیجئے

جو نہ آئینگے نظر جا کر انھیں دیکھ آئیے ۔۔۔ کون کہتا ہے کہ بیماروں کو اچھا کیجئے

مفت بازیگاہِ دنیا میں ہے بدنام اہلِ عشق ۔۔۔ جان ہی کا کھیل ہوتا ہو تو پھر کیا کیجئے

ہم تو دل بیچیں مگر ثاقبؔ وہ دل والے کہاں
ہے بھری بازار لیکن کس سے سودا کیجیے

۸- دسمبر ۱۹۲۲ء

خیالِ عشرت و آرام بعدِ عشق باطل ہے
یہ دل اک عقدۂ لاحل ہے کھلنا جس کا مشکل ہے

مکافاتِ ستم روزِ جزا قاتل سے مشکل ہے
کسے دعوائے خوں ہوگا جو پہلو میں یہی دل ہے

گلہ ہے عشق کو پہ حسن ہے ممنونِ الفت کا
یہی دل ان کا شیدا ہے یہی دل میرا قاتل ہے

اجل کے ڈھونڈنے والے کو شامِ غم سے کیا شکوہ
جو ہو تیرہ بہ کُل وہ میرے لئے دلچسپ منزل ہے

عدم سے آ کے اس دارِ فنا میں خوب پچھتایا
یہ اک ماتم کدہ نکلا میں سمجھا تھا کہ محفل ہے

گُلِ خاموش کس سے جا کے اپنی داستاں کہتے
مگر آوازۂ گلشن یہی شورِ عنادل ہے

ملا کرتی ہے بے ہوشوں سے دولت ہوشیاری کی
وہی عالم کو خوب سمجھتا ہے دنیا میں جو غافل ہے

نہ ہوں شمع و چراغ اچھا نہ ہوں باطن تو روشن ہو
سوادِ غم سے ڈرتا ہوں کہ آئینہ مرا دل ہے

بہت ڈوبے بہت اُبھرے فریبِ حسن و الفت میں
سوائے جذبِ دل لیکن نہ دریا ہے نہ ساحل ہے

زباں جلنے سے پائی شمع نے گورِ غریباں میں
نصیبا آج چمکا ہے کہ جب خاموشِ محفل ہے

فدائے ہمتِ دل بڑھ گیا اپنی امیدوں سے
جہاں کوئی نہیں ٹھہرا وہاں میری منزل ہے

الجھتی ہے نگاہِ قیس بیجا گرد بادوں سے
طلسمِ عشق ہے ثاقبؔ نہ لیلیٰ ہے نہ محمل ہے

۲۹ - دسمبر ۱۹۲۳ء

رہینِ غمِ فراموشی گلوں کو یاد کیا کرتے — اب اس سے بڑھ کے پاسِ خانۂ صیاد کیا کرتے

تصورِ عیش کا کرتے ہیں تو غم اور بڑھتا ہے — جو یاد آنے سے بھولا ہو اُسے ہم یاد کیا کرتے

لہو دل ہو گیا اپنے ہی نالوں سے شبِ غم میں — کوئی بتلائے اب فریاد کی فریاد کیا کرتے

ہمیں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیتے زندگی والے — نہ ہوتے ہم جہاں میں تو ستم ایجاد کیا کرتے

اسیری راستہ دیتی نہیں دل کو تصور کا — قفس والے خیالِ خاطرِ آزاد کیا کرتے

زمانہ ہو نہ جاتا دست کش آخر تو کیا کرتا — جو زیرِ خاک ہیں ظالم انہیں برباد کیا کرتے

ہماری طرح مہماں چند دن کا تھا نشیمن بھی — جسے ویران ہونا تھا اُسے آباد کیا کرتے

ترس کو بھی جگہ دیتی نہیں غم دوستی میری — جو ناشادی پہ مرتا ہو اُسے ہم شاد کیا کرتے

خوشی نا خوش بسر کی عمر طوفانِ حوادث میں — مخالف تھی ہوائے عالمِ ایجاد کیا کرتے

رسائی کب تھی اُن کی بزم میں اچھا جو ہوتی بھی — تو ہم کیا اُن سے کہتے اور وہ ارشاد کیا کرتے

نیاز و ناز تھے دونوں طرف حدِ ترقی پر — ہم اُن کو بھولتے کیونکر وہ ہم کو یاد کیا کرتے

ستم احباب کے آئینۂ اخلاص تھے **ثاقب**
مقامِ شکر تھا ہم شکوۂ بیداد کیا کرتے

۱۹- دسمبر ۱۹۲۶ء

دل جو رہتا تو سمجھتے کہ قضا آئے گی
اب جو ہستی کا نشاں گم ہے تو کیا آئیگی

تم نہ آئے سرِ بالیں تو قضا آئے گی
درد کے نصیبیں میں عاشق کی دوا آئیگی

موت قبضے میں جو ہوتی تو قفس کیوں ہوتا
خیر پھر فصلِ گل اور اسکے سوا آئیگی

درِ زنداں کو کھلا سونے دے جی بہلے گا
کوئی ہمدرد نہ آیا تو بلا آئے گی

آہ اچھی تھی مگر میں نے یہ ڈر کر نہ بھری
کہ کسی شمعِ فروزاں کو بجھا آئے گی

جس جگہ جا ہو غزل بھیج دو اپنی **ثاقب**
داستانِ دلِ بیتاب سنا آئے گی

۹- فروری ۱۹۲۷ء

اک نیا دل ظلم سہنے کو بنانا چاہیئے
ہو تو سکتا ہے مگر اسکو زمانا چاہیئے

زندگی والونکو پانی اور دانا چاہیئے
جب قفس میں ہوں تو غم ہر وقت کھانا چاہیئے

اس طویل العمر دن سے قصۂ غم ہے دراز
اک ذرا روزِ قیامت کو بڑھانا چاہیئے

اپنے دامن کو سمیٹے اے روشنیِ برقِ طور
جلوۂ رخ آنکھ والوں کو دکھانا چاہیے

جتنی راہیں ہیں جھلکتی اک مری امید کی
پھر بھی کہتا ہوں مجھے کس سمت جانا چاہیے

موت ہو یا وہ ہوں دونوں ہیں علاجِ دردِ دل
ایک کو میری شبِ فرقت میں آنا چاہیے

خود جھکے کوئی تو جھکنے میں کسی کو عذر کیا
سامنے تلوار کے گردن جھکانا چاہیے

پارہ پارہ ہو رہی ہے قوتِ فریاد بھی
ہنسنے والے دل کے ٹکڑوں کو ملانا چاہیے

ابتدائے ہجر ہو یا انتہائے وصل ہو
موت آنے کے لئے کوئی بہانا چاہیے

بارہا پلٹا ہوں اُنکے در سے بے نیلِ مرام
جی میں ہے پھر آج قسمت آزمانا چاہیے

مر گئی ہیں حسرتیں لاکھوں مرے مرنیکے بعد
ایک میت ہو تو میں کہدوں اُٹھانا چاہیے

حشر میں کہتا ہوں دل سے پاسِ الفت ہے ضرور
پہلے جو گزرا اُسے اب بھول جانا چاہیے

آتشِ الفت کو دامن کی ہوا دیتا ہے حسن
صبر کہتا ہے کہ داغِ دل چھپانا چاہیے

زمرۂ خلقی جو تھے میرے وہی تھے وقتِ قید
جب بگڑے بات تو کس کو بنانا چاہیے

سینچتا رہ دامنِ دل میں نہالِ زخم کو
حشر میں اک باغ اسے ثاقب لگانا چاہیے

۱۶- نومبر ۱۹۲۴ء

کشتیِ عمرِ رواں پر بحرِ غم کا بار ہے — کیا سمجھ کر لوگ کہتے ہیں کہ بیڑا پار ہے

عشق کہنے کے لئے منجملۂ اسرار ہے — چند باتیں تھیں جنھیں کہنا بھی اب دشوار ہے

میں یہ کہتا تھا کہ سب آہ و فغاں بیکار ہے — یہ نہ سمجھا تھا دلِ مضطر، کہ تو بیمار ہے

دل کی پہلو میں کھٹک ہے، دوش پر سر بار ہے — عشقِ صادق، نذر دے کچھ، حسن کا دربار ہے

خود بخود تھرّا رہی ہے لَو چراغِ زیست کی — سانس کا لینا بھی میرے واسطے دشوار ہے

خواب میں ہیں وہ تو ہوں بیدل تڑپتا جا یونہی — انکی قسمت کا ستارہ چرخ پر بیدار ہے

کروٹیں لیتی ہے دنیا، آفریں اے دردِ دل — بوجھ میرا ہے مگر سارے جہاں پر بار ہے

گو یہ دل بہکا ہوا ہے پھر بھی ہے پیشِ نظر — میکدہ تیرا جہاں کا مست بھی ہشیار ہے

فاصلہ سا مجھ میں اور دل میں ہے پر کھلتا نہیں — اس سے میں بیزار ہوں یا مجھ سے وہ بیزار ہے

ہو گئی نذرِ نگاہِ ناز ساری زندگی — پھر بھی وقتِ نزع دل کو حسرتِ دیدار ہے

آسماں سے ہو تو کیونکر ہو رفاقت کی اُمید — راہ بدلیگی ضرور اسکی جو کج رفتار ہے

ایک چھوٹی سی حقیقت چشمِ گریاں ہے مگر — کون سے بادل کا ٹکڑا ہے کہ دریا بار ہے

تاجدارِ ملکِ غم ہوں مقدرت میری نہ پوچھ — وہ بھی سب کچھ ہے جو رونے کیلئے درکار ہے

ذرّے ذرّے سے عیاں ہے گردشِ تقدیرِ دل — ہر بگولا دشت میں میرا علم بردار ہے

موت وہ اچھی کہ جسکے بعد مل جائے حیات | جو سبب ہے موت کا وہ زندگی بیکار ہے

سبزۂ باغِ دہر میں لایا ہوں میں اے دل تجھے | آزماتا ہوں کہ تو غافل ہے یا ہشیار ہے

غیر ہے پھر غیر دل اپنا تھا اس سے پوچھئے | کیا خطا کی تھی جواب تک درپئے آزار ہے

بھیجنے لایا تھا قبروں پہ چراغِ سوزِ غم | کون لیگا روشنی سویا ہوا بازار ہے

اپنی حالت کے سوا کچھ بھی نظر آتا نہیں | جسکی صورت دیکھتا ہوں وہ ہی بیمار ہے

نزع کے ہیں کچھ اشارے دیکھئے اور جائیے | کیا مرا قصہ کوئی دفتر ہے یا طومار ہے

آ ادھر **ثاقب** میں دیکھوں تو گریباں میں ہے کیا
طوقِ طاعت ہے کہ مخفی رشتۂ زنار ہے

۴- نومبر ۱۹۲۲ء

سنگِ در پر شکلِ سائل ہیں دلِ رنجور ہے | میں نہیں کہتا کہ کچھ دیدو مگر دستور ہے

سرد آہوں سے علاجِ سوزِ دل ہوتا نہیں | یہ ہیں ویسی ہی کہ جیسے شمع میں کافور ہے

ہمتِ سالک سے بھی افزوں ہے راہِ عشقِ دل | زندگی گزری مگر سنتا ہوں منزل دور ہے

جتنے چھالے ہیں تسلی کے وہ سب بیکار ہیں | زخم جو دل میں ہے وہ رستا ہوا ناسور ہے

دیکھنے والوں سے امیدِ شفاعت تھی مگر | جسمیں میں مبتلا ہوں وہ رات بھی مجبور ہے

بھاگتا گیا ہی حوادث ہی میں ہیں گنجِ عروج — طورِ صوت کو بگڑوا دے تو پھر پرنور ہے

دیکھ میرے دل کو تو اے منکرِ اعجازِ عشق — گر نہیں سکتا ہی بادہ اور شیشہ چور ہے

اب جنونِ شعر ہے ثاقبؔ سودائے غزل

انتظارِ موت ہے میں ہوں دلِ رنجور ہے

۲۷ - جنوری ۱۹۳۳ء

پیری میں بھی شبِ غم تجھ سے مفر نہیں ہے — اک عمر کٹ چکی ہے اور پھر سحر نہیں ہے

گلشن کا رنگ دو دن اک حال پر نہیں ہے — کل جنکے آشیاں تھے آج اُنکا پر نہیں ہے

فرقت کا، بزمِ الفت پر کچھ اثر نہیں ہے — او جانے والے دل ہی یہ رہگزر نہیں ہے

اُس چشمِ معرفت سے وہ کس طرح چھپیں گے — کوئی حجاب جسکی حدِ نظر نہیں ہے

برباد ہو نہ یارب وہ منزلِ محبت — جسکے سوا غموں کا دنیا میں گھر نہیں ہے

نیند اُڑ گئی جو اُنکی میں کیا سمجھ کے خوش ہوں — میری فغاں تو وہ ہے جس میں اثر نہیں ہے

مدت سے شکلِ عشرت ڈوبی ہوئی ہو غم میں — یہ دیدۂ جہاں بیں کس وقت تر نہیں ہے

آفت کی منزلوں میں دل کا خدا نگہباں — گم ہو نشانِ جادہ اور راہبر نہیں ہے

نازک مزاجیوں کی حد اور کیا بتاؤں — میں کیا کسی سے اُنکی سیدھی نظر نہیں ہے

میں تو اُجڑ گیا ہوں جلنے سے آشیاں کے — گلچیں ترے لئے بھی اچھا ثمر نہیں ہے

خاموش تھا تو ثاقب دی جیب کی داد کس نے
نالہ کیا تو وہ بھی کچھ با اثر نہیں ہے

۱۹- جولائی سنہ ۱۹۲۰ء

دنیا کو عداوت ہے میری مژہ تر سے — ہر سمت صدائیں ہیں اللہ کرے برسے

لب ایسے دھندلکے میں ملتے رہیں ساغر سے — برسوں کی تمنا ہے دو دن تو گھٹا برسے

سو کروٹیں دم بھر میں لیں دلِ میکش نے — اک چشمکِ ساقی سے اک گردشِ ساغر سے

جز خونِ تمنا کیا صیاد اسے کہئے — ٹپکا ہے لہو برسوں ٹوٹے ہوئے شہپر سے

اب کچھ نہیں بن پڑتا، مانگوں کہ نہ مانگوں میں — بےحس ہوا جاتا ہے دل جنبشِ ساغر سے

خونابہ فشاں آنکھیں وہ دیکھ کے کہتے ہیں — طوفان یہ خونی ہی گزرے گا ترے سر سے

بلبل نے قفس میں جو آنکھوں سے نچوڑا تھا — آخر وہ لہو ٹپکا دامانِ گلِ تر سے

کام آئے جو محشر میں دو چار ہی قطرے تھے — جو دل سے جدا ہو کر لپٹے رہے خنجر سے

ناکامیوں کا ثاقب کس منہ سے گلہ کرتے
برسوں کا تعارف تھا برگشتہ مقدر سے

۲۴- جنوری ۱۹۲۵ء

آئنہ انکو دکھایا جو خود آرائی نے — ہاتھ رکھا مری آنکھوں پہ شکیبائی نے

گو ڈرایا مجھے مژگاں کی صف آرائی نے — دل کو مجبور کیا پیشۂ آبائی نے

گھر کیا لوحِ جبیں پر مری رسوائی نے — داغِ دل اور ابھارا ہی جبیں سائی نے

عقدۂ زندگی و موت مرا کھل نہ سکا — سیکڑوں عیب چھپائے مری تنہائی نے

ہاتھ اٹھے تھے مجھی پر اسے اب سمجھائیں — روح کو کھینچ لیا ہی تری انگڑائی نے

صبح ہوتی نہیں گو ختم یہ ہی شامِ فراق — ساتھ چھوڑا ہی کہاں دل کی شکیبائی نے

طور پر تاب رہی یا نہ رہی، خیر، مگر — کچھ تو دکھلا ہی دیا ذوقِ تمنائی نے

آرزو ہو کہ تمنا، کوئی کہدے کہ نہ آئیں — دل کی تھوڑی سی جگہ چھین لی تنہائی نے

اپنی خواہش سے بلندی کبھی ملنے کی نہیں — آسماں چھو نہ لیا آپ کی انگڑائی نے

حسن کی داد وہ کیا دے جو ہو ویرانۂ عشق — سر ہی باقی نہیں رکھا ترے سودائی نے

کس سے پوچھیں کہ تھی کس قسم کی محفل سرِ طور — سب تھے دیکھا نہ مگر ایک تماشائی نے

ساری دنیا کے تعارف سے اسے کیا مطلب — مجھکو پہچان لیا ہے شبِ تنہائی نے

سر جھکانے پہ بھی ہی پیشِ نظر جلوہ دوست — کیوں نشاں حسن کا اونچا کیا انگڑائی نے

پردہ پوشی پہ تری ناز تھا اے ذرّہ نواز | حشر میں ڈھانپ لیا منہ مری رسوائی نے
دلِ پژمردہ سے کیا کام گر گلشن ہے وسیع | پھول توڑے ہیں بہت سے تری رعنائی نے
انتظار ایک تھا وہ یاس کے ہاتھوں نہ رہا | کچھ نہ رکھا مرے گھر میں مری تنہائی نے
میکدہ میں مجھے اک جام سے محروم نہ کر | طاق سے کچھ تو اتارا تری انگڑائی نے
زندگی آئی تھی کل کر کے قیامت کا بناؤ | اپنا منہ پھیر لیا آپ کے شیدائی نے

دیکھ لیتے کبھی ثاقبؔ وہ پریشانیِ دل
اتنا موقع نہ دیا اُن کو خود آرائی کا

۲۳۔ مئی ۱۹۲۵ء

انفعالِ دادخواہی کا سماں دیکھا کئے | وہ زمیں دیکھا کئے ہم آسماں دیکھا کئے
امتحاں میں ہم نیا اک امتحاں دیکھا کئے | کیا تماشا تھا جسے پیر و جواں دیکھا کئے
قصۂ دل پر جو روئے اشکِ غم کیا اُنکا ذکر | آفریں اُن پر جو رنگِ داستاں دیکھا کئے
جدولوں کے ماسوا پایا نہ مضموں کا پتا | صفحۂ گیتی پہ قبروں کے نشاں دیکھا کئے
روح اُسی جانب رہی وہ جس طرف تھے جلوہ گر | وصل میں بھی ہم فراقِ جسم و جاں دیکھا کئے
اُڑ گیا دل پر نہ ابرو سے ہٹی اپنی نگاہ | کام ناوک کر گیا اور ہم کماں دیکھا کئے

ڈھونڈنے پر بھی نہ نکلا جنسِ دل کا مشتری
عمر بھر ہم زنگِ بازارِ جہاں دیکھا کئے

نزع میں اُنسے غرض نکلا دو رعبِ تپاک تھا
جو سرھانے تھے وہ میری تپلیاں دیکھا کئے

ہم پہ کیا گزری اُسے بس ندہ کیونکر جانتے
تھک کے جو بیٹھے وہ گردِ کارواں دیکھا کئے

سیر میں بھی ہم ادا و ہم نوا کی تھی تلاش
وہ چمن دیکھا کئے ہم آشیاں دیکھا کئے

عشق والوں کے گلو پر ہر گھڑی تھی اک چھری
امتحاں سے پہلے وقتِ امتحاں دیکھا کئے

ہم تو تیرے دیکھنے والے تھے او بیدادگر
پھر یہ کیا گزری کہ چشمِ پاسباں دیکھا کئے

اہلِ ہمت اس جہاں میں اہلِ غم کا نام ہے
گھر نہ تھا اور پھر بھی راہِ میہماں دیکھا کئے

دامنِ یوسف جنہوں نے مصر میں دیکھا نہ تھا
کیا نظر آیا جو اُسکی دھجیاں دیکھا کئے

اُن والوں سے بہارِ بوستاں پوچھو کہ ہم
جورِ گلچیں و جفائے باغباں دیکھا کئے

آبلوں کی سرکشی کو کوئی دیکھے تو کہ یہ
دل میں رہتے تھے مگر میری زباں دیکھا کئے

بُعدِ منزل احتیاطِ روح کا مانع نہ تھا
مجھ پہ جو گزری یہاں وہ سب وہاں دیکھا کئے

دفن تھی جو داستاں اُسکی سماعت کچھ نہ پوچھ
حشر والے میرا اندازِ بیاں دیکھا کئے

شمع و پروانہ کو دو دشمن سمجھ ایدل کہ وہ
بزم میں جلنے جلانے کا سماں دیکھا کئے

ایک ہم تھے آتشِ گل پر جو روئے مدتوں
ایک وہ بھی تھے جو جلتا آشیاں دیکھا کئے

کیا غبارِ دل کو دھو یا تربتوں کی خاک نے ‏ ‏ آ گئے یوں ہم بے نشانوں کے نشاں دیکھا کئے

وقتِ دفن اس الفتِ دنیا پہ خاک اتنی پڑی ‏ ‏ چھپ گیا میں اور میرے مہرباں دیکھا کئے

تا فلک **ثاقب** تری روشن ضمیری ہے عیاں

دور والے بھی ترا داغِ نہاں دیکھا کئے

۲۱- جون ۱۹۲۵ء

نہ ابر آنے کی خواہش ہے نہ کہتا ہوں کہ مُن برسے

اسی کو میں بہت سمجھوں جو کچھ مل جائے ساغر سے

تواضع اُن کی اور حاجت مری دونوں ہیں پوشیدہ

نہ وہ آئے کبھی گھر پر، نہ میں پلٹا کبھی در سے

نبھا کر بیڑیاں لو ہے کو بھی بدنام کرنا ہے

ہر اک جا بیٹھ جاتا ہوں خود اپنے غم کے لنگر سے

تمھیں اپنا ہی طالع کیا سمجھ لوں میں زمانے میں

گلہ جو تم سے ہے مجھکو وہی شکوہ مقدر سے

تعارف کب کا تھا انگور میں اور قلبِ سوزاں میں ‏ ‏ یہ مے گرنے میں کیوں آخر دھواں اُٹھتا ہے ساغر سے

ازل سے ان رگوں میں اور تمناؤں میں جو کچھ تھے
وہ رشتے کٹ گئے دم بھر میں اک تحریکِ خنجر سے

نتیجہ ایک ہے دیرانگی تعبیر ہے جس کی
خدا جانے اُٹھا بستر کہ میں اٹھا ہوں بستر سے

زمانہ جن کے سائے سے حذر کرتا ہے ڈرتا ہے
وہ سارے نخلِ غم سینچے گئے ہیں دیدۂ تر سے

سوائے الفتِ دل کس پہ ڈالوں بارِ خوں ثاقب
نہ مجھکو دشمنی بازوئے قاتل سے نہ خنجر سے

۴-۲- اکتوبر ۱۹۲۵ء

قہقہے ہم نے سُنے دنیا میں اور فریاد بھی
ایک ہی رستے سے گزرے شاد بھی ناشاد بھی

نام کو عشرت نہیں اور کاروانِ غم ہزار
اک یہی دل ہے جو ہے آباد بھی برباد بھی

جوششِ گریہ سے پھندے پڑ رہے ہیں حلق میں
میں اسیرِ دام ہوں تو قید ہے فریاد بھی

صبحِ محشر کا سماں ہے ہو گئے اپنے بھی غیر
اُف رے بیہوشی کہ میں بھولا ہوں دل کی یاد بھی

ایک میری گردنِ لاغر کے دشمن سیکڑوں
تیغِ آتشبار بھی ہے خنجر فولاد بھی

رنگ تصویروں میں کیا ٹھہرے کہ دنیا ہے سراب
مٹ گئی عالم سے شکلِ مانی و بہزاد بھی

آہنی قیدیں تو کٹ جانے کے قابل تھیں مگر
عشق کی بیڑی سے شل ہیں بازوئے حداد بھی

غم بھی تھا گوشہ نشیں فرقت کی شب تھی مُہیب
لاکھ چاہا پر نہ نکلی دل سے اک فریاد بھی

کیوں لگا دی آگ میرے دل میں او کافر نژاد
اک تمنا کیا اسی میں تھی خدا کی یاد بھی

آشیاں جس شاخ پر تھا ڈھونڈتے ہیں اس کو لوگ
ہو گیا پرسش کے قابل خانہ برباد بھی

ایک مدت تک رہا عالم میں ذکرِ اشک و آہ
عشق کے ہاتھوں تھما یہ نقشِ آب و باد بھی

داورِ حشر ایک میں ہی نامرادِ دہر ہوں
ہاتھ پھیلائے ہوں دے مجھ بینوا کی داد بھی

تنگیِ دل کے سبب یہ بزم افروز جمال
ایک میری یاد کیا بھولے خدا کی یاد بھی

سب نے جانا حالِ دل وہ پاس ہوں یا دور ہوں
اس کا شاہد میں بھی ہوں ثاقب مری فریاد بھی

۱۹- نومبر ۱۹۲۶ء

سوائے رحمتِ رب کچھ نہیں ہے
بہت کچھ تھا مگر اب کچھ نہیں ہے

جہاں میں ہوں مگر کیا جانئے کیوں
مجھے دنیا سے مطلب کچھ نہیں ہے

یہ وقتِ نزع ہے کیا نذر دوں میں
اب آئے ہو یہاں جب کچھ نہیں ہے

اندھیرے میں وہ سوجھی ہے نہ سوجھی
تری شب ہے مری شب کچھ نہیں ہے

فقط تقدیر کی کایا پلٹ ہے
مناسب اور انسب کچھ نہیں ہے

نہ پوچھو دل سے اُسکی راہ کا حال
سوائے عشق مذہب کچھ نہیں ہے

طلسمِ دل نہ سمجھا آج تک میں
طلب ہے اور مطلب کچھ نہیں ہے

نہو گر شامِ ہجراں کے برابر
تو پھر وصل اک شب کچھ نہیں ہے

پسِ دل اب کہاں آبادیِ دہر
جو سب کچھ تھا وہی سب کچھ نہیں ہے

خدا کا واسطہ کیا دو رہا سے میں
جہاں میں جس کا مذہب کچھ نہیں ہے

چمن تھا جب چمن، تھا آشیاں بھی،
وہیں تھا میں جہاں اب کچھ نہیں ہے

مُحصّل نظمِ ثاقبؔ کا نہ پوچھو
فقط لفظیں ہیں مطلب کچھ نہیں ہے

۲۱- مارچ ۱۹۲۸ء

یہ بصارت ہے کہ دل نے کر دیا اندھا مجھے
سامنے ہے اور نظر آتا نہیں پردا مجھے

رو گئی شبنم باغ میں تو اُسنے دیکھا تھا مجھے
ہنس دیا غنچہ چمن میں ہو نہو بھولا مجھے

یہ جفا ہے یا وفا تو ہی ذرا بتلا مجھے
اک جہاں تجھکو برا کہتا ہے اور اچھا مجھے

ایک سے دو ہوکے ہم نے شامِ فرقت کاٹ لی — دل کو سمجھایا کیا میں دل نے سمجھایا مجھے

مدتیں گزریں کہ ہوں آئینۂ عبرت نما — اک زمانہ کہہ رہا ہے دیکھکر دنیا مجھے

دن تو نکلا ہے مگر مجھکو نظر آتا نہیں — رات جو دل نے کہا تھا اب وہ یاد آیا مجھے

الوداع اے بزمِ الفت اے گلستاں الفراق — پھول کو گلچیں نے اور صیاد نے دیکھا مجھے

لاغری سے گلشنِ عالم کا کانٹا جانکر — اپنے دامن میں جگہ دینے لگا صحرا مجھے

دیر تک اپنے عشق کی امداد سے پہونچا ہوں میں — راہ والوں نے تو رستا بھی نہ بتلایا مجھے

ٹکڑے ٹکڑے کر دیا مجھکو نگاہِ ناز نے — عقدۂ لاحل سمجھکر حسن نے کھولا مجھے

پھول خوش ہیں اپنی عادت پر زرا کہہ دیجیے — دوسروں کے حال پر ہنسنا نہیں آتا مجھے

گیسوؤں نے جال اپنا تنگ نئے دھر ہیں — ایسا پھیلایا کہ مل سکتا نہیں رستا مجھے

حرفِ وصل آیا زباں پر ہاں خطا کی عفو کر — خواب تھا دیکھا ہوا جو پھر نظر آیا مجھے

جام پر خم ہو رہے ہیں میری صورت دیکھکر — دل کا نازک جانتے ہیں شیشۂ مینا مجھے

حادثاتِ غم سما سکتے تھے ظرفِ تنگ میں — تنگ جب دنیا ہوئی آخر تو بتلایا مجھے

ریزہ ریزہ ہو رہا ہوں صورتِ اوراقِ گل — پھر بھی کانٹا جانتا ہے گلشنِ دنیا مجھے

آج جو کچھ ہو رہا ہے اسکو ہونے دے یونہی — مشکلیں پڑ جائینگی کل یا تجھی کو یا مجھے

خاک اڑانا اور رونا دونوں ہی قسمت میں ہیں
چاہے صحرا کوئی کہدے یا کہے دریا مجھے

ہے گلہ میرا کہ تو نے ساتھ چھوڑا کس لئے
دل کا شکوہ ہے کہ تو نے کس لیے کھویا مجھے

ہو گئے برسوں کہ آنکھوں کی کھٹک جاتی نہیں
جب کوئی تنکا اڑا گھر اپنا یاد آیا مجھے

شکوۂ سنگِ حوادث مجھ سے ہونے کا نہیں
شکر ہے ثاقبؔ کہ گردوں کچھ نہ کچھ سمجھا مجھے

۱۴۔ اگست ۱۹۲۳ء

اک نقش ہے قدرت کا یا صورتِ زیبا ہے
آئینہ ادھر کو ہے کیا جانئے ادھر کیا ہے

حالت مرے زخموں کی سننے میں مزہ کیا ہے
اسکو وہی سمجھینگے جن لوگوں نے دیکھا ہے

اشکوں کا یہ طوفاں ہے خوناب مرے دل کا
بھر لیجئے اک چلّو، بہتا ہوا دریا ہے

کیا جھک کے اٹھاتا ہے بارِ غم و حسرت کو
اے راہرو آگے بڑھ دنیا میں دھرا کیا ہے

ہے طور یہ اک خلوت بجلی کی تجلی ہیں
ہشیار سرک جائیں سنتے ہیں کہ پردا ہے

وہ حسنِ تمنا کش مغرور رہو تم جس پر
تم نے تو سنا ہوگا ان آنکھوں نے دیکھا ہے

کیا جانئے بسمل کی ہے کس نے وہی مجرم ہے
میں ہوں کہ تڑپتا ہوں دل ہے کہ دھڑکتا ہے

رازِ غمِ دل کیونکر اب تک رہا پوشیدہ
ناسور ہزاروں ہیں جن زخم ہے رستا ہے

کس جلوے پہ مرتے ہیں ہم سے نہ کوئی پوچھے — پہچان نہیں سکتے لیکن کبھی دیکھا ہے
جنت ہے یہی دنیا ثاقبؔ جو قناعت ہو
جس شاخ میں سایہ ہو سمجھو وہی طوبیٰ ہے

۱۹۔ ستمبر ۱۹۱۶ء

ہزار پھول لیے موسم بہار آئے — جو دل ہو سوکھے کانٹا تو کیا قرار آئے
جواب لیکے پھری شکر نزع کی ہچکی — وہ اب پکارتے ہیں ہم جنھیں پکار آئے
سلجھ سکیں نہ مری مشکلیں مگر دیکھا — الجھ گئے تھے جو گیسو انھیں سنوار آئے
فلک کو دیکھکے ہنستے یہ گل تو اچھا تھا — جو ابر آئے وہ گلشن پہ اشکبار آئے
بہت سے یاد ہیں محفل کے بیٹھنے والے — کبھی تو بھول کے کوئی سر مزار آئے
نہیں ہے غنچۂ دل کی شگفتگی ممکن — ہزار بار اگر موسم بہار آئے
یہ بے مروتیاں دیکھئے کہ لب ہلے — جو پاس تھے ہم انھیں دور تک پکار آئے
جواب مل تو گیا گو وہ دلشکن ہی سہی — یہی صدا مرے مالک پھر ایکبار آئے
اندھیری رات تھی اچھا کیا جو اے ثاقبؔ
چراغ لے کے سوئے ظلمت مزار آئے

۱۴-جولائی ۱۹۲۷ء

رو رہا تھا میں بھری برسات تھی — حال کیسا کھلتا اندھیری رات تھی

میرے نالوں سے ہے برہم باغباں — یہ خفا ہونے کی کوئی بات تھی

دن نہیں دیکھا سوائے شامِ ہجر — زندگی بھر میں یہی اک رات تھی

نالہ و آہ و فغاں سے بڑھ گئی — ورنہ الفت اک ذرا سی بات تھی

حشر تک لایا جہاں سے دردِ دل — کس کو دیتا کیا کوئی سوغات تھی

بند کیں آنکھیں کہ دیکھوں خوابِ صبح — کھول کر جب آنکھ دیکھا رات تھی

اے صبا غنچوں نے ہنس کر کیا کہا — انکا قصہ تھا کہ میری بات تھی

اللہ اللہ وحدتِ شامِ فراق — ایک میری ایک اسکی ذات تھی

آپ ہی گن دیں مصائب ہجر کے — یوں تو کہنے کے لئے اک رات تھی

ہچکیوں سے رازِ الفت کھل گیا — آگئی منہ پر جو دل میں بات تھی

شمعِ مرقد تجھ سے شکوہ ہے مجھے — میرے گھر میں بھی اندھیری رات تھی

کچھ نہ کچھ ثاقب نے پیدا کر لیا — یہ زمیں تو دشمنِ ابیات تھی

۱۷-ماہ ستمبر ۱۹۲۷ء

جھکا یا سامنے آ ہو نکے سر ہر شمعِ محفل نے | زمانے بھر میں سناٹا سا پیدا کر دیا دل نے
وہی دل قیس کا جس میں اک دنیا سمائی تھی | اسی ساغر کو اک دن بھر دیا لیلیٰ کی محمل نے
نہ دا دیتے تھے باہم راستے حسن و محبت کے | بغیر آنکھوں کے پہچانا یونہی منزل کو منزل نے
مرا دل ہی فقط نقشِ تصور کا نہیں مجرم | تری تصویر کھینچی آسماں پر ماہِ کامل نے
کبھی اُٹھا کبھی بیٹھا امید و یاس کے ہاتھوں | بڑی مشکل سے نامِ عشق کو اونچا کیا دل نے
یہ مرگِ ناگہانی جو مجھے آئی عجب شے تھی | زمانے کو رلایا عمرِ لاحاصل کے حاصل نے

میں اس ایذا رسانی پر بھی ممنونِ عنایت ہوں
نباہا ساتھ برسوں قیدِ زنداں میں سلاسل نے

۲۹ مئی ۱۹۳۷ء

بہا میرا لہو ہی سبز کشتِ آسماں پھر بھی | مٹا ہیں اور برہم ہے مزاجِ باغباں پھر بھی
قفس میں نغمۂ مطرب کہاں میں تو یہ کہتا تھا | کوئی بتلائے دیکھو گا بہارِ بوستاں پھر بھی
نہیں معلوم کیا دلچسپیاں ہیں بزمِ عالم میں | اٹھایا جا رہا ہوں میں مگر جاتا ہوں یہاں پھر بھی
کوئی ہنگامِ صبحِ وصل سمجھا دے موذن کو | شبِ وصلت کہاں آ جائیگا وقتِ اذاں پھر بھی
قدم کو یہ زباں کی چال آئی ہے نہ آئیگی | چلا کی عمر بھر لیکن نہیں بدلا مکاں پھر بھی

غلامی کے لئے کیوں لے چلا یوسف سے گوہر کو
دہانِ چاہ کی آواز ہے اے کاروان پھر بھی

وفورِ ظلم سے شک ہو رہا ہے میری الفت میں
وہ کہتے ہیں کہ مشکل ہے میں کہتا ہوں کہ ہاں پھر بھی

شناسائی دل گم ہے تو کیا صورت نمائی میں
ہزاروں ہا دیکھا بھولتا ہے پاسباں پھر بھی

نہ دل ہے اب سر باقی ہا پھر اسکے کیا معنی
کوئی کہتا تھا ہوگا عاشقوں کا امتحاں پھر بھی

وہ جو آگے گئے آنکھوں سے اوجھل ہو نہیں سکتے
بہت منھ دھو چکا آگے ہے گرد کارواں پھر بھی

کہیں مجھ سے زیادہ میرا دشمن مبتلا نکلا
مری گردش مٹی لیکن نہ ٹھہرا آسماں پھر بھی

نہونا اور ہونا ایک تھا چشمِ عداوت میں
نگاہوں میں کھٹکتا ہے مقامِ آشیاں پھر بھی

چمن تھا دو جزو کا نام یعنی ایک گل اک میں
کھلا میری اسیری سے کہ آئیگی خزاں پھر بھی

متاعِ فہم ہے کمیاب اہلِ دہر میں **ثاقب**
مگر مل جائینگے محفل میں تیرے قدرداں پھر بھی

۱۵- دسمبر ۱۹۳۰ء

غنچہ و گل ہیں یہ دو مہمان ہنستے بولتے
دیکھتے ہیں ہم خدا کی شان ہنستے بولتے

آپ بھی ہم سے کسی عنوان ہنستے بولتے
کیا نہیں انسان سے انسان ہنستے بولتے

ہم سخن تھے وہ تو نکلی جان ہنستے بولتے
خیر رخصت ہو گیا مہمان ہنستے بولتے

توبہ توبہ چشمِ ساقی اور وہ دورِ شراب　　رو رہا ہوں کھو چکا ایمان ہنستے بولتے

راہِ آزادی کھلی ہوتی تو ہم سے خوش مذاق　　دل سے پیدا کر کے سو عنوان ہنستے بولتے

وہ سرِ بالیں تھے وقتِ نزع دل تھا شادکام　　یہ بھی مشکل ہو گئی آسان ہنستے بولتے

خندۂ گل دیکھ اور سن نغمہائے عندلیب　　غم غلط ہوتا ہے میری جان ہنستے بولتے

پھول شبنم سے نہا کے صبح ہوتے چل بسے　　اور کیا اک رات کے مہمان ہنستے بولتے

مرنے والا ہوں مگر دم بھر کو جینے کے لئے　　دل میں آجاتے ہیں کچھ ارمان ہنستے بولتے

حسن کی وہ صورتِ زیبا ہے جس کو دیکھ کر　　دم بخود ہو جاتے ہیں انسان ہنستے بولتے

دل ہی پابندِ الم تھا ورنہ بزمِ عیش میں　　ہم تری خاطر سے تا امکان ہنستے بولتے

ختم کی رو رو کے ہم نے داستانِ زندگی　　کیا سرائے دہر کے مہمان ہنستے بولتے

بادۂ گلگوں تھا **ثاقب** کلفتِ غم کا علاج
کیفِ بدمستی میں اے نادان ہنستے بولتے

۱۴۔ نومبر ۱۹۲۶ء

یہ آہِ سرد وہ در ایسی ہوئی عدو میری　　حباب ہو گئی آخر کو آبرو میری

نہ اپنی غرض غرضی ہے نہ ہے شکایتِ دوست　　ہے عشق و حسن کے آئین گفتگو میری

کوئی نکلنے نہ دے گا زمیں ہو کہ فلک — زمانے بھر کے مقابل ہے آرزو میری

فنا کے بعد میں دیتا نہیں کسی کو جواب — صفت تھی آپکی جواب ہوئی وہ خو میری

زباں ہلے نہ ہلے دل ہلے تو کام چلے — یہ زلزلہ ہو تو آ جائے گفتگو میری

بھلا دیا مجھے تو نے مجھے میں کھو بیٹھا — نہ میں ترا ہوا اے زندگی نہ تو میری

مجھے زمانے سے شکوہ نہیں کہ بحث ہے یہ — سمجھنے والے سمجھتے ہیں گفتگو میری

مرے کریم مری شرم حشر میں رکھ لے — عرق کے ساتھ ٹپکتی ہے آبرو میری

یہ ایک وادیٔ پرخارِ عشق تھی ثاقب
الجھ کے رہ گئی ہر دل میں گفتگو میری

۱۸- دسمبر ۱۹۳ء

لہرائے دل کی طرح گلستاں کبھی کبھی — میری طرح جو ابر ہو گریاں کبھی کبھی

بے شانہ اپنی زلف کو چھوڑا نہ کیجئے — میں دیکھتا ہوں خوابِ پریشاں کبھی کبھی

طولِ شبِ فراق سے گھبرا کے مثلِ صبح — راتوں کو پھاڑتا ہوں گریباں کبھی کبھی

لیتا ہوں کروٹیں جو وہ آتے ہیں قبر پر — ممنونِ روح ہے تنِ بیجاں کبھی کبھی

رونے کو پوچھتے ہو تو آنکھیں ہیں سامنے — ہنسنے کو پوچھتے ہو تو جی ہاں کبھی کبھی

دم لینے دو مجھے کہ تحمل کی تاب ہو — بدلو وصال سے شبِ ہجراں کبھی کبھی

جنسِ طرب ہے میکدۂ دہر میں قلیل — ہوتا ہے انبساط کا ساماں کبھی کبھی

اک عمر کاٹ دی ہے سوادِ گناہ میں — دھوتا ہوں شب کو بیٹھ کے داماں کبھی کبھی

یہ کیا کہ ہر گھڑی ہو برائی کا ذوقِ شوق — نفرت نہ ہو تو کیجئے احساں کبھی کبھی

دم گھٹ رہا ہے پھر شبِ تاریکِ ہجر میں — کرتے رہو لحد پہ چراغاں کبھی کبھی

پہلو میں دل اگر ہو تو پھر مطمئن نہ بیٹھ — بجھتی ہے شمع بھی تہِ داماں کبھی کبھی

اچھا نہیں ہے ذائقۂ موت کا دوام — مہماں ہو مری شبِ ہجراں کبھی کبھی

نازاں نہ ہو کہ محفلِ ہستی میں سازِ عیش
ہوتا ہے بارِ خاطرِ انساں کبھی کبھی

یکم نومبر ۱۹۳۲ء

بلائے جاں ہو شبِ غم بسر نہیں ہوتی — سوائے صبحِ تمنا سحر نہیں ہوتی

پسِ فنا میں اٹھا اتنا ہوشیاری سے — ہزار شانہ ہلاؤ خبر نہیں ہوتی

تمام عمر ارادہ رہا کہ کہہ ڈالوں — حکایتِ شبِ غم مختصر نہیں ہوتی

یہی ہو وقتِ اذاں صبحِ حشر ہو نزدیک — خبر کرو انھیں جن کو خبر نہیں ہوتی

فراقِ دیدہ کی آنکھوں میں ہو جہاں اندھیر ظہورِ صبح ہے لیکن سحر نہیں ہوتی
عدو سے شمعِ لحد ہیں نسیم ہو کہ صبا
کسی کی آہ کبھی بے اثر نہیں ہوتی

۹- دسمبر ۱۹۳۳ء

دلِ غمناک ایسا ہو کہ درد ایجاد کرتا ہے زمانہ رو رہا ہو یوں کوئی فریاد کرتا ہے
جہاں میں کوئی شے میں ہوں تو موقع ہو شکایت کا نہ کوئی بھولتا ہو اور نہ کوئی یاد کرتا ہے
یہ سب احباب تھے جو ہٹ گئے میرے نشیمن سے چمن کا تنکا تنکا خاطرِ صیاد کرتا ہے
تعجب ہو کہ تنکے کو پہاڑ اپنا عدو سمجھے رگِ گردن کا شکوہ خنجرِ فولاد کرتا ہے
مرے آنسو کا گرنا ایک دفتر ہے مصائب کا
ستارہ ٹوٹتا ہے جب تو دل کو یاد کرتا ہے

۱۴- فروری ۱۹۱۷ء

حسن کی ایک فصل ہو عشق کا ایک باب ہے دیکھ چکے ہیں ہم اسے دہر نما کتاب ہے
رسم و رہ قدیم ہے شرعِ صنم نئی نہیں جسمیں وفا گناہ ہو راحتِ دل عذاب ہے
راہ بری نہیں ہو چل سیر میں کیا مضائقہ سارے جہاں کو دیکھ ڈال پر یہ سمجھ کہ خواب ہے

عقلِ حقیقت آشنا اور ہے قلب اور ہے　　عشق نہیں ہے ضعف ہے حسن نہیں شباب ہے

طاقتِ دید ہو تو خیر ورنہ وصال کچھ نہیں　　جلوۂ طور سے کھلا حسن خود اک نقاب ہے

شکر گزارِ درد ہوں دل کی خبر پہنچ گئی　　تو جو نہیں نہیں سہی نالہ تو باریاب ہے

اک کفِ خاک کی بساط کیا جو ہو راہِ سیل میں
جب سے بہے ہیں اشکِ غم خانۂ دل خراب ہے

۲۵- فروری ۱۹۲۳ء

کہیں شانے سے کارِ گیسوئے برہم نکلتا ہے　　ہزاروں پیچ پڑتے ہیں اگر اک خم نکلتا ہے

چلو گردن جھکا کر لاکھ پھر بھی دم نکلتا ہے　　کہیں سیدھی روش سے آسماں کا خم نکلتا ہے

چٹکنے کی صدا کے بعد یہ کیسی شمیم آئی　　چلو دیکھیں کسی غنچے کا شاید دم نکلتا ہے

مقابل ہے غرورِ حسن سے امید عاشق کی　　نہ وہ گھر سے نکلتے ہیں نہ میرا دم نکلتا ہے

غنیمت ہے جو دو آنسو بہائے شمع نے **ثاقب**
کہاں دنیا میں کوئی ہم مذاقِ غم نکلتا ہے

۴- اگست ۱۹۱۴ء

خون کی بوند آج سوئے دیدۂ تر آ گئی　　دل میں تھی جو بات وہ پردے سے باہر آ گئی

سالِ اوّل جس طرح گزرا وہ کہنے کا نہیں — پھر سنا ہے باغ میں فصلِ گُل تر آ گئی

ہنسنے والے خوش ہیں اور رونیوالا مر گیا — جو بلا غیروں کی تھی آخر مرے سر آ گئی

یا الٰہی کون سی بجلی گری تھی باغ میں — جو نشیمن سے سرک کر میرے دل پر آ گئی

کٹ گئے دشمن کہ میرا قتل کچھ آساں نہ تھا

شہرگِ جانِ عدو بھی زیرِ خنجر آ گئی

۴- فروری ۱۹۱۸ء

رفتہ رفتہ زخم کے پردے ہیں غم کے گھر بنے — کل جو روزن دل میں تھے وہ آج بڑھکر در بنے

جانبری ہو عشق سے ممکن موافق ہو جو دل — ہاں مگر آپس میں جھگڑا ہو تو پھر کیونکر بنے

ظالموں کے ہاتھ اپنی ہی تواضع سے اُٹھے — کیوں سرِ تسلیم خم ہو کس لئے خنجر بنے

غیر کے اسبابِ زینت اپنی جانکاہی سے ہیں — لاکھ آنسو برسے ٹپکیں تو اک گوہر بنے

مجھپہ جو گزری گلِ صد برگ نے سب کہدیا

ایک دل کی داستاں اتنی کہ سو دفتر بنے

۹- فروری ۱۹۱۸ء

دل سے جھگڑا کس لئے بیکار پیدا کیجئے — توڑ کر شیشے کو کیوں تلوار پیدا کیجئے

چاہتے ہیں ہم اگر بس ہو تو اسکی راہ میں کھوئیے سو بار دل سو بار پیدا کیجئے

میں تو ہوں مارا ہوا دل کا، اگر شک ہو تو آپ اور اسی صورت کا اک بیمار پیدا کیجئے

لوگ کہتے ہیں علاجِ خفتہ بختی سہل ہے پھر کہاں سے طالعِ بیدار پیدا کیجئے

آئینے کو چھوڑیئے فرمائیے دل پر نظر

سنگ میں کیوں صورتِ گلزار پیدا کیجئے

۱۷- مارچ ۱۹۱۹ء

پہلے تو معرفت نہ تھی یوسف سے چاہ کی یہ کس ہوا نے حُسن کی کشتی تباہ کی

ہر روز بڑھتا جاتا ہے محشر کا فاصلہ امید گاہ ہو جو دلِ دادخواہ کی

چشم پر آب ہر مرے آگے جہانِ عشق ڈوبی ہوئی ہر اشکو میں طاقت نگاہ کی

صبحِ ازل سے تف ہوں وادیِ عشق میں ابتک تو انتہا نہیں معلوم راہ کی

صبحِ وصال دور تو اتنی نہیں مگر

راتیں ہیں بیچ میں تری زلفِ سیاہ کی

۱۳- فروری ۱۹۲۰ء

مانا کہ بہت کم ہوں ہر حاضر و غائب سے نالے تو زیادہ ہیں دنیا کے مصائب سے

شاید وہ سیکاری شادی کی جھلک دیدے — کچھ قطرۂ خوں ٹپکے ہیں دیدۂ تائب سے
محشر میں سہارا دے رحمت تو میں کچھ ڈالوں — خواہانِ ہنر کیوں ہو پابندِ مصائب سے
کاوش میں ہے دل جس سے سازش بھی اسی سے ہے — یہ گوشت کا ٹکڑا ہے دنیا کے عجائب سے

بیوجہ میں جینے سے بیزار نہیں ثاقب
مرنے ہی میں چھٹکارا ہے قیدِ مصائب سے

۱۱- اکتوبر ۱۹۰۸ء

مرض وہ ہے کہ تنہا آپکا رنجور رہتا ہے — شفا کیسی خیالِ عافیت بھی دور رہتا ہے
مرا دل کوئی کیوں توڑے کہ یہ ہے بیستِ مرا الفت — وہ شیشہ ہے جو خود نشے میں اپنے چور رہتا ہے
دعا کرتا ہے کس سے اک ذرا آواز کم کر دے — صدائیں جسکو تو دیتا ہے کیا وہ دور رہتا ہے

مریضانِ شبِ فرقت کی تسکیں کے لئے ثاقب
فلک کے پاس وقتِ صبح کچھ کافور رہتا ہے

۱۴- مارچ ۱۹۰۹ء

جتنے تارے تھے فلک پر صبح تک جاتے رہے — بس مرے آنسو سحر کے ساتھ لہراتے رہے
شامِ غم میری سیہ تھی اور طولانی بھی تھی — گیسوؤں کا اسمیں کیا بگڑا جو بل کھاتے رہے

شاخِ گل کے بیچ میں ہیں بس یہی سمجھا کئے　ہم قفس کی تیلیوں سے دل کو بہلاتے رہے

دیر پا ہے کس قدر شاداب حسینوں کا شباب
عمر بھر اپنی جوانی کی قسم کھاتے رہے

۱۸- نومبر ۱۹۱۷ء

ہر گھڑی تاریکیِ شامِ بلا سے جنگ ہے　میرے چہرے کا جبھی تو صبح کا سا رنگ ہے

جب سے اس دورِ فلک کے بس میں عمریں ٹھہر آئیں　پھر بھی سنتا ہوں زمانہ کئی ڈھنگ ہے

چپ رہ محشر میں کہہ بھی حالِ گذشتہ انتہا　مٹ چکا جب میں تو پھر کیوں فکرِ نام و ننگ ہے

دیدۂ خونبارِ بلبل پرنا سمجھ مجھے　لوگ کہتے ہیں کہ آنکھوں میں گلوں کا رنگ ہے

۲۴- فروری ۱۹۲۱ء

دل کے قصے کہاں نہیں ہوتے　ہاں وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے

ایک ہی طرح سے ہیں دیدۂ ہم　غم کے مارے کہاں نہیں ہوتے

جو ہے خوشدل ہے ایک میرے سوا　کیا کہیں آسمان نہیں ہوتے

میری پیری سے کیوں تعجب ہے　رنج والے جوان نہیں ہوتے

۲- نومبر ۱۹۲۱ء

مری فنا میں بقا تھی انکی عجب طرح سے بسر ہوی ہے
کہ ایک دو دن کی زندگی بھی ادھر سے ہٹکر اُدھر ہوی ہے

کرشمۂ الفت و محبت سے برقِ ہستی کو کیا علاقہ
اُدھر تپا دل کا گم ہوا ہے جدھر تمھاری نظر ہوی ہے

جدا ہے ظاہر سے حالِ باطن زرا تامل سے کام لینا
دھواں اٹھا ہے دل و جگر سے اگر مری آنکھ تر ہوی ہے

ہے نشۂ حسن مے سے بڑھکر عبث شکایت ہے سکشونکی
جلا نشیمن مگر گلوں میں کسی کو کچھ بھی خبر ہوی ہے

۲-اپریل ۱۹۱۴ء

غیر ونکا یہاں تیرے سوا کام نہیں ہے | دل ہے یہ کوئی رہگزرِ عام نہیں ہے
کیا ہو جو نظر آتے ہیں تارے مجھے اے دل | کہتا ہو زمانہ کہ ابھی شام نہیں ہے
یہ عیبِ محبت کبھی ہوگا مگر اب تو | اس دل کے سوا ایک بھی بدنام نہیں ہے
دل ہو مرا یا عشق ہو تم ہو کہ شبِ غم | کس کس پہ مرے خون کا الزام نہیں ہے

۲۹-مارچ ۱۹۲۵ء

مشکل تبدیلِ دورِ چرخ آساں ہو گئی جب کٹا کوئی گلا ابن عید قرباں ہو گئی

ہم نے دیکھا تھا کہ دل معمورۂ امید تھا اب یہ سنتے ہیں کہ وہ بستی بھی ویراں ہو گئی

ابرِ باراں کا پسینا اور مرے دل کا لہو خیر ان دونوں سے تعمیرِ گلستاں ہو گئی

ایک دم تھا جو کسی صورت نکلتا ہی نہ تھا عشق کے ہاتھوں سے یہ مشکل بھی آساں ہو گئی

۳- ستمبر سنہ ۱۹۰۷ء

عاشق ہیں ازل سے مرے اجڑے ہوئے گھر کی وہ رات جو بیزار رہی صورت سے سحر کی

آہیں بھی مری آنکھ کی طرح دشمنِ جاں ہیں کیا دم کا بھروسا جو ہوا بھی ہو اُدھر کی

کیا فائدہ جلنے میں کٹی بھی جو شبِ غم مقتول ہر اک شمع ہے دامانِ سحر کی

۱۱- مارچ سنہ ۱۹۲۰ء

تماشا چشمِ دل سے اہلِ عرفاں دیکھ ہی لینگے کسی پردے میں ہو تصویرِ جاناں دیکھ ہی لینگے

اگر بڑھتی رہی عمرِ انقلابِ دہر کی یونہی کبھی اس چشمِ گریاں کو بھی خنداں دیکھ ہی لینگے

چلا ہوں تیرہ شب میں اُدھر آگے مقدر ہے یہ کیا لازم ہے اس در کے نگہباں دیکھ ہی لینگے

۲۱- جون سنہ ۱۹۱۸ء

دہر خود چرخ کا لوٹا ہوا کاشانہ ہے گھر مرا دہر میں ویرانے میں ویرانہ ہے

چشمِ ساقی پہ نظر پڑکے ہٹی یہ کہکر — ساغروں سے بہت اونچا ہی جو میخانہ ہے
اہلِ عالم کے بہلنے کے لئے میرے بعد — رہگیا ہے وہ زبانوں پہ جو افسانہ ہے

اُسکی رحمت پہ گرے سے پڑتے ہیں عصیاں والے
حشر کا ہمکو ہے اک جلسۂ رندانہ سہے

۲۷- دسمبر ۱۹۲۷ء

شکل اِدھر آئی نظر بس عقل اُدھر لاشے ہوئی — ہوش اُڑا دیتے ہیں دونوں دو بدو یکجا ہوئی
مضحکہ خیزِ جہاں تھی زندگیِ اہلِ عشق — فائدہ کیا بعد مرنیکے اگر ہے ہے ہوئی
تپا تپا دشمنِ جاں تھا تو پایا کیا ثمر — زردیِ رُخ میری اُڑا کر خزاں کی ہے ہوئی
گوئے سبقت لیگیا مظلوم اہلِ ظلم سے — راہ میں تلوار تھی جب میری منزل طے ہوئی

۲- اکتوبر ۱۹۲۶ء

جفا اٹھانیکی عادت پڑے تو کیونکر جائے — ستم سہے مگر اتنے کہاں کہ جی بھر جائے
یہی سمجھ کے جفاؤں کا سلسلہ چھوڑ دو — کہ جسکی موت نہ آئے وہ کس طرح مر جائے
جفا کو منع میں کرتا نہیں کہ عاشق ہوں — مگر نہ یوں کہ ابھی سے دلِ حزیں ڈر جائے
ملا کے دستِ دعا ظرف اک بنایا ہے — لئے ہوں ہاتھ میں کاسہ خدا کرے بھر جائے

۲۹- مئی ۱۹۱۶ء

جو نظر ڈالی جگر کے پار تھی　　زہر میں ڈوبی ہوی تلوار تھی

سو گیا بالائے بستر جاگ کر　　خواب میں قسمت مری بیدار تھی

نزع نے جو آکے فیصل کردیا　　میرے اُنکے بیچ وہی تکرار تھی

۱۴- جنوری ۱۹۲۵ء

حالتِ دل ہزار میں اتنی سقیم ہو گئی　　پھول پہاڑ ہو گیا شمع جحیم ہو گئی

عالمِ عشق میں یہ ہے وسعتِ سرزمینِ غم　　چرخ سے جو بلا چلی دل میں مقیم ہو گئی

۲۳- جون ۱۹۱۳ء

جدائی میں جسکو مٹاتی ہے الفت　　وہ عمر رواں پہلے ہی کٹ گئی ہے

وہی رات میری وہی رات انکی　　کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے

۲۱- مارچ ۱۹۳۲ء

نہیں کچھ آنسوؤں میں نفع قصر جانکے لئے　　مضر یہ سیل ہے گرتے ہوے مکانکے لئے

اُدھر ہے برق ادھر میری تاک میں صیاد　　میں دو طرف سے گھرا ہوں اک آشیانکے لئے

مجھے دکھا کے فلک گاڑ زمیں میں رکھتے ہیں　　نئی زمین بناتے ہیں آسمانکے لئے

۹- جون ۱۹۱۷ء

شہیدِ ناز کی محشر میں آبرو رہ جائے
جراحتوں میں جو رِستا ہوا لہو رہ جائے

فدا علاقۂ الفت پہ طولِ رشتۂ زیست
ہے اپنی موت گوارا مجھے جو تو رہ جائے

یہ جاننا کہ کہیں چھپ رہا ہو، قاتل
جو میرے دل میں تڑپنے کی آرزو رہ جائے

۱۹- اگست ۱۹۱۷ء

یہ نالے ایسے کب آساں ہیں جو ہر دل سے نکلیں گے
جو ڈھونڈو گے تو میرے ہم نوا مشکل سے نکلیں گے

جہاں نے لال کر کے جنکو مٹی میں دبایا ہے
وہ انگارے دہکتے کوچۂ قاتل سے نکلیں گے

مُرادِ دل ملی مر کر، مگر سونا نہیں ملتا
یہ کھٹکا ہے کہ اک دن کوچۂ قاتل سے نکلیں گے

۱۶- نومبر ۱۹۱۵ء

ہر رگ و پے میں کس لئے ایک نئی امنگ ہے
دامنِ آرزو سمٹ، صحنِ زمانہ تنگ ہے

آج کی شب گریگا خون آنکھ سے یا سپہر سے
نالہ و آہ، ہوشیار، چرخ بریں سے جنگ ہے

نرمیِ دل کا ذکر کیا اہلِ ادا و حُسن میں
جسکا جمال تام ہے ایک شرارِ سنگ ہے

۱۷- نومبر ۱۹۱۳ء

دل کو چھوڑا ہوگا کیونکر چشمِ افسوں ساز نے
سیکڑوں گھر چھان ڈالے ہیں نگاہِ ناز نے

نالے اب کرتا ہوں جب دل کا پتا ملتا نہیں   چھپ رہوں کہیں خود نقاب اپنی الٹ دی رازنے
سننے والا رو رہا ہے مر جا لے وقتِ نزع   کچھ کہا شاید مری ڈوبی ہوی آوازنے

۱۵ ستمبر ۱۹۰۹ء

تازہ کیا الفت کا ہر زخم کہن تو نے   کس دل سے کیا نالہ اے مرغِ چمن تو نے
دم بھر کے محبت کا تصویرِ فنا ہوں میں   پہنا دیا جیتے جی اے عشق کفن تو نے
ہمدم دلِ زخمی کی حالت تھی عیاں تجھ پر   چھیڑا ہی قفس میں کیوں ذکرِ چمن تو نے

۶-اپریل ۱۹۱۶ء

قفس میں کچھ پر پرواز کام آ نہ سکے   قریب تھا یہ نشیمن تک اڑ کے جا نہ سکے
دل اپنا خوفِ اسیری سے مطمئن کب تھا   رہے چمن میں مگر آشیاں بنا نہ سکے

دشمنی اُن کی کیا بنائے گی   اگر اللہ مہرباں ہو جائے
اُن کو انکار ہے تو ہونے دو   یا الٰہی نہیں کی ہاں ہو جائے

مطلعِ غزلِ مندرجۂ صفحۂ ۲۳۱

ہوئی صبح، کیا شامِ غم کٹ گئی ہے   خلش دردِ دل کی بہت گھٹ گئی ہے

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

برگشتہ ہوئی دنیا رسم و رہِ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

قفس میں جب سے لیکر قسمتِ ناسازگار آئی
چھری سی لگتی ہے دل پر جب یہ سنتا ہوں بہار آئی

یہ سر اور پائے درباں، وحشتِ دل کا تقاضا تھا
مجھے اس بیکسی پہ خود ہنسی بے اختیار آئی

آنکھوں میں عوض اشک کے لختِ جگر آئے
ہو جائے لہو دل تو کہیں یہ ثمر آئے

کیا جاؤں وہاں میں کہ گیا بھی جو کسی دن
اتنا بھی نہ پوچھا کہ کہاں تھے کدھر آئے

طور کو دیکھوں تو کیا اک قتل گاہِ ہوش ہے
بولتی محفل نے کچھ دیکھا جو یوں خاموش ہے

ماسوا فریاد کے بہلاؤں کس سے اپنا دل
شمع میری بزم کی مدت ہوئی خاموش ہے

فکرِ آسانی برائے امرِ مشکل چاہیئے
غم کی مہمانی تو آسان ہے مگر دل چاہیئے

ظلم کے اظہار میں کرتے ہیں کوشش اہلِ دہر
آگ شمعوں میں لگا دینے کو محفل چاہیئے

جہاں میں قلبِ ذلت کش کی بھی اک شان ہوتی ہے   شبِ فرقت ابھی اک میرے ہی گھر مہمان ہوتی ہے

جفاؤں کے سبب کہتی ہے دنیا سنگدل انکو   ترس کھائیں وہ کیوں کیا عاشقونکے جان ہوتی ہے

دن کے تمام ہوتے ہی جانِ حزیں نکل گئی   جسکی تھی ساری روشنی ہائے وہ شمع جل گئی

مہرِ شباب کا زوال ہو گیا جب تو کیا رہا   گرمیٔ عشق الوداع کیونکہ وہ دھوپ ڈھل گئی

معاذ اللہ دہل جاتے ہیں دل اڑ جاتی ہیں نیندیں   خدا انکو نہ سنوائے کہانی شامِ ہجراں کی

تلاشِ چارہ گر ہے اب برائے درد اے ثاقب   کچھ ایسا درد ہے جسنے مٹا دی فکرِ درماں کی

بقیہ اشعار غزل مندرجہ صفحہ ۸

میرے نالوں کو نہ جان اپنا گلہ اے شامِ غم   زندگی جھلا رہی ہے موت کی تاخیر پر

ایک تو وہ خاک کا تھا دل بلا سے اُڑ گیا   خون کا الزام اسیر ہے نہ انکے تیر پر

دلمیں دو بوندیں لہو کی ہیں گرا اے تیغ زن   ایک دامن پر رہیگی اور اک شمشیر پر

منفردات

ہو کے آب آئینہ اُنکے مقابل نہوا
آگ برسوں ہی پتھر میں مگر دل نہوا

رات کو جب میکشوں کے بیچ میں پیمانہ تھا
اپنا اپنا دل طوافِ شمع میں پروانہ تھا

تمام عمر محبت میں دل کی ختم ہوئی
میں جسکا دوست بنا تھا وہی تو دشمن تھا

وحشت ہوئی مگر کوئی ساماں نہیں رہا
اب جسمیں ہاتھ ہو وہ گریباں نہیں رہا

زمانے کو ہے مشکل سر بسر بے نور ہو جانا
مرے دل کو تو آساں ہی چراغِ طور ہو جانا

اُنکا مقتول بھی تھا کشتۂ تقدیر بھی تھا
وہ بھی نادم تھے خجل ناخنِ تدبیر بھی تھا

صبحِ ازل سے وہ دم جو وقتِ ہجرِ جاں تھا
اتنا بڑا ہمارا میدانِ امتحاں تھا

ہنگامِ نزع جوش کہاں کا سما گیا
اٹھا یہ دل کہ گھٹ کے دم آنکھوں میں آگیا

جو آنکھ ہو تو دیکھئے، نہ پوچھئے کہ کیا کیا
چراغِ بزم ہو گیا، جلا کیا، ہنسا کیا

فسانہ ذبح کا جز خونِ آرزو نہ رہا
چھری گلے پہ چلی تب کہ جب لہو نہ رہا

اس قدر حسرت کشی اچھی نہ تھی
دامنِ دل ایک مقتل ہو گیا

مفیدِ اہلِ عالم ہے بہت کچھ بیحسی دل کی
زمانہ کروٹیں لیگا جو میں تڑپونگا بستر پر

ہٹ گئے پاس آ کے وہ گرد و غبار دیکھکر — رہ گئی بیکسی مری ہٹ کے مزار دیکھکر

دل کی نگاہِ عشق ہو ایسی کچھ اپنے داغ پر — جب نظر آ گیا کہیں ٹوٹ پڑا چراغ پر

رو رہا ہوں چرخِ ظالم کے اشارے دیکھکر — اپنے آنسو یاد آتے ہیں ستارے دیکھکر

جہاں پانی ہوا ہے دل کی ناگفتہ کہانی پر — بہت کچھ ناز ہے مجھکو زبانِ بے زبانی پر

لگی ہے آگ تو سینے سے دل نکال کے پھینک — ادھر بھی لو کو نکلتی ہے ہم کہاں کے پھینک

یہ جادہ ہائے عشق ہیں انھیں کا میں اسیر ہوں — نہ حال پوچھئے مرا لکیر کا فقیر ہوں

چمن میں پھول ہیں یا میں ہوں کوئی غیر نہیں — مگر سکوت رہیگا تو میری خیر نہیں

سوئے گورِ غریباں دیکھتا ہوں بیحواسی میں — چھپی ہیں رونقیں دنیا کی آکر اس اداسی میں

عشق سے چھٹ کر جا ملا حسن کی کائنات میں — دل سے نزاع ہو گئی ایک ذرا سی بات میں

کچھ نہ پوچھو حال اپنا گشتۂ تقدیر ہیں — موت نے کھینچا ہے جسکو ہم وہی تصویر ہیں

ترا گھائل ہے میرا دل میں اپنے دل کا بسمل ہوں — ترا مقتول بھی مجھسے یہ کہتا ہے کہ قاتل ہوں

راستہ کوئی ادھر چل فکرِ بیاضِ نور میں — اب تو سوادِ دشت کے سوا کچھ نہیں کوہِ طور میں

ڈھونڈ نہ جوہرِ بقا بھول کے خاک و آب میں — دیکھ لے چہرہ جہاں آئنہ سراب میں

جو کبھی پہلے تمنا تھی وہ اب دل میں نہیں — مدتیں گزریں کہ لیلیٰ اپنی محمل میں نہیں

حاصل ہوا کچھ بھی اس نفسِ بے ستی میں — اک خواب سا دیکھا تھا بیداریِ ہستی میں

ہر سحر میرا لہو کھاتا ہے دل کے کام میں — ڈالتا ہوں صبح سے روغن چراغِ شام میں

چور ہے پیمانۂ دل کی دوا دے سکتا ہے کون — ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے شیشے کو لے سکتا ہے کون

اسیرِ ظلم ہیں گو آج سخت جالوں میں — ہمارا نام بھی تھا آشیانے والوں میں

قید و آزادی سے کیا مطلب ہے مجھ دلگیر کو — تم نے جو پہنائی ہے پہنے ہوں اس زنجیر کو

حواس جمع نہیں پھر بھی جشن کا یہ اثر — کہ یاد آ گئی بھولی ہوئی خطا مجھکو

ہمتِ اہلِ وفا کے سامنے کیا شانِ کوہ — خونِ تیشہ اک سر کے رنگین ہو گیا دامانِ کوہ

کمی ہے جوشِ مے میں میکشو نکلی ہے جا بلغ آفتاب رکھدے — اتار انگڑائی لیکے شیشہ دونوں میں جامِ نشتر رکھدے

تابِ نظارہ کہاں جو غم کا منظر دیکھیے — حالِ دل دیکھا نہیں جاتا ہے کیونکر دیکھیے

عمر بھر غفلت رہی ہستیِ بے بنیاد سے — اٹھ گئے اک نیند لیکر عالمِ ایجاد سے

وجہِ آزادی ہے دنیا میں گرفتاری مری — دے رہی ہے ساتھ تنہائی میں بیماری مری

غمِ زندگی جا بجا ہو رہا ہے — ارے مرنے والو یہ کیا ہو رہا ہے

ہوں وہ غم دوست کہ راحت سے حیا آتی ہے — نیند آنے کو سمجھتا ہوں قضا آتی ہے

نالے وہ با اثر کئے دل سے زبان سے — تنکے لپٹ کے رونے لگے آشیان سے

بھول کر راہِ وفا کی سمت آ جانا کبھی — جا خدا حافظ مرے دل پھر ادھر آنا کبھی

درد سے اک آہ بھی کرنے نہیں دیتے مجھے — موت ہو آساں مگر مرنے نہیں دیتے مجھے

بلا سے تذکرۂ الفت و وفا نہ رہے — یہی بہت ہے کہ مجھ سے کوئی خفا نہ رہے

سپید بال ہوئے دل کا داغ جلتا ہے — سحر ہوئی یہ ابھی تک چراغ جلتا ہے

حبس سے کیونکر نہ طبعِ نیم جاں برہم رہے — سانس رُوکے ہوں کہ شمعِ زندگی میں دم رہے

مریض ہو تو کس لئے یہ نفرتِ علاج ہے — دلِ حزیں تو خوب ہے مگر برا مزاج ہے

تو اگر چاہے کہ معنیِ محبت جان لے — غور سے دیکھ آئینے کو اور مجھے پہچان لے

کون بتلائے مجھے یہ پوچھنے کی بات ہے — غم نہیں آدھا مگر سنتا ہوں آدھی رات ہے

گتھیاں جو دل میں تھیں ہم نے دکھایا تھا انہیں — ہر گرہ پر سر جھکایا ناخنِ تدبیر نے

وہ زندہ رہ نہیں سکتے فراقِ دل جو سہہ گئے — جہاں خیال آ گیا وہیں تڑپ کے رہ گئے

مکاں منعم کا سونے سے یہ خونِ دل سے بنتا ہے — خس و خاشاک کا گھر بھی بڑی مشکل سے بنتا ہے

بقیہ اشعارِ غزل مندرجہ صفحہ ۶۸

کیا جگر ہم نے بھی آفت طلبی کا پایا — آرزو ہے کہ دل آ جائے کسی پر اپنا

دیکھ لیتا ہوں بگولوں کو جہاں غربت میں — یاد آ جاتا ہے برباد شدہ گھر اپنا

کھو چکا نقدِ جزا مخوش نہو لمبیں ناداں　　　کسی ممنون پہ احسان جتا کر اپنا

عشق بیجاں قدرِ جاناں نے بنایا ثاقب
اینڈنا بھول گئے سرو و صنوبر اپنا

مطلع غزل مندرجہ صفحہ ۳۷

امتحاں کا وقت پھر اے دیدۂ تر آگیا　　　آفتابِ حشر نیزے کے برابر آگیا

بقیہ اشعار غزل مندرجہ صفحہ ۲۲۲

آبِ عذارِ آتشیں دیکھ کے میری آنکھ دیکھ　　　ایک طرف سراب ہے دوسری سمت آب ہے

میٹھا ہو دل لگائے کیوں سبزۂ باغِ دہر سے　　　دیکھ ورق الٹ نہ جائے دفترِ انقلاب ہے

حسنِ سخن سے ہے عیاں جلوۂ وارداتِ نفس
ثاقبِ دل حزیں تری ہر غزل انتخاب ہے

ہر ایک بات میں جب مشقِ لن ترانی تھی　　　ہمارے بیچ میں مفسدِ شبِ جوانی تھی

بڑھائی جس نے تری نیند مجھکو تڑپا کر　　　وہ میری عمرِ گزشتہ نہ تھی کہانی تھی

تضمین بر غزل حضرت میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی مرحوم نور اللہ مرقدہ

۶- فروری ۱۸۹۹ء

داغِ سودائے جنوں اصلاح پر آئینگے کیا
مرہمِ کافور کا پورا اثر پائینگے کیا
تھیلیاں مانع نہیں ہیں ہاتھ کھلوائینگے کیا
دستِ غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

دل کو اندازِ تغافل ہونگے نشتر کب تلک
یہ تجاہل کی روش اللہ اکبر کب تلک
نازِ بیجا پاؤں پر رکھوائیگا سر کب تلک
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
میں کہوں گا حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

چل گئی ترکیبِ مکر و کید اچھا یوں سہی
آ گیا دامِ بلا میں صید اچھا یوں سہی
ہو گئیں آزادیاں ناپید اچھا یوں سہی
گر کیا ناصح نے ہمکو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

اب تو لطفِ زندگی مرنے ہی میں پاتا ہوں میں
مطلبِ دل ہر طرح ظالم کو سمجھاتا ہوں میں
کیا کسی تدبیرِ امکانی سے باز آتا ہوں میں
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

جلوۂ محبوب ہے آٹھوں پہر پیشِ نگاہ　　دل کی از خود رفتگی سے ہے مری حالت تباہ

جمعِ خاطر جب نہ ممکن ہو تو میرا کیا گناہ　　حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ

کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

کشتۂ ناز و ادا شمشیر سے بھاگینگے کیوں　　جو ہدف ہونے میں خوش ہیں تیر سے بھاگینگے کیوں

مرنے والے آفتِ جانگیر سے بھاگینگے کیوں　　خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگینگے کیوں

ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

سرزمینِ لکھنؤ کو بخشئے عزت اسد　　اہلِ دل کی ہے اسی بستی میں جمعیت اسد

بندۂ ثاقب بھی حاضر ہے پئے خدمت اسد　　ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسد

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

ختم شد دفترِ غزلیات

ضمیمہ

مجموعۂ قطعاتِ تاریخ

و

نظم ہائے متفرق

ترانہ سنجی مسند نشینی

۱۳۵۳ھ ہجری

قطعۂ تاریخ در تہنیت حصولِ اختیارات پیش کشِ بارگاہ امارت و جلالت پناہ حضرت راجہ محمد امیر احمد خاں اریکہ آرائے ریاست عالیہ محمود آباد دام اقبالہ

سریر آرائے ریاست ؎ اقتدارِ مسند آرائی مبارک بادا

۱۳۵۳ھ ہجری — ۱۳۵۳ھ ہجری

شکرِ خدا کہ مرغِ چمن، باز در چمن ۔ مستِ سرور و چرخ زناں و نغمہ خواں رسید

بر تختِ خرمی بہ تجمل نشست گل ۔ حکمِ نشاطِ عام، کراں تا کراں رسید

ابرے ز کوہ آمد و آمد گہر نثار ۔ بادے رسید از جہ و عنبر فشاں رسید

آورد بہرِ دیدۂ نرگس نسیمِ صبح ۔ آں بوئے خوش کہ پیشتر از کارواں رسید

بر خاک ریخت گوہرِ شبنم ز آسماں ۔ از خاک شورِ زمزمہ بر آسماں رسید

بہرِ نشاطِ سبزہ و گل، ساز و برگِ عیش — از یُمنِ نو بہار، برغمِ سمِ خزاں رسید

بشگفت از شگفتنِ گل، غنچۂ مُراد — بادِ سحر بکامِ دلِ دوستاں رسید

نمود کلکِ صنع، بر اوراقِ گل رقم — خطِ تمامِ حظ، کہ بگلشن ازاں رسید

شد بسکہ عطر بیز نسیمِ سحرگہی — عالم ہمہ، بمرتبۂ گلستاں رسید

اطفالِ باغ را بجواں بختیِ ازل — عہدِ شباب، چوں بجدِ عنفواں رسید

یلے امیر احمدِؐ من بر سریرِ ملک — چوں مہرِ نیم روز، بسرِ آسماں رسید

بگرفت قصرِ ملک از و جلوۂ شرف — در خانۂ شرف کہ شہِ خاوراں رسید

گشتند شاد کامِ طرب، خاص و عامِ خلق — بخشِ سرور و عیش، بہ پیر و جواں رسید

بالید جانِ عالم و بر رخ دمید رنگ — در قلب تاب آمد و در تن تواں رسید

گلبانگِ تہنیت، ز کراں تا کراں گرفت — نشۂ سرور و سوز، جہاں در جہاں رسید

از خاک رفت شورِ تہنیت، بر آسماں — بر خاک مژدۂ طرب، از آسماں رسید

الحق، کہ از جلال و شرف ہر چہ یافت است — حقیست کاں بمستحقِ ایں و آں رسید

بود آنچہ نغز و طرفہ، زبیرانہ بجز دہی — روزِ ازل بہ بہرۂ ایں نوجواں رسید

ہر جا کہ اسپِ فکر پئے امنِ عام تاخت — بار لسے و فلاح، عناں در عناں رسید

آں کیست جانِ تازہ ازیں مژدہ کو نیافت — اما عدوے ملک، کہ کارش بجاں رسید

فرخندہ باد ملک بشاہ و وزارتش — برآنکہ ملک را بہ تن از وے تواں رسید

شہ را برادرے، کہ بجانش برابر ست — جاں ہمچنانکہ زور بیازو وازاں رسید

بالد بخود ہمی نسق و نظمِ مملکت — سر رشتہ اش چو در کفِ میرِ زماں رسید

ذیشاں امیر حیدر، خانِ فلک نشاں — کز وے نشان و نام بنام و نشاں رسید

کام و دہانِ نطق، بہ شکر گرفتہ اند — تا نامِ نامیش ز دلم بر زباں رسید

منت خدا ے را کہ نظامِ رفاہِ عام — در دستِ نازمایۂ ایں دودماں رسید

ثاقب چو سالِ صدر نشینی ز طبع جست

نقشِ گزیں نشست بجا بر زباں رسید

سنہ ۱۳۵۲ ہجری

دیگر

مسند آرائی ہمایوں با سرور و اوجِ عیش

سنہ ۱۳۵۳ ہجری

بحمد اللہ کہ از تائیدِ بخت و یاریِ طالع — بملکِ کامرانی جلوہ فرما شد امیر احمد

بود فرخ حصولِ اختیاراتِ جہانبانی — چو زینت بخشِ تاج و تختِ آبا شد امیر احمد
ہمی بالد بخود محمود آباد از مسرت ہا — بافضالِ الٰہی حکمراں تا شد امیر احمد
گرفت اوضاعِ ایوانِ حکومت رونقِ دیگر — کہ بر صدرِ ریاست زیب افزا شد امیر احمد

گہر سفتم پئے تاریخِ سالش این چنیں ثاقب
کہ با صد کامگاری مسند آرا شد امیر احمد

سنہ ۱۳۵۳ہجری

دیگر

جلوہ آرائے سریرِ ملک شد عالی اساس

سنہ ۱۳۵۳ہجری

اے آنکہ توئی وارثِ اورنگِ حکومت — اے آنکہ توئی جلوہ دہِ فرِ فریدوں
اکلیلِ سری چوں بسرِ خویش نہادی — از لطفِ خداوندِ جہاں خالقِ بیچوں

ثاقب بدعا طرۂ تاریخ بر آں بست

ایں تاجِ مزین بسرت باد ہمایوں

دعا گوے دولت و اقبال — میرزا ثاقب قزلباش لکھنوی سنہ ۱۳۵۳ھ

تاریخ رسالۂ پارۂ عروض تصنیف لطیف جناب میرزا حاتم علی مہر مرحوم اکبرآبادی

این نامہ کہ پارۂ عروض است — نہ بیست زبحرِ نظم اُردو
ہر سطر بصفحۂ ورق ہیں — ہمچوں برِ رخِ نگار گیسو
تصنیفِ لطیفِ میرزا مہر — کز کلک نمودہ زورِ بازو
در لطفِ کلام، ہچوں ظہیر است — در قوتِ نظم، ہمچو خواجو
این نامہ اگر نگویم اعجاز — نیرنگ بگویمش، کہ جادو

ثاقب بنوشت سالِ طبعش
میزانِ اصولِ نظم، نیکو

۱۳۱۱ھ ہجری

تاریخ کلیات حضرت جنت مآب راجہ امیرالدولہ بہادر متخلص بہ سحر علی اللہ مقامہ

خوشا گلِ تو بہارِ دیوان، زہے کمالِ جمالِ پاکش
کہ از فروغِ تجلّیِ او، شد است گلزارِ نظم خنداں

دو سالِ تاریخ بنیات و زبر بیک مصرعہ بگفتم

دبیرِ معنی نگار و موجد، فصیح و نقادِ فن زبانداں

بنیات ۱۳۰۹ نبگلہ زبر ۱۳۱۰ فارسی

دیگر

خوشا نظامِ کلامِ افصح، محققِ فن، نظیرِ صائب،

ادیبِ کامل، لبیبِ عاقل، بلیغِ دوراں، مثیلِ سحباں

بہ بنیات و زبر بگفتم، دو سالِ ہجری بمصرعِ نو

یگانۂ فن، بعصر عالی، بعقل سعدی، بقدس حساں

بنیات ۱۳۲۰ ہجری زبر ۱۳۲۰ ہجری

دیگر

گلِ رسالۂ سرِ وآدِ سحر دوحۂ علم　　مرادِ طالعِ مسعود و سورِ روح آمد

دمِ سحر دلِ ما راحِ روحِ سال سرِ تو　　کلامِ سحرِ دل آرا سرورِ روح آمد

۱۳۲۰ ہجری

نوٹ۔ سرِ وآد بمعنی کلام منظوم سے راحِ روح نام لکھنے سے از سی لحنِ بار ہی۔

دیگر

سحر ما کو لمعہ سر و ادراطور مراد — در دلم دم کرد ہر مصراع او سحر حلال

مصرع مسعود سال او دلم الہام کرد — مہر طالع مطلع و ہر مصرع سالم حلال

۱۲ ۱۲ ۱ فارسی

دیگر

است خوش [illegible] در گوید سخن این مصرعہ

عہد تحقیق معانی ختم شد بر ذات سحر

این دو تاریخ آمدہ، در مہملات و معجمات

عشق را دم، طور را برق ست کلیات سحر

مہملہ ۱۳۱۰ فارسی معجمہ ۱۳۱۲ فارسی

دیگر

طبع شد کتاب سخن، مہدوی شدہ سن او

چل بہفت صد بشمر، با چہار و سہ صد و بست

صوری ۱۰۶۴ مہدوی

بوے معنوی بدہد، باغِ صوریِ سخنم

ہم ہزار و نہ صد و دو ہم ہزار و سہ صد و بست

معنوی ۱۳۲۰ ہجری

صوری ۱۹۰۲ عیسوی و ۱۳۲۰ ہجری

دیگر

اے خوشا طالعم کہ بر لبِ من — می رود بار بار کلمۂ سحر

بہرِ سالش ز مصرعِ سالم — شد چو انوار بار کلمۂ سحر

گشت دیگر بہ بینات و زبر — گفتنِ چار بار کلمۂ سحر

زبر مصرعہ سالم ۱۳۲۰ ہجری

اعداد زبر و بینات سحر - سین - حا - را

۱۲۰ ۹ ۲۰۱

۳۳۰ × ۴

۱۳۲۰ ہجری

قطعۂ تاریخ طبعِ ثمرۂ فصاحت از طبعِ نقاد و ذہنِ وقادِ حضرت جمیلِ سہسوانی مدظلہ

حبذا نظمے کہ رباید دل از جذبِ جمال ۔۔۔ چوں حسینانِ قمر چہرہ و بتانِ بے عدیل

غرفۂ الفاظ را با حورِ معنی جلوہ داد ۔۔۔ از جناں اینک مثال آورد فکرِ بے مثیل

عجز دارد از ستایش وسعتِ ارکانِ بسیط ۔۔۔ قاصر آمد ز امتدادِ وصفِ آں بحرِ طویل

ایں چنیں تخمیسِ تاسیسِ بلاغت می کند ۔۔۔ خمسۂ دستِ رقم در مدحتش آمد کلیل

معنیِ جاں بخشِ او اندر جہاں فرماں دہد ۔۔۔ باز آید در تنِ بیجانِ خود روحِ قتیل

حبِّ احبابِ وطن را از فضائے دل برد ۔۔۔ گر فتد بر حسنِ نظمش چشمِ ابنائے سبیل

شاہدِ الفاظِ او از شاہدانِ گل فزوں ۔۔۔ تاجدارانِ چمن از ساز و برگِ او ذلیل

فکرِ آں عالیست کز پروین بگیرد خوشہ اش ۔۔۔ واں سخن شیریں ست کو دارد نشاں از زنجبیل (سلسبیل)

ثاقبا چوں دُر بسلکِ نظم تاریخش درآمد

شد جمال افروزِ معنی فکرِ دلچسپِ جمیل

سنہ ۱۳۲۴ ہجری

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات سید طہر حسن مرحوم ہمشیرزادہ نواب نصیر الممالک مرحوم بمقام سفارتخانۂ ایران کلکتہ

نہال بوستانِ جاہ و اقبال ۔۔۔ بہارش را خزاں نمود برباد
ہلالے بود از برجِ معالی ۔۔۔ درآمد بر سرِ او تیغِ بیداد
قضا افگند او را از سرِ بام ۔۔۔ چو گوہر بر زمیں غلطید و جاں داد
احبا و اعزہ در غمِ او ۔۔۔ شدند از انتقالش محوِ فریاد
سیہ شد دہر در چشم از رحیلش ۔۔۔ فضائے چرخ شد از ظلمت آباد

چہ گویدؔ ثاقب از تاریخِ رحلت
شب آمد آفتابِ جاہ افتاد

۱۳۲۶ھ ہجری

دیگر

از سحر تا شام زیرِ آسماں ۔۔۔ دہر بنماید ہزاراں انقلاب
گاہ ریزد تخم در کشتِ اہل ۔۔۔ گاہ مزرع سوزد از برقِ عتاب

گر رباید حسن از روئے حسین | گہ فزاید برگِ گل را رنگ و آب
شاہدِ جورش بصحنِ آسماں | سوزِ قلبِ مہر و داغِ ماہتاب
کشتگانِ تیغِ حسرت از قبور | بیحساب آیند در روزِ حساب
آں مہِ برجِ سعادت کز قضا | بر زمیں غلطید چوں دُرِّ خوش آب
نونہالے بود از باغِ شرف | گلبنے بود از سیادت انتخاب
چوں گل از شاخ آمد از بالا بزیر | جاں بداد و ہمچو سبزہ شد بخواب
شیشۂ دل را شکست ایں ماتمش | سوز او بنمود دلہا را کباب

گفت ثاقب بہرِ تاریخِ وفات
ایدل، افتاد از سرِ بام آفتاب
سنہ ۱۳۲۶ ہجری

تاریخ رحلت زوجہ برادر معظم میرزا احمد جان مرحوم ڈپٹی کلکٹر و سکریٹری حسین آباد ٹرسٹ لکھنؤ

عفیفہ نیک عقیدت جمیلۃ الاوصاف | کہ در طہارت طبعش نبود کس ہمتائے

بحلہ ہائے گرانمایۂ شرافتِ نفس — بچشم داشت ہمیں زیورِ جہاں آرائے

بحسنِ عشرت و خوبیِ خلق و طاعتِ دل — برائے شوہرِ خود بود حورِ خلد نمائے

فتاد در کششِ دامِ غربتِ ابدی — ز بوستانِ خود آں بلبلِ چمن پیرائے

بہ لکھنؤ گزر افتاد و از قضا و قدر — کہ وقتِ موت نماید رہ و بجوید جائے

سفیرِ موت کہ او را جہاں مرض گوید — دم از رفاقتِ او زد چو صاحبانِ ولائے

بچہرہ اش نظرِ لطفِ ایزدی افتاد — دوا بجیبِ خود افگند سر بحکمِ خدائے

بخوانِ رحمتِ معبود چوں نظر افگند — گزشت در مہِ صوم از سرِ در روزہ سرائے

رسید پیکرِ او در وطن کہ خاکش بود — غبارِ صحنِ مزارِ شہیدِ راہِ خدائے

بہ ہجرِ زوجہ معلیٰ جنابِ احمد جان — فتاد در المِ ظلمتِ شبِ یلدائے

نوشت خامۂ **ثاقب** بہ لوحِ مصرعِ سال

مزارِ سوگ نشینِ شہیدِ کرب و بلا —

سنہ ۱۳۴۷ ہجری

تاریخِ وفات حسرت آیات محبِ قلبی سید محمد اصغر ہمشیر زادہ جناب شیخ علی عباس صاحب وکیل مرحوم و مغفور

ذی‌حجہ کی گیارہویں تھی نحسِ اکبر　　اک بدرِ سعادت نے کیا جس میں سفر
لکھتا ہے قلم یہ سالِ رحلت ثاقبؔ　　گہنا گیا، کوکبِ محمد اصغر

۱۳۴۵ھ ہجری

تاریخ تعمیر سرائے امیر الدولہ مرحوم اعلے اللہ مقامہ

فی دار الجناں بمقام محمود آباد

اندریں فانی سرا ہاں مایہ دارد از فنا　　نقشِ باقی را نشانے نیست چوں آبِ بقا
غیر آں رسمے کہ از وجہِ تقرب در جہاں　　سر بنامِ حق زند بر گنبدِ نیلی قبا
چوں بنائے سربلندِ دلکش و محکم اساس　　قرۃ العینِ مسافر، درۃ التاجِ فضا
سایہ افگن دامنے دارد برا بنار السبیل　　مامنِ اربابِ غربت، خانۂ بے خانہا
حبذا آں ہمتِ عالی کہ از ایمائے او　　ایں بنا شد بہرہ یاب ابتدا و انتہا
ہمتِ علیائے گردوں اوج و کیواں منزلت　　بر مقامش غبطہ دارد ہم سہیل و ہم سہا
بیکراں بحریست دامانش کہ گوہر پرورد　　نقص مدحِ اوست گر گوئی دُرِ دُرجِ سخا
پا نہادہ پیش دُر شنیدِ آں چوں خضرِ رہ　　خادمانِ بارگاہش ہم نمودند اقتدا

بر بنائے خیر و تحصیل ثواب است این عمل — بہر ترویج امیر الدولہ جسم اعتلا
یوسف گم گشتۂ کنعان جاہ و عدل و خیر — والی محمود آباد و رئیس با صفا
تاجدار مصر دولت، باجگیر ملک جود — از کرم می داشت طبل و از ہمم بودش لوا
چون فلک گردون فر از وجہ قمر شب زندہ دار — ہمچو مہر انوار بار و ہمچو دری پر ضیا
این بنا شد یادگارش در جہان بے ثبات — اے خوشا پائے کہ او را این بنا شد نقش پا
تا بگردد چرخ و باشد این زمین سطح آب — جانشینش را بجائے او بود یا رب بقا
ثاقب مدحت سرا تاریخ بنیادش نوشت — با امیر الدولہ منسوب است نازد این سرا

۱۳۳۳ ہجری

تاریخ در تہنیت حصول خطاب نائیٹ بہ سرکار جنت مآب راجہ محمود آباد اعلی اللہ مقامہ

بحمد اللہ کہ راجہ گشت ممتاز — بہ تشریف گران کوکب ہند
کہ از وے یافت اوج سربلندی — شکوہ و جاہ و شان کوکب ہند
رئیس خطۂ محمود آباد — مہین روح و روان کوکب ہند
بسان مہر تابان تافت یعنی — بر اوج آسمان کوکب ہند

بغربت نغمہ سنج تہنیت شد | چو دل زیں داستانِ کوکب ہند
گرفتہ مرغِ فکرِ پاکِ ثاقب | سرِ اوجِ نشانِ کوکبِ ہند

سنش در بینات وہم زبر گفت
بہادر حکمرانِ کوکبِ ہند

۱۳۴۰ ہجری

تاریخ تہنیت جشن تطہیر حضور لامع النور راجہ محمد امیر احمد خان بہادر بزمانہ ولیعہدی و صاحبزادگی سندِ جناب معلی القاب مہاراجہ صاحب مرحوم و مغفور اعلی اللہ مقامہ

آں سرورِ جسم شکوہِ محمود آباد | شد پیرو سنتِ خلیلِ یزداں
از رسمِ ختانِ پورِ فرخندہ خصال | آورد بجا طریقِ دین و ایماں
باشد ذاتش بچشمِ مردم، الحق | انسانِ عیون خلق و عینِ انساں
بادش مسعود، ایں ہمایوں تقریب | از لطفِ خدائے کارسازِ کیہاں
از دورِ حیات حظ او فکر یابد، | گردد بمرادِ او، سپہرِ گرداں
واں ماہِ مراد ہم بظلِ لطفش | بر اوجِ سپہرِ عیش ماند تاباں

کاں ہست بہارِ باغ و فصلِ اُمید — کاں ہست سحابِ کشتِ دل و جاں
اے مرکزِ جاہ و عزت و جود و شرف — وے مرجعِ ہر امید تاقبِ بجہاں
از غنچۂ باغِ خلد گوئے بر بود — ایں گل کہ بشگفتاند شبے شمع زباں
پیداست ز آدلش مسیحی تاریخ — در مصرعِ دوّمی ہجر لیست نشاں
پاک ست برسمِ پاکِ ذیشاں احمد — دوران و لیِ عہد امیر احمد خاں

۱۹۲۲ عیسوی — ۱۳۴۱ ہجری

تاریخ در تہنیت تقریب اختتان عالی جاہ ہمایوں بارگاہ مہاراج کنور محمد امیر حیدر خاں خان بہادر مدظلہ العالی

شکرِ خدا بہار نے اُلٹی نقابِ حسن — جو پھول اس چمن میں ہے وہ بے عدیل ہے
دونو طرف ہے لطف باندازِ وسعِ ظرف — بلبل کے دل میں عشق ہے اور گل جمیل ہے
اک سرمئی گھٹا ہے کہ جس سے فضائے دہر — آئینہ دارِ جلوۂ دریائے نیل ہے
کیا دل کشائے غنچہ و گل ہے نسیمِ باغ — جیسے یہی ہوائے پرِ جبرئیل ہے
آوازیں لڑ رہی ہیں چمن میں ہزار کی — اک حسنِ رنگِ گل ہے یہ سب قال و قیل ہے
پانی برس رہا ہے کہ ہیں تشنہ لب نہال — اس گلکدہ میں ابرِ کرم کی سبیل ہے

دل مانتا نہیں ہے کہ یہ فصل اور مرض — کہتے ہیں لوگ نرگسِ شہلا علیل ہے

ہر نقشِ گل ہیں یہ خطِ گلزار کی نمود — لکھی ہوئی وجودِ خدا کی دلیل ہے

صیاد ہے تو کیا کہ دلِ عندلیب سے — آتی ہے یہ صدا وہی نعم الوکیل ہے

ہے منتہائے حسنِ چمن یہ کہ اس کی بزم — ہم شکلِ بزمِ عیشِ امیرِ شکیل ہے

ذی اقتدار راجہ کہ مالکِ و دھن آج — سر خیلِ راجگان و رئیسِ جلیل ہے

گلشن سے اُڑ چلو نہیں اسی بزم کی طرف — سنتا ہوں اہتمامِ طرب بے عدیل ہے

حیدر امیرِ محفلِ عیش و نشاط ہیں — اس قلب میں وہ نام ہے جو بے بدیل ہے

فضلِ خدا سے ختنۂ فرزند کی خوشی — اس حد میں ہے کہ جسکی کہانی طویل ہے

یوں بہر سال خامۂ ثاقب ہے گلفشاں — یہ سنتِ حمیدۂ دینِ خلیل ہے

۱۳۴۱ ہجری

در تہنیت ولادت نوہ پسری حضرت بیخود دہلوی دام مجدہ

حضرت بیخود مبارک ہو یہ پوتا آپکو — راحتِ جاں ہے یہی پیارے کا پیارا ہے یہی

دومِ اوّل جمادی کو قدیرِ پاک نے — کوکبِ پُر نور اس گھر میں اُتارا ہے یہی

چاند کی رویت سہ شنبہ کو ہوئی ہنگامِ ظہر — بہرِ چشمِ منتظر دلکش نظارا ہے یہی

ہو بلند اقبال دنیا میں یہ مولودِ سعید — طالعِ بختِ ہمایوں کا اشارا ہے یہی

فکرِ تاریخِ ولادت ہے تو ثاقبؔ یوں کہو
ہے یہی بدرِ منیر، آنکھوں کا تارا ہے یہی

۱۳۴۱ ہجری

تاریخِ تعمیر اقبال منزل

راجہ علی محمد، ما خوش بنا نمود — ایں قصرِ نو، کہ ہست ہمایوں حرم سرا

تا طرحش او فتاد بعہدِ نشاطِ دہر — عہدِ دوام بست، ہمایوں حرم سرا

افلاک را برفعتِ اوجے، کہ حاصل است — گیرد ز خویش پست، ہمایوں حرم سرا

پہلوئے برقِ طور زند از فروغِ حسن — در چشمِ جلوہ مست، ہمایوں حرم سرا

دارد بصدرِ خویش، عزا خانہ حسینؑ — چوں قلبِ حق پرست، ہمایوں حرم سرا

خطِ دوامِ عیش پئے بانیش گرفت — در محضرِ الست، ہمایوں حرم سرا

آراست تا بحلیۂ تاسیسِ دلفریب — صناع تیز دست، ہمایوں حرم سرا

چوں نقشِ تازہ بستہ از رنگ یک قلم — بر لوحِ دل نشست، ہمایوں حرم سرا

ثاقبؔ نوشت مصرعِ تاریخِ ایں بنا — اقبال منزل ست، ہمایوں حرم سرا

۱۳۴۲ ہجری

در تہنیت حصولِ خطاب مہاراجہ بحضور جنت آرامگاہ سر

راجہ صاحب محمود آباد اعلی اللہ مقامہ

خطابِ تازہ پیشِ ہوم ممبر	ہما بنکر بصد اقبال آیا
خدا رکھے مرادوں کے چمن میں	کھلا جو پھول وہ اعلےٰ سے اعلےٰ
بہت شایانِ عز و مرتبت ہے	یہ تشریفِ مبارک فال و زیبا
زبر او ربینہ میں سے کہئے تاریخ	طبیعت کا ہے ثاقب یہ تقاضا
طرب افزائے خاطر یہ سخن ہے	کہ راجہ سے مہاراجہ او دھ کا

۱۳۴۳ ہجری

ایضاً

ہوش اک گم گشتہ یوسف تھا سفر میں نا گہاں	خضر بنکر اک نویدِ تازہ آئی راہ میں
جس نے طالع کو جگہ دی طارمِ امید پہ	گرچہ وہ یوسف کی صورت گر چکا تھا چاہ میں
یعنی اک زینہ عروجِ بامِ عزت بڑھ گیا	میرے شاہِ وقت کا دربارِ شاہنشاہ میں
پہلے راجہ تھے مگر اب وہ مہاراجہ ہوے	سچ ہی ثاقب کیا کمی اللہ کی درگاہ میں

ہو رہے ہیں پھول چہرے دستو نکے کیوں نہ ہوں | ایک کانٹا اور ڈوبا سینۂ بدخواہ میں
یہ خطاب اچھا ہی لیکن اوجِ عزت دیکھکر | کم نظر آتا ہی مہر اک چشمِ حق آگاہ میں
ماہ بن جاتا ہی اک ادنی تصرف سے مہا | اب بھی کیا ٹھوکر لگیگی حاسدونکو راہ میں
میں مہا سے ماہ کو اچھا سمجھتا لا کلام | ہاں مگر اسوقت جب دھبا نہ ہوتا ماہ میں
قلب کہتا ہی کہ تم سمجھو مہا کو بھی ہما | تاج بخشی کیا نہیں ہے قدرتِ اللہ میں
لاکھ امیدونکو لیکر آرہا ہوں اپنے ساتھ | وسعتیں پیدا ہوئی ہیں دامنِ کوتاہ میں
توڑ کر تا قب سرِ دشمن یوں بہرِ سال | ایک کوپل اور پھوٹی بوستانِ جاہ میں

۱۳۴۳ ہجری

در تہنیت تقریب کتخدائی حضور لامع النور راجہ محمد امیر احمد خان خان بہادر برمانۂ ولیعہدی نذرِ جناب معلّی القاب سر مہاراجہ صاحب مرحوم و مغفور اعلی اللہ مقامہ

گشت با فضالِ خدا کتخدا | خان امیر احمدِ روشن سمات
نورِ نگاہِ فرہ و فرخی | مردمکِ دیدۂ عزم و ثبات
زیبِ تجلی گہِ حسنِ شہود | زینتِ نزہتکدۂ کائنات

پورِ فرہنـدِ جہاں داورے | پاک دل و پاک تن و پاک ذات
آنکہ بدلہا کرمِ او نمود | ابرِ بہار آنچہ کند با نبات
آنکہ برد از دلِ صد بے نوا | رنجِ ہمہ عمر بیک التفات
آنکہ بجاں پروریِ عالم است | فیضِ کفش، موجۂ آبِ حیات
آنکہ مہیا کند از بذلِ خویش | رزقِ جنیں در شکمِ اُمّہات
آنکہ بجز عکس، نظیرِ خودش | دیدہ نہ در آئنۂ ممکنات
آنکہ بود لطفِ عمیمش بخلق | ضامنِ تسہیلِ ہمہ مشکلات
تا شدہ نامش بزباں آشنا | ریخت بکامِ دل و جانہا نبات
حضرتِ مہراجۂ دارا علم | دادرِ جم مرتبہ والا صفات
متّبعِ شاہِ ولایت، در اسم (علی) | یافتہ، از نامِ پیمبر (محمد) برات

شادیِ عقدِ خلفِ بختور | باد سعیدش بحقِ اسمِ ذات
سالِ طرب خامۂ ثاقب نوشت | عقدِ ولیعہدِ ستودہ صفات

۱۳۴۵ ہجری

تاریخ وفات حسرت آیات علیا خاتون بڑی بٹیا صاحبہ
مہین دختر راجہ امیر الدولہ مرحوم اعلی اللہ مقامہ

اک جہاں غمگیں ہے کچھ میں ہی نہیں ہوں دل ملول
موت کے کانٹوں میں الجھا گلشنِ ہستی کا پھول

اس سے پہلے بھی شبِ غم کی درازی کم نہ تھی
اب تو یہ حشر تک پہونچا صفِ ماتم کا طول

دہر کی لاحاصلی کیا کم تھی عبرت کے لئے
اس پہ طرہ ہو گیا اندوہ و حسرت کا شمول

میں نے دیکھے تھے جو اپنی عمر میں عشرت کے خواب
حکمِ دل ہے یاد رکھ گردوں یہ کہتا ہے کہ بھول

نیشِ غم ہے بلبل و صیاد کی گفت و شنید
دردِ دل ہے صاحبانِ درد کی قال اقول

ہے زراعت گاہِ دنیا اشک کی سینچی ہوی
پھر بھی مرجھائے ہوئے ہیں ہم فروع و ہم اصول

بات ہے کل کی، یہ شمعِ ضو فشانِ بزمِ خیر
شمعہائے کشتہ کی صف میں ہو آج اس کا شمول

ایک سناٹا سا چھایا محفلِ ایجاد میں
اب نہ غنچوں میں چٹک ہو اور نہ ہنس سکتے ہیں پھول

خود فنا ہو کر شہادت کی ادا توحید کی
یعنی اسکی ذات سے ہے بس، لم یزل اور لایزول

دخترِ پاکِ امیر الدولہ عالی مقام
خواہرِ سر خیلِ اربابِ کرم، پیشِ عقول

اڑ کے تا فردوس جا پہونچا ہوائے شوق میں
اس سرائے تنگ سے پروانۂ شمعِ رسول

کلک نے ثاقب ندا دی سالِ رحلت کے لئے
درگہِ اقدس میں پہونچی اب وہ شیدائے بتول

۱۳۴۷ھ ہجری

تاریخ ولادت باسعادت دختر نیک اختر عالی مراتب والا مناقب حضور لامع النور راجہ محمد امیر احمد خاں خان بہادر والی ریاست محمود آباد دام اقبالہ

مہ چار دہ از ربیع نخست ... چو آسود در وسطِ دامانِ شب
بآغوشِ مہرِ پدر جلوہ ریخت ... یکے ماہِ کامل ز الطافِ رب
چہ ماہے کہ گیرد ازاں مہر نور ... ز مہر است گو نورِ مہ مکتسب
مہیں اخترِ برجِ شرم و حیا ... بہیں گوہرِ درجِ حسن و نسب
خجستہ گہر، وخترِ فرخ نہاد ... فرح بخشِ جان و دلِ اُمّ داب
کہ صبحِ جبینش، بفر تابِ حسن ... نشانیدہ، نورِ سحر در عقب
شد از جلوۂ نونہالش عیاں ... بگلزارِ گیتی بہارے عجب
برقص آمد از وجد ہر شاخِ گل ... پئے خندہ بکشاد ہر غنچہ لب
در آمد بجانہا نشاط و سرور ... زدلہا بدر رفت رنج و تعب
زہے جوشِ عشرت کہ از فرطِ وجد ... جہاں تا جہاں است شور و شغب

بہر جا کہ آئیست، سازِ سرور | بہر سو کہ بینیست، رنگِ طرب
ز آئینہ بندی کہ در قصر ہاست | بہر گوشہ یابی، ہزاراں حلب
براجہ امیر احمدِ جم حشم | کہ باشد بفرمان عجم تا عرب
پئے سالِ میلادِ ایں نورِ چشم | بود عرضِ ثاقب بعجز و ادب
کہ اے آسماں پایہ انجم بقدر | ہمایوں بود دختِ عالی نسب

۱۳۵۱ ہجری | ۵۸۱

سنہ ۱۹۳۲ء

تاریخ نوایجاد

مطلعِ تاریخ پسندیدہ و تازہ ایجاد، در تہنیت تولد فرزند پاک نہاد، کہ بتبدل اجزائے مصارع او والفاظِ اجزا
۱۹۳۳ ۱۹۳۳ ۱۹۳۳
نود و سہ ہزار و سہ صد و دوازدہ ابیات حلاوت آموز و دانش افزا، حاوی مصرعین تاریخ زیبا برآید،
۱۹۳۳ ۱۹۳۳
و در حیرت بروے اقران کشاید، طبع زاد ادب نہاد ذاکر حسین ثاقب لکھنوی
۱۹۳۳ ۱۹۳۳

مطلع

نورِ نظر، موجِ کرم، جانِ عطا، کنزِ ادب | لختِ جگر، اوجِ حشم، کانِ علا، والا نسب

۱۹۳۳ عیسوی | ۱۹۳۳ عیسوی

چونکہ دیوان ہذا کی تقطیع چھوٹی ہے دوہرا دائرہ بنانے کی گنجائش نہیں ہے لہذا دونوں دائروں کا نقشہ بصورت ذیل تحریر کیا جاتا ہے۔ وھو ہذا۔

دائرہ متعلق مصرع اول	دائرہ متعلق مصرع دوم
۱۔ نور نظر موج کرم جانِ عطا کنز ادب ۱۹۳۳	لختِ جگر اوجِ حشم کان علا والانسب ۱۹۳۳
۲۔ نور نظر جان عطا موج کرم کنز ادب ۱۹۳۳	لخت جگر کان علا اوج حشم والانسب ۱۹۳۳
۳۔ نور نظر کنز ادب موج کرم جانِ عطا ۱۹۳۳	لخت جگر والانسب اوج حشم کان علا ۱۹۳۳
۴۔ نور نظر موج کرم کنز ادب جان عطا ۱۹۳۳	لخت جگر اوج حشم والانسب کان علا
۵۔ نور نظر جانِ عطا کنز ادب موج کرم ۱۹۳۳	لخت جگر کان علا والانسب اوج حشم ۱۹۳۳
۶۔ نور نظر کنز ادب جان عطا موج کرم ۱۹۳۳	لخت جگر والانسب کان علا اوج حشم ۱۹۳۳
۷۔ موج کرم جان عطا کنز ادب نور نظر ۱۹۳۳	اوج حشم کان علا والانسب لخت جگر ۱۹۳۳
۸۔ موج کرم کنز ادب جان عطا نور نظر	اوج حشم والانسب کان علا لخت جگر
۹۔ موج کرم نور نظر کنز ادب جان عطا	اوج حشم لخت جگر والانسب کان علا
۱۰۔ موج کرم کنز ادب نور نظر جان عطا	اوج حشم والانسب لخت جگر کان علا
۱۱۔ موج کرم جان عطا نور نظر کنز ادب	اوج حشم کان علا لخت جگر والانسب

۱۲- موج کرم نور نظر جان عطا کنز ادب — اوج حشم لخت جگر کان علا والا نسب
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۱۳- جان عطا کنز ادب نور نظر موج کرم — کان علا والا نسب لخت جگر اوج حشم
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۱۴- جان عطا نور نظر کنز ادب موج کرم — کان علا لخت جگر والا نسب اوج حشم
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۱۵- جان عطا موج کرم نور نظر کنز ادب — کان علا اوج حشم لخت جگر والا نسب
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۱۶- جان عطا نور نظر موج کرم کنز ادب — کان علا لخت جگر اوج حشم والا نسب
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۱۷- جان عطا موج کرم کنز ادب نور نظر — کان علا اوج حشم والا نسب لخت جگر
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۱۸- جان عطا کنز ادب موج کرم نور نظر — کان علا والا نسب اوج حشم لخت جگر
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۱۹- کنز ادب موج کرم نور نظر جان عطا — والا نسب اوج حشم لخت جگر کان علا
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۲۰- کنز ادب نور نظر موج کرم جان عطا — والا نسب لخت جگر اوج حشم کان علا
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۲۱- کنز ادب جان عطا نور نظر موج کرم — والا نسب کان علا لخت جگر اوج حشم
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۲۲- کنز ادب نور نظر جان عطا موج کرم — والا نسب لخت جگر کان علا اوج حشم
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۲۳- کنز ادب جان عطا موج کرم نور نظر — والا نسب کان علا اوج حشم لخت جگر
۱۹۳۳ — ۱۹۳۳

۲۴- کنز ادب موج کرم جان عطا نور نظر — والا نسب اوج حشم کان علا لخت جگر

یہ ایک مطلع مسجع آٹھ ارکان کا دو تاریخی مصرعوں پر مشتمل ہے جسکی ترکیب

ارکان میں تقدیم و تاخیر سے چوبیس[۲۴] مطلع ہائے مسجع حسب اندراج نقشہ بالا اڑتالیس[۴۸] تاریخوں پر حاوی پیدا ہوتے ہیں؛ ان مطلعوں کے ہر مصرعہ میں اگر باستثنائے سجع الفاظ لخت جگر و نور نظر کہ یہ دونوں بمنزلۂ اسم وعَلَم ہیں؛ باقی تین ارکان کے الفاظ کا ایک دوسرے سے ردوبدل کیا جائے تو ہر مصرعہ اٹھارہ[۱۸] نہج سے بامعنی موزوں ہوتا ہے مثلاً پہلا مصرع

۱۔ نور نظر موج کرم جان عطا کنز ادب	نور نظر جان کرم موج عطا کنز ادب
۲۔ نور نظر کنز کرم جان عطا موج ادب	نور نظر جان کرم کنز عطا موج ادب
۳۔ نور نظر کنز کرم موج عطا جان ادب	نور نظر موج کرم کنز عطا جان ادب
۴۔ نور نظر کنز ادب جان عطا موج کرم	نور نظر جان ادب کنز عطا موج کرم
۵۔ نور نظر موج ادب جان عطا کنز کرم	نور نظر جان ادب موج عطا کنز کرم
۶۔ نور نظر کنز ادب موج عطا جان کرم	نور نظر موج ادب کنز عطا جان کرم
۷۔ نور نظر موج کرم کنز ادب جان عطا	نور نظر کنز کرم موج ادب جان عطا
۸۔ نور نظر موج کرم جان ادب کنز عطا	نور نظر جان کرم موج ادب کنز عطا
۹۔ نور نظر کنز کرم جان ادب موج عطا	نور نظر جان کرم کنز ادب موج عطا

پس اس اسلوب سے جب چوبیس ۲۴ مطلعوں کے ہر مصرعہ کو نظم کیا گیا تو اس سے چوبیس ۲۴ کو اٹھارہ ۱۸ میں ضرب دینے کے بعد چار سو بتیس ۴۳۲ مطلع ہائے مسجع و بامعنی آٹھ سو چونسٹھ ۸۶۴ تاریخی مصرعوں پر مشتمل دونوں دائروں سے حاصل ہوئے اسکے بعد ہر ایک دائرے کا ہر ایک مصرعہ دوسرے دائرے کے ہر ایک مصرعے کے ساتھ ملکر جنکی تعداد چار سو بتیس ۴۳۲ ہے ایک پورا شعر دو تاریخوں پر مشتمل ہو جاتا ہے لہذا جب ۴۳۲ کو ۴۳۲ میں ضرب دیا گیا تو ۱۸۶۶۲۴ مصرعوں کے ۹۳۳۱۲ شعر ایک مطلع سے حاصل ہوئے۔

تاریخ رحلت جگر گوشہ سید احمد حسین صاحب داروغہ باورچیخانہ ریاست محمود آباد

وہ پانچ مہینے کے فرزند کا مرجانا — اک حشر سا رکھتا ہے برپا دلِ احمد میں

ہنگامِ ولادت ہی ماں اٹھ گئی دنیا سے — [illegible] باپ کا [illegible] ہوا اس غمِ بیجا میں

یوں کہئے جو فرمائش تاریخ کی ہے ثاقب

خوابیدہ ہے یہ بچہ گہوارۂ مرقد میں

سنہ ۱۳۴۹ ہجری

تاریخ کتخدائی عزیز از جان عزیز القدر شیخ علی بہادر حبیب اللہ سلمہ اللہ تعالے

کتخدا شد چو علی ابن حبیب آنکہ شرف | از ازل عقد ہوا خاہ بدانش بربست
گشت کاشانۂ فضلش بعروسے آباد | کہ ندیدست ندیدش فلک از روز الست
عفت آثارے ہنرمندے سراپا دانش | درۃ التاج حیا فاضلہ علم پرست
تا ابد حاصلِ شاں باد بہر لحظہ عمر | ہر چہ از لطف و مسرت شدہ حاصل سرِ دست
طرفہ ہنگامۂ عشرت کہ ز صہبائے طرب | گشت جان و دلِ احباب و اعزہ سرمست
سفت ثاقب دُرِ شہوار بسالِ این عقد | جوہر فرد بآں گوہرِ کامل پیوست

۱۳۵۱ ہجری

در تہنیت ولادت فرزند ارجمند بخدمت علیا خاتون مسز الگزنڈر مسرو بہادر بالقابہ ڈپٹی کمشنر لکھنؤ

یافت فرزندے مسز مسرو کہ از لطفِ خدا | طالعِ اسکندرش بادا نصیب و عمرِ نوح
کلکِ ثاقب بہرِ تاریخِ ولادت زد رقم | نورِ چشم و راحتِ جان پارۂ دل راحِ روح

۱۹۳۳ عیسوی

در تہنیت حصولِ خطاب شفاء الملک بجناب محترمی حکیم عبد الحسیب صاحب دریابادی زاد فضلہ

شکر کی جا ہے کہ میرے مہرباں عبد الحسیب — آسمانِ علم و دانش کے منور آفتاب

منبعِ لطف و کرم، سر چشمۂ فیضِ عمیم — چارہ سازِ ہر مرض، روشن روان، حکمت مآب

فردِ اکمل، لکھنؤ کے نامور حاذق طبیب — آپ ہی اپنی مثال اور آپ ہی اپنا جواب

وہ شفاء الملک ہوں اور ہیں مبارکباد دوں — مدعائے دل حکومت کا ہوا یہ انتخاب

برسبیلِ تہنیت ثاقبؔ یہ ہے مصراعِ سال

دال ہے فضل و کمالِ فن پہ یہ انسب خطاب

سنہ ۱۹۳۴ء

تاریخ طبع قرآن مجید بطرز جدید

باز شد بابِ سعادت بر طلبگارانِ حق — اہلِ دیں را مژدہ باد و اہلِ ایماں را نوید

نقش بندِ پیکرِ حسنِ عمل سید جلال — طرفہ تر روحِ بقا در قالبِ ایماں دمید

شاہدِ رعنائے قرآں را باسلوبِ بہیں — کسوتِ زیبائے طبعِ دل نشیں در بر کشید

حرف حرفش را چناں کرسی ترئیں نشاند — داد جائش مثلِ سنگِ طبع در دل ہر دید

مصرعِ تاریخِ دلکش کلکِ ثاقب زد رقم
طبع شد با صد ہزاراں حسن فرقانِ مجید

سنہ ۱۳۵۲ ہجری

دیگر در تہنیت ولادت فرزند مسٹر منرو ڈپٹی کمشنر لکھنؤ دام اقبالہا

اے خوشا ہنگامۂ عشرت کہ بہرِ تہنیت
بست بر سازِ تمنا مطربِ جاں تارِ عیش

بسکہ حکمِ شادمانی عام شد در لکھنؤ
می تراود از در و دیوارِ شہر آثارِ عیش

گشت یعنی در ربیعِ سبز بختی در فشاں
بر سرِ کشتِ تمنا ابرِ گوہر بارِ عیش

یافت فرزندے جواں طالع، منرو کہ ہست
صفحۂ روشن جبینش، مطلعِ انوارِ عیش

وہ چہ فرزندے کہ بینی از فروغِ گوہرش
در دیارِ کامرانی رونقِ بازارِ عیش

تا نیفتد دیدہ بدبیں، بشوخی جانبش
باد روشن مہر مانا، در تجلی زارِ عیش

دیدہ ام روزِ ازل، در خوابگاہِ عافیت
سلسلہ جنبانِ مہدش طالعِ بیدارِ عیش

چار شنبہ از ستمبر بود و ہم شامِ ششم
کز ورودش یافت آب و تابِ نو ہنجارِ عیش

شورِ گلبانگِ طرب بگرفت شرق و غرب را
از او دھ تا انگلستاں رفت این اخبارِ عیش

عیشِ پیہم باد یا رب حاصلش از دورِ عمر
نیست حاصل غیر ازیں در نظمِ از تکرارِ عیش

زد رقم سالِ ولادت ثاقبِ رنگین بیاں　　　نو برِ نخلِ تمنا، نو گلِ گلزارِ عیش

۱۹۳۴ عیسوی

قطعاتِ تاریخ در تہنیت ولادت فرزند بلند اقبال ہمایوں فال مکرمی و محترمی جناب سید محمد الیاس صاحب بار ایٹ لا منیجر ریاست بلہرہ زاد کرمہ

چو ایزد سید الیاس را بخشید فرزندے　　　بحفظ خویش از آسیبِ دوراں دار تا ہر دم

پے میلادِ ایں وشنگرِ چشم جہاں ثاقب　　　مبارکباد فرزندِ رفیع الشاں، رقم کردم

۱۳۵۳ ہجری

ایضاً

نورِ دل و دیدۂ عقل و شعور　　　تابِ رخِ روشنِ فضل و کمال

کانِ کرم، معدنِ صدق و صفا　　　سیدِ الیاس خجستہ خصال

یافت چو فرزندِ گرامی گہر　　　از کرمِ ذو المننِ بیہمال

مایۂ آرامِ دلِ مام و اب　　　قوتِ جان و جگرِ عم و خال

گشت پے غنچۂ دل ایں نوید　　　ہمنفسِ موجۂ بادِ شمال

لطفِ خدا باد، نگہہ دارِ او　　روز و شب و شام و سحر، ماہ و سال

سالِ طرب خامۂ ثاقب نوشت

نورِ بصر، راحتِ جاں نونہال

۱۳۵۴ ہجری

متفرق اشعار

میرے بھی دل کی صفائی دیکھ لے　　آئینہ تیرے مقابل ہی تو ہے

ہر موجِ تبسم کے جلے، آنکھ کے غضب سے　　بجلی نہ گئی شعلۂ رخسار کے آگے

سمجھو مرا دل کہتا ہے کیا جوشِ جنوں میں　　طوفان میں دریا کی صدا اور ہی کچھ ہے

میں ابھی تک بیخودی کی راہ سے واقف نہیں　　ہوش میں ہوں آپ گر ہشیار رہنے دیجیے

کیوں بجھا کر رو گئے رونے سے شمع قبر کو　　ایک کو تو میرا ماتمدار رہنے دیجیے

کیا پوچھتے ہو مجھ سے، تم ملتے تو کیا ہوتا　　دل تم پہ فدا کرتا، میں دل پہ فدا ہوتا

اس دردِ محبت کے انداز نرالے ہیں　　گھٹتا تو مرض ہوتا، بڑھتا تو دوا ہوتا

مانا کہ دعاؤں سے کٹتی شبِ غم لیکن　　وہ ہاتھ کہاں پاتا جو دل سے جدا ہوتا

کوئی بلند تمنا بھی فرعِ ہمت ہے　　کسی زبان پر آئی نہ آرزو میری

ہالۂ خط تو خوب ہے ہاں مگر اسکے پڑتے ہی — قافلۂ جمالِ دوست پا بہ رکاب ہو گیا

تجلی ہی تو فرقِ وحدت و کثرت بھی مشکل ہے — غلط فہمی ہی یہ کہنا کہ آئینہ مقابل ہے

کس منھ سے بیاں کرتی اظہارِ پریشانی — جب تم نے مری حالت صورت سے نہ پہچانی

غلط اشعارِ مطبوعہ کی تصحیح

صفحہ	سطر	مصرع	
۱۶	۱۴	مصرع ثانی	صد چاک اسی خیال سے ہر شانہ ہو گیا
۲۸	۱	//	دل لبِ خاموش تھا اور قطرۂ خوں راز تھا
۶۰	۱۱	//	فتحِ بابِ اثرِ نالہ و فریاد کیا
۶۲	۶	//	یہ وقت بد تھا کہ ساغر رہا سبو نہ رہا
۷۳	۵	مصرع اول	اب کشتیٔ شہر کہ جب دنیا کی کڑیاں جھیل لیں
۸۴	۵	مصرع ثانی	آفتاب ایسا ہی چمکا تھا عنب کی تاک پر
۱۸۷	۸	//	چھپکر جائیں کیوں مرے داغِ جگر سب مجھے
//	۱۲	//	بیجا ہے یہ خیال اُدھر آنکو اِدھر سب مجھے
۱۸۹	۱۴	//	زندگی چھوڑ کے کی موت گوارا کس نے
۱۹۲	۲	مصرع اول	وہی سکوت میں اک عمر کاٹنے والا

صفحہ	سطر	مصرع	اول
۱۹۲	۳ ؍؍	مصرع اول	حریف بزم میں چھیڑا کریں مگر تا بہ
؍؍ ۲۰۱	؍؍ ۱۱	مصرع ثانی	بات جب بگڑی نہ ہو تو کیوں نباہنا چاہیے
؍؍ ۲۴۰	؍؍ ۷	پورا شعر غلط چھپا ہے، یوں صحت فرمائیے	

دیکھ کے میری آنکھ دیکھ اس رخِ آتشیں کی آب   آب ہر ایک ہی طرف ایک طرف سراب ہے

صفحہ	سطر	مصرع	اول
؍؍ ۲۳	؍؍ ۳	مصرع ثانی	آپ کو بھولا نہیں تھا، دل بھی مجھکو یاد تھا
؍؍ ۳۹	؍؍ ۸	؍؍	اب اس سے زیادہ کیا اظہارِ جفا ہوتا
؍؍ ۱۱۷	؍؍ ۸	؍؍	آج وہ آکے دیکھ لو عالمِ احتضار میں

غروب آفتاب

بپاس خاطر بعض طلبائے علیگڈھ کالج ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۰۶ء

خدا کا نام لے اسے طالبِ نور   کہ دن کی روشنی ہوتی ہے کافور

سرِ مشرق پہ آ پہونچا اندھیرا   عنانِ مہر کو گردوں نے پھیرا

غضب ڈھایا شبِ نو میہماں نے   افق کو آگ دیدی آسماں نے

رخِ مشرق پہ رنگِ سوسنی ہے   درِ مغرب پہ کچھ کچھ روشنی ہے

شفق میں ہے یہ سورج کا قرینہ — کہ جیسے آگ میں نانِ شبینہ

کہاں تک دھوپ کی رنگت نہ ہو زرد — ہوا جاتا ہے بُرجِ آتشیں سرد

تڑپ مدھم ہے ہر وسئے شعلہ زا کی — جلا کم ہو چلی طشتِ طلا کی

شعاعوں نے جو آنکھیں پھیر لی ہیں — اندھیرے نے بھی راہیں گھیر لی ہیں

فروغِ مہر تھا جن کے سہارے — وہ تار اب ہو گئے معدوم سارے

جو دیکھا یہ چراغِ زیرِ دامن — پرندوں کو ملی راہِ نشیمن

چلا ہے کوئی سوئے آشیانہ — بٹھائے ہے کسی کو حرصِ دانہ

اڑے جاتے ہیں سارے جانے والے — ارادے میں ہیں جلدی کھانیوالے

اندھیرے کا جو بچاروں کو ڈر ہے — کبھی دہنے کبھی بائیں نظر ہے

کسی جانب اُڑا جاتا ہے اک غول — کہ جس کی سبز پوشاکیں ہیں انمول

صدا پرواز کی آتی ہے ہر گام — بیاباں میں ہے سناٹا سرِ شام

دُھندلکا ہو چلا ہے اب زمیں پر — کہیں ظلمت سوا ہے کم کہیں پر

توقف کا زمانہ ہے بہت کم — گلے ملتے ہیں دونوں وقت باہم

ہٹا کر طائروں کو زیرِ اشجار — سیہ بستر لگاتی ہے شبِ تار

سفر بھی ساتھ ہی دن کے ہے آخر قریب آئے ہیں منزل کے مسافر
ہے دل کو رہرووں کے فکرِ آرام کہ آنکھیں ڈھونڈتی ہیں سرمۂ شام
کثافت سے طبیعت کو ہے اُلجھن جھٹکتے ہیں غبار آلودہ دامن
کہیں مارے ہوئے منزل کے بیٹھے وہ کیا بیٹھے سفینے دل کے بیٹھے
رگیں لیتی نہیں آرام اب تک وہاں آئی نہیں ہے شام اب تک
وہ جنبش کر رہی ہیں اس طرح سے کوئی دم توڑتا ہو جس طرح سے
بہم پہونچے نہیں راحت کے ساماں تھکے ماندے مُسافر ہیں پریشاں
کوئی تو آگ روشن کر رہا ہے کوئی تدبیرِ مسکن کر رہا ہے
گئی ہمراہِ مہر اسکی روانی تھما بہتے ہوئے دریا کا پانی
کیا لہروں نے پیدا رنگِ گیسو سیہ ہونے لگا آئینۂ جو
نظر آئی جو پانی میں سیاہی تو جل اُٹھے چراغِ فلسِ ماہی

نویدِ رحلتِ پروانہ لائیں
گھروں میں سو لیاں شمعونکی آئیں

پاسخ مکتوب منظوم جناب منشی احسان علی صاحب فصیح مرحوم رئیس فتحپور ضلع بارہ بنکی ۶ جنوری ۱۹۰۹ء

سلام علیکم و قلبی لدیکم | فصیح سخن سنج و الا مناقب

مرے عزت افزا سلامت رہو تم | ہے جب تک دلآویزیٔ بزمِ کواکب

رہیں دور تم سے حوادث جہاں کے | رہے تم سے خیرہ نگاہِ مصائب

صحیفہ ملا جس میں تھے ایسے موتی | جو حیرت فزا ہو گئے بہرِ ثاقب

محبت کی بو گوہرِ دل کی چمک تھی | وہ گل تھے کہ موتی، خوشا فکرِ صائب

بہت چاہتا ہوں میں اپنی حضوری | مگر راہ کو روکتے ہیں نوائب

نہ جی مانتا ہے نہ میں چاہتا ہوں | کہ حاضر رہوں دل سے اور پھر ہوں غائب

ہٹاتا ہے گردوں جو بڑھتا ہوں آگے | یہ اسکی رضا ہے وہ میرے مطالب

میں بزمِ جہاں میں عجب شان سے ہوں | پریشانیاں گرد، فکریں مصاحب

خیالِ مبادی، دلِ مضمحل میں | سر پُر تردد میں فکرِ عواقب

سر پر الم بارِ ہمت کے نیچے | سرِ گردش آئیں یہ تاجِ متاعب

میں سلطاں ہوں ایوانِ نیلے گردوں میں | پھر اُس پر نہ لشکر نہ دربانِ حاجب

امیدِ دعا ہے، درِ کبریا پر ۔۔۔ کبھی دل جو ہو جائے اس سمت راغب

تقررِ علی اصغرِ نیک خو کا ۔۔۔ ہوا باعثِ خنکیِ چشمِ ثاقب

سدا فضلِ حق سے رہے ہو شاد و خرم ۔۔۔ گھٹیں رنج و غم اور سوا ہوں مناصب

یونہی نظم کی شکل میں لکھ دیا ہے

ادا کچھ نہ مجھ سے ہوا حق واجب

ذکرِ عیش نصف عیش یکم جولائی سنہ ۱۹۰۹ء

خدا کی شان کہ وحدت نما ہے شانِ سرور ۔۔۔ عجب بناؤ یہ ہے حسنِ لعبتانِ سرور

جمال گو نہیں دیکھا کسی نے دل کے سوا ۔۔۔ کمال ہے کہ ہیں آنکھیں بھی مدح خوانِ سرور

اسی کے ہجر کا غم نام ہے زمانے میں ۔۔۔ اسی کے وصل کو کہتا ہے دل زمانِ سرور

غموں نے توڑ دیا ہے مگر امیدوں پر ۔۔۔ اٹھائے جاتا ہوں ہیں ناز دلبرانِ سرور

جو قسمتوں سے ہدف ہو گیا وہ زندہ ہے ۔۔۔ ادھر بھی اک نظر اے ناوک و کمانِ سرور

مزاج ہو متلون تو ہوں رسا شاید ۔۔۔ تغیراتِ زمانہ ہیں پاسبانِ سرور

سوائے ترکِ جفا جو ہے فتنہ گر سے بعید ۔۔۔ کسی کے نفع میں ہے اور کیا زیانِ سرور

خوشی کے اشک بھی نایاب ہیں خوشی کی طرح ۔۔۔ ہے قہقہے سے سوا کیفیت فغانِ سرور

ہوئی ہے عادتِ غم دوستی، مری دشمن | نہیں ہوا ہیں ابھی تک مزاجدانِ سرورؔ
تصورات سے تصویر کھینچنے کے لئے | بہت سُنی دلِ نادان نے داستانِ سرورؔ
مجھی سے شرم ہے یا اور سے بھی پردہ ہے | حجاب چاہئے کچھ لے رخِ نہانِ سرورؔ
اسی کے کشتۂ فرقت کو ہے وصالِ ملال | مریضِ غم ہے وہی جو ہے ناتوانِ سرورؔ
خوشی سے دے نہیں سکتے ہیں جان بھی غم کش | ہر امتحان سے ہے سخت امتحانِ سرورؔ
رہے گا شامِ ابد تک یہ سلسلہ جاری | زمانہ صبحِ ازل سے ہے قدردانِ سرورؔ
نہیں ہر ایک پہ سایہ فگن یہ خیمۂ سبز | زمینِ دہر سے چھوٹا ہے آسمانِ سرورؔ

سرائے دہر میں جذبِ دلی سے شام و سحر
نگاہ ڈھونڈتی ہے، گردِ کاروانِ سرورؔ

معذرت نامہ

۲۴ - اکتوبر ۱۹۱۵ء | مطبوعۂ رسالۂ تمدن لکھنؤ

جانشینیِ میرؔ و غالبؔ کی کہاں اور میں کہاں | وہ خدائے فن تھے اُن سے مجھکو نسبت کچھ نہیں
ہو گئے مشقِ سخن کرتے ہوئے پینتیس ۳۵ سال | اور اب تک حاصلِ رنج و مشقت کچھ نہیں
دوست اپنے حسنِ ظن سے مجھکو جو چاہیں کہیں | واقعہ یہ ہے کہ مجھ میں قابلیت کچھ نہیں

آپ نے مجھکو برا سمجھا بہت اچھا کیا
آپ نے تعریف کی تو اسکی حاجت کچھ نہیں

نازشِ فن کیلئے کہتے ہیں کسنئے عوائے نظم
اعترافِ بے سوادی ہے رعونت کچھ نہیں

آگیا ہوگا کہیں سے میر و غالب کا مذاق
اپنے دل میں تو بجز ذوقِ جہالت کچھ نہیں

جلوہ گاہِ حُسنِ ظاہر ہوا اگر باطن تو واہ
شعر ناقص ہے جو معنی میں لطافت کچھ نہیں

خاطرِ عزلت گزیں ہے دشمنِ نام و نمود
مرشی ہے جس تہ دنیا اس سے رغبت کچھ نہیں

اپنے لطفِ طبع کے باعث ہے شغلِ شاعری
آپ بھی خوش وقت ہوں اسکی ضرورت کچھ نہیں

ذوقِ فطری چھیڑتا ہے جب تو کہہ لیتا ہوں کچھ
وہ بھی جز افشائے اسرارِ محبت کچھ نہیں

وارداتِ نفس کے قصّے ہیں یا طومارِ غم
ماسوائے دردِ دل حرف و حکایت کچھ نہیں

جب یہ ہی محفل تو شانِ بے کمالی گیا گھٹی
واہ واہ کا غل ہوا بھی تو فضیلت کچھ نہیں

جوہرِ قابل ہے جس کو مان لیں اربابِ فن
خود وحیدِ عصر بن بیٹھے تو عزت کچھ نہیں

آپ بھی مجھکو نہیں پہچانتے صد آفریں
شکر ہے اس ناشناسی کا شکایت کچھ نہیں

دل نے سمجھایا مجھے ثاقب یہ مفہومِ خطاب
دوستوں کی بذلہ سنجی ہے حقیقت کچھ نہیں

کحل الجواہر

حسب فرمایش عالی جناب کرنل لسٹر صاحب بہادر بالقابہ معالج خصوصی امراض چشم سابق پروفیسر آئی ڈپارٹمنٹ کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ

۵- نومبر ۱۹۱۵ء

جان خوش ہی باغِ ہستی میں نہ دل مسرور ہے
کیا بہارِ زندگی جب آنکھ ہی بے نور ہے

صورتِ راحت کہاں آنکھوں میں دنیا ہی سیاہ
جل رہا ہی دل کہ ٹھنڈا کیوں چراغِ طور ہی

دید کے قابل تماشا گاہِ عالم ہے، مگر
وائے محرومی اگر آنکھوں سے تو معذور ہی

وہ طلسمی لوح سب کہتے ہیں جسکو مردمک
سات پردوں میں یہ رازِ منجلی مستور ہے

ایک نقطہ ہی جو ہی صورت کشِ ارض و سما
ایک تل ہی جسمیں عالم کی فضا محصور ہے

صنعتیں ہیں کلکِ قدرت کا مرقع دیکھئے
انطباعِ شکل کا حیرت نما دستور ہے

کب چھپی تصویر کب آنکھوں سے غائب ہوگئی
نقشِ اول کیا ہوا جب دوسرا منظور ہے

منطبع ہوتی ہیں لاکھوں رنگ کی شکلیں مگر
کوئی دھبا لوح پر رہ جائے کیا مقدور ہی

دیدۂ بینا بڑی نعمت ہی، دیکھو غور سے
لطفِ ہستی ہی جو آنکھوں میں ضیا و نور ہے

کور ہونا ہی گوارا یا بصارت ہے عزیز
اے مریضِ چشم بتلا کیا تجھے منظور ہے

کیوں ہے یہ آشوب کیوں جاری ہے پانی آنکھ سے ۔۔۔ آگیا ہے کچھ ورم پردوں میں یا ناسور ہے

خیر تُقبہ کی نہیں آنکھوں میں دانے ہیں اگر ۔۔۔ پتلیاں دھندلی ہوئیں تو روشنی کافور ہے

ابتدائے ہر مرض میں چاہئے فکرِ علاج ۔۔۔ حد سے گزرا درد تو لقمان بھی مجبور ہے

دو قدم زحمت اُٹھا آنکھوں کی صحت کے لئے ۔۔۔ تو ہے ناواقف نہ دارالطب زیادہ دور ہے

اس مطب میں خاص آنکھوں ہی کا ہوتا ہے علاج ۔۔۔ یہ مکاں آلاتِ نو ایجاد سے معمور ہے

ہیں اطبا حاذقِ فن جامعِ فضل و کمال ۔۔۔ علم کا مخزن ہے یہ دارالشفا مشہور ہے

اس توجہ کا جو ہے ثاقب کے حالِ زار پر

زیرِ بارِ منت و احساں دلِ رنجور ہے

در صفت فصل الربیع

حسب فرمائش جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم

بمقام ریاست بھوپال ماہ اگست سنہ ۱۹۱۸ء

سبزۂ گردوں سے اونچا ہے خیابانِ بہار ۔۔۔ برق بھی ہے اک چراغِ زیرِ دامانِ بہار

غازۂ رنگِ شفق میں ہے مہِ ماہِ ربیع ۔۔۔ مژدہ اے گلشن کہ رنگیں ہے گریبانِ بہار

ڈال دے تخمِ تلون اے سپہرِ سبزہ رنگ ۔۔۔ پھوٹ نکلیں خاک سے گلشن میں ایوانِ بہار

مائدہ ہی نعمتِ الواں کا ابرِ تیرہ میں — اک دن اس سرپوش سے ہوگا عیاں خوانِ بہار

زرد ہی رنگِ خزاں گھر کر سوادِ ابر میں — اک حصارِ آہنی ہی فوجِ سلطانِ بہار

صیقلی تیروں کی شکل آتی ہی بارانمیں نظر — سر سے پا تک آب میں ڈوبے ہیں پیکانِ بہار

کام اپنا کر چکی تیغِ مہِ اُر دی بہشت
سر خزاں کا ہو گیا ہے گوئے چوگانِ بہار

تمت بالخیر

کتبہ باقر حسین خوشنویس ملازم ریاست العالیہ
محمود آباد

تبصرہ

چکیدہ قلم جواہر رقم

عالیجناب مولانا مولوی سید محمد حسین صاحب عرف سید محمد نواب صاحب

رئیس لکھنؤ

ایم اے، ال آل بی، (علیگ)

منشی فاضل، مولوی فاضل، ملا فاضل

لکچرر شعبہ فارسی و اردو "لکھنؤ یونیورسٹی" لکھنؤ

باسمہ سبحانہ

الشعر میزان القول

ملکۂ شاعری ایک وہبی نعمت ہے جو مبدءِ فیاض سے مخصوص ہستیوں کو
عطا ہوتی ہے اور اس میں کسب و اکتساب اور تعلیم و تعلّم کو چنداں دخل نہیں
یوں کہنا چاہئیے کہ شاعر اس ملکہ کو شکمِ مادر سے لے کر پیدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے
کہ باوجود کثرتِ شعراء کے حقیقی اور فطری شاعر عالم میں بہت کم نظر آتے
ہیں۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جو بتقاضائے ذوقِ فطری علم ادب کی صحیح معنوں
میں خدمت کرتی ہیں۔ چنانچہ دورِ حاضر کے مایۂ ناز و بلند پایہ فطری شعراء
میں محترمی میرزا ذاکر حسین صاحب قزلباش **ثاقب** لکھنوی کی شخصیت
محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ میرزا صاحب نے زمینِ غزل میں وہ وہ گلکاریاں کی
ہیں جن سے ادبی دنیا بخوبی واقف ہے۔ رسالۂ شمع بابت ماہ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر
۱۹۲۷ء میں جناب شاکر حسین صاحب ہسوانی کا ایک مضمون بعنوان "حضرت
ثاقب لکھنوی (جانشینِ میر و غالب)" شائع ہو چکا ہے فاضل نامہ نگار نے

جناب میرزا صاحب کے مفصل سوانح حیات تحریر فرما دئے ہیں۔ وہ مضمون جناب
ثاقب کے کلام کے ابتدائی مدارج ارتقا پر بھی کافی روشنی ڈالتا ہے۔

غزل گوئی جس قدر آسان سمجھی جاتی ہے اسی قدر مشکل ہے، کیونکہ اس صنف نظم کا موضوع بالخصوص جذبات انسانی اور واردات قلبی ہیں خارجی امور کا ذکر صرف اسی حد تک جائز ہے جہاں تک انکا تعلق جذبات سے ہے اور باریک جذبات اور گوناگوں داخلی کیفیات کا اظہار موثر الفاظ اور دلکش پیرایہ میں اسی شخص سے ہو سکتا ہے جو ازل سے ملکۂ شاعری کے ساتھ دل پر درد رکھتا ہو اور جس کو زبان پر کافی قدرت حاصل ہو چنانچہ اُردو غزل گو باوجودیکہ بیحد و بیشمار گذرے لیکن میر تقی میرؔ اور اسد اللہ خاں غالبؔ کی غزلوں نے جو شہرت عام و بقائے دوام حاصل کی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ جناب **ثاقب** نے بھی میر کی زبان اور غالب کی تخیل کا تتبع کر کے ایسے اشعار پیدا کیے جو غزل کا طرۂ امتیاز ہو گئے۔ بعض بندشیں بھی نرالی ہیں اور بعض مقامات پر تخیل بھی جدید ہے۔ دیوان کے مطالعہ سے اسی نتیجہ پر آنا پڑتا ہے کہ میرزا صاحب فطرت سے یہ ذوق لے کر آئے اور اس کا اظہار وہ خود بھی فرماتے ہیں

ذوق فطری چھیڑتا ہے جب تو کہہ لیتا ہوں کچھ   وہ بھی جز افشائے اسرارِ محبت کچھ نہیں

اور لطف یہ ہے کہ میرزا صاحب بالطبع منکسر ایسے واقع ہوئے ہیں کہ موصوف کو اپنے کلام کی قدر بالکل نہیں ہے۔ اکثر کلام آپکا دستبرد زمانہ کی نذر ہو چکا ہے اور میرزا صاحب کی افتاد طبع سے یہ بھی کلام غفلت کے ہاتھوں برباد ہو جاتا۔ ادبی دنیا کو ممنون ہونا چاہئیے کہ عالیجناب معلی القاب راجہ **محمد امیر احمد خاں** صاحب بہادر بالقابہ دام اقبالہم نے باصرار بلیغ اس دیوان کی اشاعت کا حکم صادر فرما کر جناب **ثاقب** کے کلام بلاغت نظام کو منظر عام پر آنے کا موقع دیا۔

شاعری کے اہم عنصر دو ہیں (۱) الفاظ۔ (۲) تخییل۔ یہ دونوں جزو ایسے ضروری ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک میں ذرّہ برابر خامی رہ جائے تو کلام ردی ہو جاتا ہے اور شعر میں اثر نہیں رہتا۔ میرزا صاحب کے کلام کو اس معیار پر جانچنے سے ہر صاحب ذوق سلیم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپکے بیشتر کلام میں دونوں جزو بدرجہ اتم اور بوجہ احسن موجود ہیں۔ اس مقام پر اتنا گذارش کر دینا ضروری ہے کہ کسی شاعر کا کلام اول سے آخر تک

یکساں نہیں ہوتا۔ انسان کے کلام میں ناہمواری کا ہونا ضروری ہے۔ صرف کلام خدا ہی کو یہ مرتبہ حاصل ہے کہ من اولہ الی آخرہ حد اعجاز پر فائز ہے۔ کسی فحول شعرائے عرب سے دریافت کیا گیا کہ اسکی کیا وجہ ہے کہ آپکے بعض اشعار نہایت جیّد ہیں اور بعض نہایت ردی۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بالکل درست ہے مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ اشعارنا اولادنا (ہمارے اشعار مثل ہماری اولاد کے ہیں) اگر ان میں سے چند خراب بھی نکل جائیں جب بھی باپ کا دل ہرگز نہیں گوارا کرتا کہ ان کو گھر سے نکال دے۔ علاوہ بریں نظم کرنے کے اوقات اور دواعی بھی مختلف ہوتے ہیں اگر طبیعت حاضر ہوئی تو ڈھلے ہوئے شعر نکلتے ہیں ورنہ معمولی سے معمولی شعر کہنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ فرزدق جو عرب کے فحول شعراء میں سے تھا کہتا ہے کہ "تمرّ علیّ الساعۃ وقلع ضرس من اضراسی اھون علیّ من عمل بیت من الشعر" (بعض وقت ایسا آجاتا ہے کہ داڑھ کا نکال ڈالنا بہ نسبت شعر کہنے کے میرے لیے آسان تر ہوتا ہے) میر تقی میر کے فطری شاعر ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں۔ انکا واقعہ شاہد حال ہے۔ ایک روز نواب آصف الدولہ

بہادر نے میر صاحب سے ارشاد فرمایا کہ ہمارے لئے ایک غزل لکھ دیجیے۔ جب دو ایک روز کے بعد میر صاحب پھر خدمت میں حاضر ہوئے تو نواب صاحب نے غزل طلب فرمائی۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ سرکار عالی اشعار میری جیب میں تو رکھے نہیں کہ جب آپ طلب فرمائیں میں نکال کر حاضر کر دوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شاعر اپنی طبیعت سے اشعار نظم کرتا ہے تو وہ اکثر ان اشعار سے بہتر ہوتے ہیں جو کسی مصرعۂ طرح پر نظم کئے جائیں۔ نابغہ جعدی جو فحول شعرائے عرب میں شمار ہوتا ہے اس کے کلام کے متعلق اہل نقد و تبصرہ کی یہ رائے ہے کہ "وخمار بواف ومطرف بآلاف" یعنی اس کے کلام میں کہیں تو بیش بہا اشعار ہیں اور کہیں نہایت ردی ابو الطیب متنبی کے بارے میں بھی علمائے فن کی رائے ہے کہ اسکا کلام جتنا نہایت جید ہے اور کلام ردی نہایت ردی۔ میر جیسے مسلم الثبوت استاد کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند۔ پس ہمارے میرزا صاحب بھی فطرت بشری سے بالا و برتر نہیں ہیں آپ کے دیوان میں بھی کہیں کہیں سست اشعار ملیں گے۔ لیکن میرزا صاحب نے قریب قریب ہر غزل کی ابتدا میں تاریخ مہینہ

اور سال تحریر فرما دیا ہے جس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ میرزا صاحب کے ابتدائی کلام کا رنگ کیا تھا اور مشق کے بعد کیا ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ آپکے ابتدائی کلام میں اگرچہ پختگی کی جھلک نظر آتی ہے مگر فن کی حیثیت سے اُتار چڑھاؤ ضرور ہے اور اس عہد کے کلام میں میرزا صاحب اپنے مسلک سے علیحدہ بھی نظر آتے ہیں یعنی نامخیت کا غلبہ ہے مثلاً۔

عشق پیچاں قد جاناں نے بنایا **ثاقب** — اینڈنا بھول گئے سرو و صنوبر اپنا

محو ہوں یاد چہرۂ شاہد گلعذار میں — اب یہ خزاں نصیب دل جا کے ملا بہار میں

مرے لہو سے اگر ہو کے سرخ رو آئے — ملو تو برگ حنا میں وفا کی بو آئے

دیر پا ہے کس قدر **ثاقب** حسینوں کا شباب — عمر بھر اپنی جوانی کی قسم کھاتے رہے

میں سخت جاں نہیں خنجر بھی تیز ہے لیکن — نگاہ یاس سے قاتل کی تیز دستی ہے

آخری شعر میں بظاہر تعقید معلوم ہوتی ہے کہ شعر کو پڑھ کر اس کے مفہوم کی طرف ذہن فوراً منتقل نہیں ہوتا البتہ ذرا غور و تامل کے بعد مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ نگاہ یاس عاشق اور تیز دستی معشوق میں باہم مقابلہ ہے اور چونکہ نگاہ یاس معشوق کی تیز دستی پر غالب آ رہی ہے اس وجہ سے قتل عاشق میں

تاخیر ہو رہی ہے ایسے ہی اور بھی اشعار خال خال دیوان میں نظر پڑیں گے لیکن ابتدائی کلام بھی ابتذال۔ اہمال۔ رکاکت اور عریانی سے پاک اور صاف ہے دیکھنا یہ ہے کہ دیوان کا بیشتر حصہ کلام جید پر مشتمل ہے یا کلام ساقط وردی پر۔

بہرحال الفاظ کے متعلق اس قدر گذارش کر دینا کافی ہے کہ میرزا صاحب کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ الفاظ کی سادگی۔ ترکیبوں کی چستی محاوروں کی تبدش اور ان کا برمحل استعمال یہ سب چیزیں مل کر کلام میں وہ سلاست روانی اور موسیقیت پیدا کرتی ہیں کہ جس کا ذائقہ ہر صاحب زبان محسوس کرتا ہے۔ الفاظ اس در و بست سے ہیں کہ اگر ایک لفظ ادھر سے اُدھر ہو جائے تو وہ طلسم ٹوٹ جائے اور اگر کوئی لفظ بدل دیا جائے تو کلام پھیکا پڑ جائے اور اثر فنا ہو جائے۔ ایسا ہی کلام سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً چند شعر درج کئے جاتے ہیں:۔

سونے والے کو کیا خبر اے ہجر | کیا ہوا ایک شب میں کیا نہ ہوا
ہنس کے بھی رو کے بھی کہا لیکن | مطلب دل کبھی ادا نہ ہوا
حسرت ذبح رہ گئی ثاقبؔ | یہ فریضہ مرا ادا نہ ہوا

شوق پابوسیٔ محبوب تھا ورنہ **ثاقب** سنگ در پر کوئی موقع تھا جبیں سائی کا

یاس و امید کے مابین ہوئی ختم حیات ایک نے شاد کیا ایک نے ناشاد کیا

گلشن میں کہیں بوئے وفا نہیں آتی اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

برگشتہ ہوئی دنیا رسم و رہ الفت سے اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

جفا اٹھانے کی عادت پڑے تو کیونکر جائے ستم سہے مگر اتنے کہاں کہ جی بھر جائے

اکثر مقامات پر سادگی ادا کے ساتھ جدت طرازی سونے میں سہاگے کا کام کرتی ہے اور حسن کلام کو اس طرح دوبالا کرتی ہے جیسے رخ محبوب پر خال۔ بعض ترکیبیں بالکل اچھوتی ہیں جو مرزا صاحب کی طبع جدت پسند کا نتیجہ ہیں۔

مثلاً قفس کے لئے آشیانۂ ستم۔

یہ آشیانۂ ستم چمن میں ہو تو خوب ہے یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں قفس تو میرا [illegible]

یا خندۂ طرب نما

یہ خندۂ طرب نما مبارک اہل دہر کو بہت زمانہ ہو گیا کہ میری ہنسی کو رو چکا

یا دہر نما کتاب

حسن کی ایک فصل ہے عشق کا ایک باب ہے دیکھ چکے ہیں ہم اسے دہر نما کتاب ہے

اسی طرح مرزا صاحب کے دیوان میں جدید ترکیبیں جا بجا گوہر شب چراغ

کی طرح ضوء فشاں نظر آتی ہیں اور مصداق ۔ کل جن ہی لنی ینی لذت بخش ہیں
جناب میرزا صاحب نے محاوروں کا استعمال تو اس حسن سے کیا ہے کہ خود
محاورے میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ مثلاً منہ پر ہاتھ رکھنا محاورہ ہے چپ
کرنے کے مقام پر بولا جاتا ہے۔ ذیل کے شعر میں یہ محاورہ کس مزے سے نظم ہوا ہے

لحد پر چلنے والے تھم کہ ہم کچھ کہہ نہیں سکتے   زمیں رکھتی ہے منہ پر ہاتھ جب فریاد کرتے ہیں

یا کسی چیز پر تکیہ کرنا بھروسا کرنے کے مقام پر بولا جاتا ہے اس شعر میں کس
خوبی سے یہ محاورہ مستعمل ہوا ہے۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے   جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

جامے سے باہر ہونا آپے سے باہر ہو جانا اپنے اوپر اختیار نہ رہنا۔ اس محاورہ
نے کیا لطف پیدا کیا ہے ملاحظہ ہو۔

وہ اُلٹ کر جو آستیں نکلے   ظلم جامے سے اپنے باہر تھا

دم لینا یہ محاورہ ٹھہرنے کی جگہ بولا جاتا ہے۔ اس شعر میں کس خوبی
سے نظم ہوا ہے۔

عشق کے بعد اب حوادث کی ضرورت کیا رہی   آسماں دم لے مرے مرنے کا ساماں ہو گیا

غرضکہ میرزا صاحب کے کلام میں محاوروں کا استعمال بکثرت موجود ہے جس سے موصوف کی زباں دانی کا بخوبی پتہ چلتا ہے ۔

تخیل کے متعلق صرف اتنا عرض کردینا ضروری ہے کہ اگر قوت متخیلہ کا عمل شعر میں نہ ہو تو وہ نظم ساقط کہلاتی ہے۔ اور یہ قوت جس شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی اس کی شاعری بھی درجۂ کمال پر پہونچے گی۔ بالخصوص صنف غزل میں تو اس قوت کا ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ غزل ہی ایک ایسی نظم ہے جس میں باریک سے باریک انسانی جذبات کی عکس کشی ہوتی ہے۔ جناب ثاقب کی اعلیٰ تخیل کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ کے کلام میں حسن و عشق کا معیار نہایت بلند ہے عشق کرنا ہوس پیشہ لوگوں کا کام نہیں ہے بلکہ عشق وہ جذبہ ہے جو انسان کو معشوق حقیقی کی معرفت سے حاصل ہوتا ہے اور راہ عشق میں فنا ہو جانا سعادت دارین اور فوز عظیم ہے حسن فطری ظاہری آرائش اور بناؤ سنگار سے بالاتر ہے۔ چونکہ غزل کا دارو مدار زیادہ تر کیفیات حسن و عشق ہی پر ہے لہذا شاعر کا معیار حسن و عشق جتنا بلند ہوگا اُسکے کلام میں اُتنا ہی درد و اثر بھی ہوگا۔ ہمارے میرزا صاحب کا معشوق بازاری نہیں ہے بلکہ وہ ذات ہے جس کے عشق میں تمام کائنات سر گرداں ہے

اک لبِ خاموش بن کر شوقِ گویائی رہا　　　حمد کرتا کون عالم محوِ یکتائی رہا

ایسے معشوق کے اوصاف حدِ بیان سے باہر ہیں بلکہ بمصداق ع خاموشی

از ثنائے تو حدِ ثنائے تست۔ اس کی یکتائی میں محو ہو کر ساکت و صامت ہی

ہونا پڑتا ہے۔

عشق کا وزن نہایت گراں ہے یہی وجہ ہے کہ ہر کس و ناکس اس بار کا

متحمل نہیں ہو سکتا۔

متاعِ عشق میں اک وزن ہے نہایت کا　　　وگرنہ باغ پہ کیوں مشت پر گراں ہوتا

اگرچہ عشق تمام کائنات میں جاری و ساری ہے بقول میر ؎ یا رب کوئی تو

واسطہ سرگشتگی میں ہے۔ اک عشق بھر رہا ہے زمین آسمان میں۔ لیکن یہ عجیب کرشمہ

ہے کہ باوجود اس کے پھر بھی نایاب ہے۔

گو ہر عشق کی نایابی ہی عزت تو سمجھ　　　بھر دیا صحن جہاں کو مگر ارزاں نہ ہوا

عام اصول ہے کہ جو چیز کثرت سے پائی جاتی ہے وہ ارزاں ضرور ہوتی ہے مگر

عشق کی خاصیت بالکل جداگانہ ہے عشق کا تعلق محض دنیوی زندگی ہی تک محدود

نہیں ہے بلکہ بعد مرگ بھی یہ سلسلہ قائم رہتا ہے۔

دل کے ہوتے بھی کہیں درد جدا ہوتا ہے ۔۔۔ اک فقط موت کے آجانے سے کیا ہوتا ہے

عشق ایک راز سربستہ ہے جس کا افشا غیر ممکن ہے۔

دل نے رگ رگ سے چھپا رکھا ہے رازِ عشق کو ۔۔۔ جسکو کہدے نبض ایسی میری بیماری نہیں

عشق میں خودکشی کرلینا پست ہمتی کی دلیل ہے۔ جو عاشقِ صادق ہیں انکو منزلِ عشق کے تکالیف عین راحت ہیں۔

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر ۔۔۔ یہ مری ہمتِ عالی کو گوارا نہ ہوا

میرزا صاحب کے کلام میں اکثر و بیشتر مقامات پر حسن کا معیار حسن حقیقی ہے جہاں ہوا و ہوس کا طائرِ وہم بھی نہیں پہونچ سکتا۔ اور جس کے جلوے سے ظاہر بیں نظریں محروم رہتی ہیں۔ یہ صرف چشم حقیقت بیں کو شرف حاصل ہے کہ حسن حقیقی کے جلوے سے لطف اندوز ہو سکے۔

چھپاؤ آنکو جس رنگ یا جس بھیس میں چاہو ۔۔۔ مگر چشم حقیقت بیں سے پردہ ہو نہیں سکتا
تماشا چشم دل سے اہل عرفاں دیکھ ہی لینگے ۔۔۔ کسی پردے میں ہو تصویر جاناں دیکھ ہی لینگے

عاشق صادق کو وصال میں بھی انھیں آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو وہ ہجر میں برداشت کرتا ہے۔

وصال و ہجر میں چھپتا ہو دل کا حال کہیں　　　مجھے تو پیاس سوا ہو جلے تو بو آئے

فلسفۂ حیات کے متعلق میرزا صاحب کا نقطۂ خیال نہایت بلند ہے آپ نے حیات کے پیچیدہ مسئلے کو مختلف پہلوؤں سے ادا کیا ہے زندگی آلام و مصائب کا مجموعہ ہے۔ بہترین مآل زندگی عشق میں فنا ہو جانا ہے۔ یہ منزلت ایسی ہے کہ کوئی عید کوئی مسرت اس سے بڑھ کر نہیں۔

تہنیت موت کو دیتا ہو مرے دل کا مرض　　　عید ہے ماتم حسرت کا بپا ہو جانا

عشق میں زندگی وبال ہو جاتی ہے

جز فریب حسن اور الفت کو ثاقب کیا کہوں　　　زندگی سی شے کبھی اس پر بھی دل مائل نہ تھا

زندگی صرف اتحاد باہمی کی کرشمہ سازی کا نام ہے۔

اتحاد باہمی کا ہے نتیجہ زندگی　　　ذرے کیا شے تھے مگر ملنے سے انساں ہو گیا

حیات دنیوی مجموعہ ہے شادی و غم کا۔

یاس و امید کے مابین ہوئی ختم حیات　　　ایک نے شاد کیا ایک نے ناشاد کیا

یا یوں کہئے کہ حیات دنیوی مجموعۂ آمال و آمانی ہے۔

جہاں تھا تنگ جس طول امل کے پھیل جانے سے　　　لحد میں آگیا سارا وہ قصہ مختصر ہو کر

زندگانی دنیا ایک نقش بر آب بلکہ محض خواب و خیال ہے حقیقی حیات بعد

ات ہی میسّر ہوتی ہے۔

نظر کر غور سے آئینۂ اسرار ہستی پر — جسے تو زندگی سمجھا ہے وہ دھوکا ہی دھوکا ہے

راہ بری نہیں ہے چل سیر میں کیا مضائقہ — سارے جہاں کو دیکھ ڈال پر یہ سمجھ کہ خواب ہے

میرزا صاحب کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی اچھی خاصی پائی جاتی ہے

آپ کے کلام کا بیشتر حصّہ تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اس مقام پر صرف

چند شعر صوفیانہ مذاق کے وارد کئے جاتے ہیں :۔

اہل باطل ڈالتے ہیں تفرقہ اے چشم حق — ورنہ کعبے میں وہ کیا تھا جو کلیسا میں نہ تھا

چھپاؤ آپ کو جس رنگ یا جس بھیس میں چاہو — مگر چشم حقیقت بیں سے پردہ ہو نہیں سکتا

تماشا چشم دل سے اہل عرفاں دیکھ ہی لینگے — کسی پردے میں ہو تصویر جاناں دیکھ ہی لینگے

منزل وحدت پہ جانا کام ہر اک کا نہیں — راہ اچھی ہے مگر کوئی مسافر بھی تو ہو

ڈھونڈتے ہیں سب تجلی گاہ دوست — قمریوں کی ورنہ کو کو کس لئے

پردہ رہا کہ جلوۂ وحدت نما ہوا — غش نے خبر نہ دی مجھے کب سامنا ہوا

حسن نے عالم وحدت میں مجھے یاد کیا — میں یہ سمجھا کہ مجھے عشق نے برباد کیا

علو ظرف، شرافت نفس اور مدارا کے باب میں میرزا صاحب کے خیال کی بلند پروازی قابلِ دید ہے۔

وقفِ زباں اہلِ حسد ہے لو مرا ۔۔۔ خوش ہو رہا ہوں وادیِ پرخار دیکھ کر

ثاقب ملال اہلِ حسد بھی ہے ناگوار ۔۔۔ کیا خوش ہوں اپنی طبعِ سخن آفریں سے ہم

کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہوگا مرے دل سے ۔۔۔ نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہدوں عنادل سے

اس میں شک نہیں کہ خودداری کے متعلق متقدمین نے خوب خوب کہا ہے ہمارے مرزا صاحب نے بھی خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

اپنا ساز ور کر کے تھکے منعمانِ دہر ۔۔۔ مٹھی نہ کھل سکی مرے دستِ سوال کی

جیتے جی سایۂ دیوارِ چمن تک نہ گیا ۔۔۔ مرکے کیا پھول کا شرمندۂ احساں ہوگا

پیشِ اربابِ کرم ہاتھ وہ کیا پھیلاتا ۔۔۔ جس کو تنکے کا بھی احسان گوارا نہ ہوا

میرزا صاحب جادۂ تسلیم و رضا اور صبر و تحمل کی منزلیں یوں طے فرماتے ہیں کہ

جوابِ زخمِ جگر دے رہا ہوں ہنس ہنس کر ۔۔۔ وہی تو دل ہے کہ جو خوش رہے مصیبت میں

درِ قفس نہ کھلا قدرِ صبر کر صیاد ۔۔۔ تڑپتے ہم تو پہاڑوں میں راستا کرتے

نہیں معلوم ہے کس حال میں ہیں باغِ عالم میں ۔۔۔ قفس والے بھی مجھکو دیکھکر فریاد کرتے ہیں

بعض اہلِ فن نے محاکات ہی کو شعر کی روح رواں قرار دیا ہے۔
ہمارے میرزا صاحب نے بھی عکس کشی کے پردے میں اکثر جذبات کی
ایسی تصویریں کھینچی ہیں کہ مجردات و معقولات کے مجسمے پیشِ نظر ہو جاتے ہیں

بیٹھا ہے کسی امن کے گوشہ میں اثر بھی ‏— تنہا ہے دعا شب وہ ڈرانی ہو کہ تو یہ

بیچ میں تھا میں اِدھر گلچیں اُدھر صیاد تھا ‏— کس ہجوم نامرادی میں دلِ ناشاد تھا

صبح کا ذب اور کیا کرتی چمک کر رہ گئی ‏— وصل کی امید بڑھتے بڑھتے تھک کر رہ گئی

اضطراب دل نظر آنے لگا تحریر میں ‏— نامہ لکھتے وقت کیا جانے قلم کیونکر چلا

میرزا صاحب نے داستانِ عشق یا افسانۂ حیات کے اظہار کے لئے بھی مختلف
پہلو اختیار کئے ہیں اور جو کچھ کہا ہے وہ ایسے موثر اور پُر درد لہجہ میں ادا
کیا ہے کہ دل پر نشتر کا کام کرتا ہے۔ چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں

دنیا کو نیند آتی ہو اب اس فسانے میں ‏— جس میں بھرا ہوا ہو مری زندگی کا حال

وہ میری عمر گذشتہ نہ تھی کہانی تھی ‏— بڑھائی جس نے تری نیند مجھکو تڑپا کر

یوں ہی سہی مرا قصہ کبھی بیاں ہوتا ‏— نہ جاگتے نہ سہی سن کے نیند تو آتی

عاشق ہے ان کی نیند مری داستان پر ‏— میری طرح سے ہے حال مرا انکا خیر خواہ

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سوگئے داستاں کہتے کہتے

اس شعر نے تو وہ حسن قبول کا مرتبہ پایا کہ ضرب المثل ہوگیا۔ داستان حیات یا قصہ غم کے سننے کے لئے تمام عالم ہمہ تن گوش تھا لیکن قابل افسوس یہ امر ہے کہ وہ افسانہ ہنوز ناتمام ہی تھا کہ ہمیں نیند کے بھیس میں موت آگئی۔ اس بیت کا ایک ایک لفظ دل پر نشتر کا کام کرتا ہے۔ عالیجناب کنور سید حسن مہدی صاحب بی۔ اے دام اقبالہ خلف الصدق عالیجناب معلی القاب سر راجہ سید ابو جعفر صاحب بہادر مرحوم اعلی اللہ مقامہ ایک نج کی صحبت میں تذکرہ فرماتے تھے کہ یہ شعر جناب راجہ صاحب بہادر طاب ثراہ کو ایسا پسند آیا تھا کہ مرحوم نے مرض الموت کی حالت میں وفات سے تین چار روز قبل اس کو اپنی زبان مبارک پر اکثر جاری فرمایا۔ عالیجناب سر راجہ صاحب بہادر اعلی اللہ مقامہ طبقۂ علماء و مجتہدین کرام میں ذوالریاستین کے لقب سے مشہور تھے یعنی علاوہ دنیوی وجاہت و ریاست کے مرحوم اعلی اللہ مقامہ فاضل جلیل القدر اور ادیب کامل تھے اور علم ادب کے تمام شعبوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے ایسے ہی

حضرات کی تعریف کمال فن کی سند سمجھی جاتی ہے اور میں جناب میرزا صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اگر موصوف صرف یہی ایک بیت کہتے تو اُن کے استادِ فن ہونے کی کافی سند تھی۔

جدت ادا سے فرسودہ مضمون میں تازگی اور شگفتگی اس طرح آجاتی ہے جیسے چمن خزاں رسیدہ میں بہار یا تن بیجاں میں روح۔ جدت کا خاصہ ہے کہ خود بخود قلب سامع پر اثر کرتی ہے اور مضمون بالکل اچھوتا معلوم ہونے لگتا ہے۔ لیکن نہ ہر جدت میں لذت ہے اور نہ ہر ندرت میں لطافت۔ وہی جدت حسن پیدا کرتی ہے جس کا موجد مذاق سلیم ہو اور مضمون اس طرح ادا ہو کہ مضمون ماسبق کو نسیاً منسیاً کر دے۔ جناب ثاقب کے کلام میں اکثر مقامات پر ایسی ہی جدت پائی جاتی ہے۔ مثلاً عاشق کے دل میں شکایتوں کے دفتر ہوتے ہیں لیکن جب معشوق کا سامنا ہوتا ہے تو عاشق دم بخود رہ جاتا ہے۔ لبوں پر مہر سکوت لگ جاتی ہے ایک حرف بھی شکوے کا نہیں نکلتا یہ مضمون عام ہے لیکن میرزا صاحب نے اسکے اظہار کا ایک جدید پہلو اختیار کیا ہے۔

انکی بزم ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی نالہ کش برسوں کا اک تصویر بن کر رہ گیا

باوجودیکہ مدتوں نالہ و فریاد کرتا رہا لیکن معشوق سے دوچار ہونا تھا کہ ناز حسن سے مرعوب ہو کر دل عاشق مثل تصویر خاموش ہو گیا شکایتوں کے دفتر دھو گئے۔

حسرتوں کا بیحد دہتیار رہنا بھی ایک پامال مضمون ہے مگر جناب میرزا صاحب کی جدت پسند طبیعت اس میں بھی نئے شگوفے کھلائے بغیر نہیں رہتی۔

دل نے اپنی حسرتوں کے قافلے ٹھہرا دئے اس قدر آباد پہلے کوچۂ قاتل نہ تھا

عاشق کی دلی تمنا ہوتی ہے کہ معشوق سے خلوت میں ملے۔ میرزا صاحب اس مضمون کے اظہار کے لئے ایک انوکھی طرز ایجاد فرماتے ہیں۔

خلوت پسند حشر سے خوش ہو کے کیا کریں وعدے کا روز جلوہ گہ عام ہو گیا

حشر کے دن ہر متنفس اپنے اعمال کی جزا یا سزا پائیگا۔ جناب ثاقب حسن تعلیل کے پیرایہ میں اسی مضمون کو جدت کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں۔

اس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

جناب میرزا صاحب نے بعض مقامات پر تو جدت سے وہ کام لیا ہے کہ عقل

دنگ ہو جاتی ہے۔ بندش ایسی نرالی ہے کہ بظاہر اجتماع ضدین پیدا ہوتا ہے لیکن یہی اجتماع اضداد لطف معنی کو بڑھاتا ہے۔ اس قسم کا کلام سوائے فطری شاعر کے اور کسی دوسرے سے ناممکن ہے۔

عید ہے ماتم حسرت کا بپا ہو جانا تہنیت موت کو دیتا ہے مرے دل کا مرض

اے دل زار یہی وقت ہے مر جانے کا نزع اک عید ہے روتے ہوئے وہ آئے ہیں

یہ شعر بھی میرزا صاحب کے ماہر نفسیات ہونے پر کافی روشنی ڈالتا ہے معشوق کو عاشق کے حال زار پر کبھی رحم نہیں آتا لیکن، عاشق سے دلی تعلق اور اندرونی محبت ضرور ہوتی ہے۔ اس محبت کے اظہار کا موقع معشوق کو نہ ملتا تھا۔ عاشق کی نزع کی حالت میں معشوق کے دل پر کچھ ایسی چوٹ لگی کہ آتش درونی شعلہ زن ہوگئی اور وہ باچشم پرآب عاشق تک آہی گیا عاشق اپنے دل سے کہتا ہے کہ دیدار معشوق عید ہے اب اس سے بہتر موقع جان دینے کا نہیں مل سکتا۔ نہ نزع کا عالم پھر ہوگا نہ معشوق کا دیدار نصیب ہوگا۔ عالم نزع کو عید سے تعبیر کرنا اور پھر اس کو عید ثابت کر دینا مرزا صاحب کے کمال شاعری کی دلیل ہے۔

زخم جو خونبار تھے وہ روتے روتے ہنس دئے　　کچھ نہ کچھ ناوک ترا قلب حزیں سے کہہ گیا

عشق کی چوٹ سے دل عاشق کے زخم خوں کے آنسو رو رہے تھے۔ جب معشوق کا پیکان نظر ان زخموں پر لگا وہ کھل گئے یعنی روتے روتے ہنس پڑے۔ نہ معلوم تیر نظر نے کیا فقرہ ان زخموں سے کہہ دیا۔

جواب زخم جگر دے رہا ہے ہنس ہنس کر　　وہی تو دل ہے کہ جو خوش رہے مصیبت میں

زخم جگر کے پہلو میں زخم دل کے ہونے کو مرزا صاحب یوں بیان فرماتے ہیں کہ جس قدر زخم جگر فراخ ہے اسی قدر زخم دل بھی کشادہ ہے کشادگی زخم کو ہنسنے سے تعبیر کیا ہے اور دوسرے مصرعہ میں فرماتے ہیں کہ دل عاشق تو دراصل ایسا ہی ہونا چاہئے کہ جو کوئی مصیبت پڑے اس کا کشادہ پیشانی سے خیر مقدم کرے۔

جناب میرزا صاحب کو زبان پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ ایک ایک پیرایہ میں سینکڑوں مختلف مضمون اس طرح ادا کئے ہیں کہ شاید و باید بالخصوص آشیانے و قفس کی تمثیل میں تو آپ نے وہ مضمون آفرینی کی ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کی طبع نے ایسی بلند پروازی کی ہو۔ پرندوں کی زبانی

ان کے مختلف حالات و کیفیات کے اظہار میں مرزا صاحب کو فطری میلان ہے اور یہ تمثیلی پیرایہ مرزا صاحب ہی کا خاص حصہ ہے دیوان میں اس قسم کے شعر بکثرت موجود ہیں۔ اس مقام پر چند شعر ذکر کئے جاتے ہیں۔

حسن کو دیکھ کر بے اختیار عشق پیدا ہوتا ہے۔ یعنی عشق ایک کیفیت اضطراری ہے جو ارادہ اور اختیار کے حدود سے باہر ہے۔

گلشن بہار پر تھا نشیمن بنا لیا　　میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا

زمانہ ہمیشہ درپئے آزار رہتا ہے۔ گوشہ میں بھی کوئی اطمینان سے زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

گلچیں بُرا کیا جو یہ تنکے جلا دئے　　تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا

بعد فنا مرنے والے کی ذرا سی بھی نشانی اہل دنیا کو عبرت کا سبق دیتی ہے

بن کے عبرت کی زباں کہتا رہیگا کچھ نہ کچھ　　صحن گلشن میں اگر میرا کوئی پر رہ گیا

اس شعر میں پر کی تعبیر زبان عبرت سے نہایت بلیغ تشبیہ ہے۔

خانہ بربادی کا داغ دل پر بہت گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔

گلشن سے اُٹھ کے میرا مکاں دل میں آگیا　　اک داغ بن گیا ہی نشیمن جلا ہوا

داغ دل جلے ہوئے آشیانے کی مکمل تصویر ہے۔

انسان ایک نہ ایک مصیبت میں ضرور مبتلا رہتا ہے۔

نشیمن آگ سے بچتا تو خوف برق کا تھا　　جو باغباں بھی نہ ہوتا تو آسماں ہوتا

اپنی بنائی ہوئی چیز سے خواہ وہ حقیر ہی کیوں نہ ہو فطرتاً محبت ہوتی ہے
اور اس کے عوض میں اگر بہتریں شئے بھی ملے تو ہیچ ہے۔

قفس کی تیلیاں اچھی ہیں تنکوں سے نشیمن کے　　یہ سب کچھ ہے مگر صیاد دل پر کیا اجارا ہے

قفس اور آشیاں کا حال اے صیاد سن مجھ سے　　یہ تیری دستکاری ہے اسے میں نے بنایا ہے

مکاں منعم کا سونے سے یہ خونِ دل سے بنتا ہے　　خس و خاشاک کا گھر بھی بڑی مشکل سے بنتا ہے

تمام کائنات سے ہمدردی کا اظہار یوں ہوتا ہے۔

کسی کا رنج دیکھوں تاب نہیں ہے گا مرے دل سے　　نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہہ دوں عنادل سے

ایک مصیبت اپنے ساتھ سیکڑوں مصیبتیں لاتی ہے۔

برق کے گرنے سے ماتم ایک ہی ہوتا تو خیر　　آشیاں کے ساتھ آنچ آئی مری حسرت پہ بھی

خانہ بربادی وہ عظیم مصیبت ہے کہ جسکی خلش عمر بھر دل میں رہتی ہے اور
اذنائے محرک اس مصیبت کو تازہ کر دیتا ہے۔

ہو گئے برسوں کہ آنکھ نکی کھٹک جاتی نہیں جب کوئی تنکا اُڑا گھر اپنا یاد آیا مجھے

مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا دوست بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

غنیمت ہے قفس فکر رہائی کیا کریں ہمدم نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہو گلشن میں

اس بیت میں تو مرزا صاحب نے ایجاز کی حد ختم کر دی قفس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالم گرفتاری ہے اور "ہمدم" صاف بتاتا ہے کہ ایک قفس میں کم از کم دو طائر ہیں لہذا مضمون یوں پورا ہوتا ہو کہ صیاد نے گلستاں سے کچھ طائر گرفتار کر کے ایک قفس میں بند کر دئے ہیں۔ دونوں طائروں کی گفتگو بتاتی ہے کہ ایک طائر قفس کی زندگی سے عاجز آ کر رہائی کا متمنی ہے اور دوسرے طائر سے آزادی کی تدبیریں پوچھتا ہے جس پر دوسرا طائر تسلی بخش لہجہ میں کہ مبادا جواب صاف سے اسکی دل شکنی ہو اس سے اس طرح ہم کلام ہوتا ہے کہ قفس ہی کو غنیمت سمجھنا چاہئے کیوں کہ اگر ناخن تدبیر سے بند قفس کی گرہ کسی نہ کسی طرح کھل بھی گئی تو نہ معلوم گلستاں میں کیا بربادی اور تباہی کے سامان دیکھنے میں آئیں۔ اسلئے کہ گرفتاری ہی کے وقت سے گلشن میں

باد مخالف کا دور دورہ شروع ہوگیا تھا اب تو نہ معلوم کن کن جانکاہ مصائب
کا سامنا کرنا پڑے قفس میں اتنا تو ہے کہ آب و دانہ جس پر مدارِ زندگی
ہے روزانہ مل جاتا ہے۔ اگر آزاد ہو کر چمن میں پہونچے تو کہیں جان سے
ہاتھ نہ دھونا پڑے۔ غنیمت کا لفظ قناعت و توکل کی بھی تعلیم دیتا ہے۔
اس قسم کے شعر بکثرت دیوان میں موجود ہیں بخوف اطالت انہیں چند مثالوں
پر اکتفا کی جاتی ہے۔

تشبیہات و استعارات۔

بلاغت کا زیادہ تر دارو مدار تشبیہ و استعارہ پر ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں
جو بلاغت کی روح رواں اور علم بیاں کی جان ہیں۔ یہی وہ طلسم ہے کہ جسکے
ذریعہ سے ایک ایک مفہوم سو سو پیرایوں میں ادا ہو سکتا ہے اور سچ پوچھئے
تو کلام میں زور اور اثر بھی انھیں کی بدولت پیدا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی شک
نہیں کہ یہی تشبیہ اگر بعید از قیاس اور یہی استعارہ اگر پیچیدہ اور دور از کار ہو
تو بجائے حسن پیدا کرنے کے یہی چیزیں کلام کو بدنما کر دیتی ہیں۔ لہذا تشبیہ اور استعارہ
کا استعمال بھی ذوق سلیم ہی پر موقوف رہا۔ دیوان کے مطالعہ سے میرزا صاحب کے

مذاق سلیم پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ موصوف نے وہی تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے ہیں جن سے مفہوم شعر واضح ہوتا ہے اور حسن کلام اور قوت اثر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دیوان نازک تشبیہوں اور لطیف استعاروں سے مملو ہے نمونہ کے طور پر چند شعر درج ذیل کئے جاتے ہیں:۔

سایہ افگن ہے خدا رکھے ہمائے اقبال
کہ ہے پرواز میں کھولے ہوئے شہپر سہرا

ساز و برگ فقر اکچھ نہیں اک دل کے سوا
لے چلا ہوں اسی کشتی میں لگا کر سہرا

میرے دل کے زخم اور انکی شماتت دیکھئے
ہنس دئے کشتۂ تمنا جب لہک کر رہ گئی

دکھا گئے وہ چاند کو اپنے گمان پر
میں خوش ہوا کہ تیر چلے آسمان پر

غصے کے بعد تیغ زنی کا محل نہیں
پہلے ہی ذبح ہو گئے چین جبیں سے ہم

کچھ دفا کچھ ظلم کے آثار رہنے دیجئے
خون میں ڈوبی ہوئی تلوار رہنے دیجئے

یہ شام تار یہ روز نا پسند ہے مجھکو
حیات بخش ہیں چشمے دیار ظلمت کے

دیکھئے تو آکے شام ہجر کے نقش و نگار
بخت کی تصویر کھینچی ہے شب دیجور نے

دل نے اپنی حسرتوں کے قافلے ٹھہرا دئے
اس قدر آباد پہلے کوچۂ قاتل نہ تھا

شکایت ظلم خنجر کی نہیں غم ہے تو اتنا ہے
زبان غیر سے کیوں موت کا پیغام آتا ہے

داغ دل عاشق کی تشبیہ چراغ یا ماہتاب یا آفتاب سے نہایت فرسودہ ہے
اسی مبتذل تشبیہ میں مرزا صاحب نے تصرف کر کے کیا لطف پیدا کیا ہے

داغ دل قبر کی ظلمت میں ہے بے نور ایسا　　　جیسے دیکھا ہو چراغ آپنے ویرانے کا
ثاقب سیاہ خانۂ دل میں یہ داغِ عشق　　　اک چاند ہے کہ زینتِ کاشانہ ہو گیا
صبح سمجھے تھے کسے ثاقب شبِ غمِ طولِ　　　دل کا کوئی داغ ہو گا جو چمک کر رہ گیا
کیوں میرے داغِ دل کی ہے دشمن ہوائے دہر　　　ایسے چراغ بجھ نہیں سکتے زمانے میں
سپید بال ہوئے دل کا داغ جلتا ہے　　　سحر ہوئی یہ ابھی تک چراغ جلتا ہے

اگرچہ بے محل ہے لیکن اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ بعض
الفاظ اہل فن سے فی زمانا متروک الاستعمال قرار دیتے ہیں لیکن دیوان
میں کچھ ایسے الفاظ موجود ہیں جو متروکۃ الاستعمال کی فہرست میں آتے
ہیں مگر میرے نزدیک اگر وہ مانوس ہیں اور غرابت کی حد تک نہیں پہونچتے
تو خواہ مخواہ انکو ترک کر کے زبان کے دائرہ کو بے وجہ کیوں تنگ کیا جائے
کوشش تو یہ ہونی چاہئے کہ جہانتک ہو سکے زبان میں وسعت پیدا کیجائے
منجملہ ان الفاظ کے لفظ " دیہ " ہے بمعنی مگر جو میرزا صاحب کے کلام میں

موجود ہے جیسے مذکورہ بالا شعر میں یا ذیل کے شعر میں۔

اچھی تھی مرگ عشق پہ بدنام ہوگیا　　میرے ہی سر وفا کا بھی الزام ہوگیا

اسی طرح لفظ "تب" بمعنی اس وقت دیوان میں موجود ہے۔

فسانہ ذبح کا جز خونِ آرزو نہ رہا　　چھری گلے پہ چلی تب کہ جب لہو نہ رہا

کوئی تو داد دیتا اس درد دل کی آخر　　جب تم نہ بولتے تھے تب میں کراہتا تھا

یا لفظ "سدا" ہمیشہ کے معنوں میں۔ حالانکہ میر انیس جیسے خدائے سخن نے "پہ" بمعنی مگر اور لفظ سدا بمعنی ہمیشہ برابر استعمال کئے ہیں مگر بعض اہل فن ان الفاظ کو بلا وجہ ترک فرما رہے ہیں۔ چنانچہ میرزا صاحب نے سدا کا لفظ استعمال کیا ہے۔

آئنہ جس میں سدا ڈوب کے ابھرا کیا حسن　　ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا

جناب میرزا صاحب کے کلام میں محنت کا لفظ تقریباً لغوی معنی رنج و الم میں مستعمل ہوا ہے۔ اسی طرح منظور کا لفظ بھی کہیں کہیں لغوی معنول میں استعمال کیا گیا ہے۔　　(صنائع و بدائع)

صنائع لفظی ہوں یا معنوی جملہ ارباب فصاحت و بلاغت نے محسنات

کلام میں داخل کئے ہیں یعنی صنعتوں سے کلام کی آرائش اور سخن کی زینت ہوتی ہے لیکن انکا استعمال بھی اسی حد تک ہونا چاہیئے کہ جہانتک مفہوم کلام میں خلل نہ واقع ہو ورنہ یہی محسنات بجائے حسن پیدا کرنے کے کلام کو معیوب اور بدنما کر دیتے ہیں اور ایسی صورت میں شعر محض الفاظ کا گورکھ دھندا بن کر رہ جاتا ہے جسکو مطلب سے کوئی مطلب ہی نہیں رہتا غرضکہ صنائع کا استعمال نظم میں اس طرح ہونا چاہیئے کہ جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے کسی خاص صنعت کے لانے میں تکلف اور تصنع سے بالکل کام نہیں لیا بلکہ وہ بیساختہ نظم ہو گئی اور تشبیہ واستعارہ کی طرح وضاحت مطلب میں کافی معین ہو۔ میرزا صاحب کے کلام میں صنائع کا استعمال ایسا برمحل اور اس بیساختگی سے ہوا ہے کہ جس میں تکلف کا شائبہ تک نہیں نظر آتا بلکہ کلام میں اثر اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کش ناظرین کرام کی جاتی ہیں۔

صنعتِ تضاد یا طباق کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ صنعت بمصداق تعرف الاشیاء باضدادھا مفہوم واضح کرنے

کے لئے بہترین آلہ ہے :۔

دل کو تاکید وفا ہے کہ فنا ہو جانا
درد کو حکم قضا ہے کہ دوا ہو جانا

شمع ساں منتظر صبح نہ رہنا اے دل
شب فرقت کو دعا دے کے فنا ہو جانا

چار دن کی اس بلندی پر بھی تھی پستی نہاں
آشیانے سے نظر آتا تھا گھر صیاد کا

کیا کہے بے زباں اسیر قفس
کیوں ہوا قید کیوں رہا نہ ہوا

بدل بدل کے جہاں اعتبار کھو بیٹھا
خوشی میں بھی مرے دل کو ملال تھا ہے

(صنعتِ مقابلہ)

ہجر کے درد کو بڑھنے دے کہ ہے مژدۂ وصل
وہی گھٹتا ہے جہاں میں جو سوا ہوتا ہے

اس درد محبت کے انداز نرالے ہیں
گھٹتا تو مرض ہوتا بڑھتا تو دوا ہوتا

(صنعت مراعاۃ النظیر)

آئینہ بن کر نہ جا اے دل مقابل حسن کے
تو کوئی سودا نہیں لے لوں جسے بازار سے

گلچیں بُرا کیا جو یہ تنکے جلا دئے
تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا

اللہ رے خار عشق کی وحشت نوازیاں
کیا ذکر جیب دامن دل تار تار تھا

(صنعتِ ایہام)

جیتے جی آئے قیامت تو مزا ہے ثاقب
دیکھ لیں وعدۂ فردا کا وفا ہو جانا

(صنعتِ تلمیح)

کام کر جاتے ہیں بے حس بھی اگر حس ہو تو دیکھ
نام تصویروں نے رکھا مانی و بہزاد کا

جلوے میں اثر کیا تھا موسیٰ سے کوئی پوچھے
کام آ گیا غش ورنہ کیا جانئے کیا ہوتا

کشفِ رازِ عالمِ باطن ہے حصہ حسن کا
حضرت یوسف کو کتنا دخل تھا تعبیر میں

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر
یہ مری ہمتِ عالی کو گوارا نہ ہوا

(صنعتِ لف و نشر مرتب)

قہقہے ہم نے سنے دنیا میں اور فریاد بھی
ایک ہی رستے سے گزرے شاد بھی ناشاد بھی

(صنعت لف و نشر غیر مرتب)

یاس و امید کے مابین ہوئی ختم حیات
ایک نے شاد کیا ایک نے ناشاد کیا

(صنعت تقسیم)

قفس اور آشیاں کا فرق اے صیاد محسن ہے
یہ تیری دستکاری ہے اسے میں نے بنایا ہے

(صنعت جمع)

نبض ہو یا دل ہو اس کا کیا علاج
ڈوبنے والا ابھر سکتا نہیں

(صنعت تفریق بعد الجمع)

دل میں دو بوندیں لہو کی ہیں مگر اے تیغ زن ۔۔۔ ایک دامن پر رہیگی اور ایک شمشیر پر

(صنعت اشتقاق)

عبرت دہر ہو گیا جب سے چھپا مزار میں ۔۔۔ خیر جگہ تو مل گئی دیدۂ اعتبار میں

صنعت حسن تعلیل کلام میں ایک خاص اثر پیدا کر دیتی ہے۔ فطری اور حقیقی سبب سے قطع نظر کر کے جو مصنوعی سبب بیان کیا جاتا ہے وہ اگر کلام میں اس طرح ظاہر ہو کہ حقیقی سبب معلوم ہونے لگے تو جدت سبب کی وجہ سے یہ صنعت نہایت مؤثر اور دلکش ہو جاتی ہے۔ میرزا صاحب کے کلام میں بھی یہ صنعت کس حسن سے استعمال ہوئی ہے۔

قابل دید ہے شادی میں یہ خود داری حسن ۔۔۔ پاؤں رکھتا نہیں محفل کی زمیں پر سہرا

کیوں نہ آجائے قدم تک پئے عفو تقصیر ۔۔۔ کہ چڑھا فرط طرب سے ترے سر پر سہرا

شوق پا بوسی محبوب تھا ورنہ ثاقب ۔۔۔ سنگ در پر کوئی موقع تھا جبیں سائی کا

اس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر ۔۔۔ رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

نہ آنکھ بند کروں میں تو کیا کروں یا رب ۔۔۔ وہ آرہے ہیں تماشائے جاں کنی کیلئے

ضرب الامثال

جناب میرزا صاحب کے کلام کی مقبولیت کا فی الجملہ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آپ کے اکثر اشعار بطور مثل زبان زد خاص و عام ہوگئے ہیں کوئی کلام عام مقبولیت اسی حالت میں حاصل کرتا ہے جب اس میں لفظی اور معنوی خوبیاں ایسی ہوں کہ سنتے ہی دل پر خاص طرح کا اثر کرے اور حافظہ کے خزانے میں محفوظ ہو جائے۔ اس موقع پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو میرزا صاحب کے کمال فن پر روشن دلیل ہیں ارادہ یہ تھا کہ وہ اشعار صرف نقل کر دئے جاتے لیکن بعض احباب کا اصرار ہے کہ ان اشعار کے کچھ محاسن بھی واضح کر دئے جائیں۔ لہذا تعمیل ارشاد کے لئے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ اگرچہ کسی شعر کی شرح کرنا بعینہ ایسا ہی ہے کہ کسی حسین کے محاسن کو الگ الگ گنوانا حالانکہ حسن ان تمام خوبیوں کی مجموعی کیفیت کا نام ہے اگر زلف دراز یا ابروے خمدار یا چشم فتاں یا رخِ روشن یا خال رخ وغیرہ کو علٰحدہ علٰحدہ ذکر کیا جائے تو ان سے

دل پر وہ اثر نہیں ہوتا جو تمام محاسن کی ترکیب و تالیف سے ہوتا ہے۔
یہی حالت شعر کی ہے کہ اس میں بھی خیال کے اظہار میں الفاظ اور انکی
ترکیب سے ایسا طلسم بندھتا ہے جو علیحدہ علیحدہ شرح کرنے سے
ٹوٹ جاتا ہے۔ تاہم جس طرح حسن کے اظہار کے لئے سوائے اسکے
کوئی چارہ نہیں کہ علیحدہ علیحدہ محاسن کا شمار کر دیا جاوے اسی طرح
مرزا صاحب کے کلام کی چند نمایاں خوبیاں اس مقام پر ذکر کی جاتی
ہیں لیکن یہ واضح رہے کہ ہر شعر میں وہ اندرونی اثر نہاں ہے کہ جس کے
اظہار سے زبان قلم قاصر ہے اور جو الفاظ سے کسی طرح ادا نہیں ہوسکتا

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اس شعر کی مختصر شرح اوپر ہو چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی

تہنیت موت کو دینا ہے مرے دل کا مرض عید ہے ماتم حسرت کا بپا ہو جانا

ہجر میں عاشق صادق کی حالت کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک لمحہ زندگی
اس کو وبال ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں عاشق کے دلی کیفیات کی حقیقی عکس
کشی کی گئی ہے۔ مرض عشق مرگ عاشق پر مبارکباد دیتا ہے کہ موت سے

ہجر کی طویل مدت تو ختم ہوئی اور حسرتوں کے خون ہونے پر عید مناتا ہے
کیونکہ اگر زندگی باقی رہتی تو نہ معلوم حسرتوں کا سلسلہ کہاں تک پہونچتا
خیال نہایت بلند ہے اور الفاظ کی رنگ آمیزی تو ایسی ہے کہ وہ رنگ
مذاق سلیم کی آنکھوں میں کھپا جاتا ہے۔ ندرت و جدت کا یہ عالم ہے
کہ موت کے لئے بجائے تعزیت کے تہنیت اور حسرت کے ماتم کی عید
ہو رہی ہے کیا مرزا صاحب کی قادر الکلامی اس سے نہیں ثابت ہوتی؟

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے   جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مضمون تو صرف اتنا ہے کہ مصیبت کے وقت دوست بھی دشمن ہو جاتے
ہیں۔ مگر میرزا صاحب کی قوت متخیلہ کی پرواز اور جدت ادا کی ایجاد قابل
داد ہے۔ ایک طائر کی زبانی یوں کہنا کہ باغباں جو اس کا رقیب یا دشمن جان
ہے جب اس نے آشیانے میں جو طائر کی کل کائنات ہے آگ دی تو درخت
کے پتے جن کی دوستی پر اعتماد کلی تھا اور جو آشیانے کو اپنے آغوش میں لئے
ہوئے تھے بجائے اس کے کہ وہ آگ کو بجھاتے اور اپنے پروردۂ آغوش
کی حفاظت کرتے اور ہوا دے کر اس آتش کو شعلہ زن کرنے لگے۔

تمثیلی پیرایہ نہایت لطیف ہے اور دوسرا مصرعہ تو دل پر وہ اثر کرتا ہے
جو زبان سے بیان نہیں ہو سکتا۔ شعر واقعیت سے لبریز ہے۔ درحقیقت
آشیانے کا تکیہ انہیں پتّوں پر تھا جو شعلوں کو ہوا دے کر بھڑکاتے تھے
محاورہ شعر کے حسن کو اور چمکا رہا ہے۔

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

یہ شعر دنیوی تعلقات کی تصویر پیش نظر کر رہا ہے۔ وہ دلی دوست
جو ہر وقت جان نثار کرنے کو تیار رہتے تھے اور جن کی محبت میں سال
دو سال نہیں عمر صرف ہو گئی میرے مرنے کے بعد محبت کا اظہار یوں کرتے
ہیں کہ میرے دفن کے وقت مٹھیوں میں لے کر میرے اوپر خاک ڈالنے
لگے۔ ساری محبت کو خاک میں ملا دیا۔ کیا خوب زندگی بھر کی محبت کا صلہ ملا
سلاست و روانی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ جو بیان سے باہر ہے اور
ترکیب الفاظ میں ذرا سی تعقید نہیں ایسے ہی شعر سہل ممتنع کہلاتے ہیں۔

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں ابرِ سیاہ جانب گلزار دیکھکر

اس شعر میں طائر کے اضطراب قلب۔ خوف برق اور قوتِ باصرہ کا

کا عمل جو دفعتًا روشنی سے تاریکی کی جانب پھرنے سے بیکار ہو جاتا ہے اور منتہائے شوق آزادی ان تمام کیفیات کو مرزا صاحب نے انوکھے پیرایہ میں نظم کیا ہے۔ قفس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ طائر گرفتار ہے۔ گلزار کی طرف ابر سیاہ کا نظر آنا موسم بہار کا منظر دکھاتا ہے پھر ایسی حالت میں گلزار کو دیکھکر جو طائر کے دل پر گذر گئی وہ سوجھتا نہیں کا ٹکڑا بتاتا ہے اور کالی گھٹا سے یہ خوف کہ کہیں چمن میں آشیانے پر برق نہ گرے "وہ بھی سوجھتا نہیں" ظاہر کرتا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ روشنی سے یکایک تاریکی میں آنے سے نظر کام نہیں کرتی ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس شعر سے عجیب کیفیت دل پر طاری ہوتی ہے۔

اس مقام پر ایک واقعہ یاد آگیا جس کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ غالبًا فروری سنہ ۱۹۰۷ء میں علیگڈھ کالج میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ راقم الحروف بھی اس زمانے میں علیگڈھ کالج میں ایم اے اور ایل ایل بی کے درجوں میں پڑھتا تھا۔ اس مشاعرے میں دہلی۔ لکھنؤ اور دیگر مقامات کے مشہور شعرا تشریف فرما تھے اور دو طرحیں دی گئی تھیں۔ ایک مصرعٔ طرح

تو یہ تھا۔ ع "مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر" اور دوسرا یہ تھا

ع "تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں" وطن قافیہ اور یاد نہیں ردیف تھی

یہ مشاعرہ دو روز ہوا۔ ایک شب کو ایک مصرعۂ طرح پر اور دوسری شب کو

دوسرے مصرع پر۔ نواب صدر یار جنگ عالیجناب مولوی حبیب الرحمٰن

خاں صاحب شروانی مدظلہ صدر مشاعرہ تھے۔ میرزا صاحب نے بھی اس

مشاعرہ میں شرکت فرمائی اور دونوں جلسوں میں طرحی غزلوں سے حضار بزم کو

خوب خوب محظوظ فرمایا۔ پہلی غزل کا مطلع حسب ذیل ہے:۔

دل کیوں تپاں ہو کوچۂ دلدار دیکھکر ۔۔۔ آگے بڑھوں گا چرخ کی رفتار دیکھکر

اور دوسری غزل کا مطلع حسب ذیل ہے:۔

خود فراموش قفس ہم ہیں چمن یاد نہیں ۔۔۔ غیر کے ہوگئے ایسے کہ وطن یاد نہیں

ان دونوں غزلوں پر میرزا صاحب نے بخوبی خراج تحسین حاصل کیا

نعرہائے آفرین و تحسین سے تمام حامد ہال گونج رہا تھا جب میرزا صاحب

نے پہلی غزل کا یہ شعر پڑھا:۔

ہے رہ نشی قفس میں مگر سوجھتا نہیں ۔۔۔ ابر سیاہ جانب گلزار دیکھکر

اور باغ کی طرف اشارہ کیا تو کچھ ایسا سماں بندھ گیا تھا کہ جملہ حاضرین بزم مڑمڑ کر باغ کی طرف دیکھنے لگے۔ سامعین میرزا صاحب کے کلام کے ایسے گرویدہ ہوے کہ تمام حضرات نے باصرار بلیغ آپکو مجبور کیا کہ غیر طرحی غزلوں سے بھی ضیافت روحانی فرمائیں۔ ان غیر طرحی غزلوں میں ایک یہ بھی تھی:-

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے — سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

اسی غزل کے یہ دو شعر بھی ہیں:-

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن — زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

جب یہ غزل ختم ہوئی تو جناب صدر نے تعریف میں ایسے جملے فرمائے کہ جن کا مفہوم یہ تھا کہ میرزا صاحب اس غزل سے آپ زندۂ جاوید رہینگے۔ ختم مشاعرہ پر محترمی اقبال احمد صاحب سہیل نے جن پر عالم بیخودی طاری تھا وجد کی حالت میں ایسے جملے تعریف میں کہے جن کا ماحصل یہ تھا کہ ہماری دلی تمنّا تھی کہ مرزا غالب مرحوم کو دیکھ لیتے خدا کا شکر ہے کہ وہ تمنّا

آج پوری ہو گئی۔ جناب شیخ فضل الرحمٰن صاحب جناب سید علی عباس صاحب وغیرہما نے بھی ایسے ہی کچھ جملے تعریف میں کہے۔ اور مہینوں کالج کے طلبا ذیل کی غزل کو مل کر پڑھتے رہے :۔ ع دیر ہوئی کہ آسمان بر سرِ اختلاف ہے

لحد سیاہ ہے ثاقب کوئی چراغ نہیں   اور اس پہ شام ہوئی ہے دیارِ غربت میں

قبر کی تاریکی بھی ایک فرسودہ مضمون ہے میرزا صاحب نے جدت ادا سے مردہ مضمون میں جان ڈال دی۔ یہ شعر کس قدر ہیبتناک منظر پیش کرتا ہے ایک تو قبر کی ظلمت اس پر چراغ کا نہ ہونا اور اس تاریکی پہ شام کی ظلمت کا ایک سیاہ پردہ اور ان تاریکیوں کے پردے کہاں ؟ "دیارِ غربت میں" ایک مہیب منظر ہے۔ تخلص اس ظلمت میں کیا خوب چمک رہا ہے اور دیارِ غربت کی بلاغت کی تو تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔

وہ الٹ کر جو آستیں نکلے   ظلم جامے سے اپنے باہر تھا

پناہ بخدا یہ شعر کس قدر جوش سے بھرا ہوا ہے۔ معشوق کے ظلم کی تصویر کشی اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے۔ معشوق کا آستین الٹنا کیا تھا کہ مجسم ظلم کا باہر ہونا تھا۔ محاورہ کا استعمال کتنا برمحل ہے اور ظلم معشوق کو

کس قدر واضح کرتا ہے:-

نہ سمجھا معنی گور و کفن سمجھا تو یہ سمجھا　　تھکا تھا میں لپٹ کر سو رہا دامان منزل سے

اس شعر میں میرزا صاحب نے تمام عمر کے تکالیف و مصائب کا مرقع کھینچ دیا ہے۔ سفر زندگی کی صعوبت برداشت کرنے کے بعد قبر ہی پہلی منزل ہے جس میں راحت نصیب ہو سکتی ہے۔ "دامان منزل" کے استعارے کو "لپٹ کر سو رہا" کی ترشیح کسقدر مستحکم بنا رہی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عمر بھر کی تکلیفوں کے بعد جو راحت نصیب ہوئی تو مسافر ملک بقا گوشۂ قبر کو آغوش مادر سمجھکر اس سے لپٹ کر سو رہا۔ حسن تعلیل کی جھلک شعر کے حسن کو دوبالا کر رہی ہے۔

گلشن سے اٹھ کے میرا مکان دل میں آگیا　　اک داغ بن گیا ہے نشیمن جلا ہوا

خانہ بربادی سے جو کیفیت دل کی ہوتی ہے اس کا اظہار ایک جدید پیرایہ میں ہوا ہے۔ ایک طائر کو جو اپنے آشیانے سے محبت ہوتی ہے وہ اسی کے دل سے پوچھنا چاہئے۔ نشیمن کے جلنے کا اثر یہ ہوا کہ طائر کے دل میں داغ پڑ گیا۔ جلے ہوئے آشیانے کی تشبیہ داغ دل سے بالکل

اچھوتی ہے اور مفہوم شعر کو واضح کرتی ہے اور اثر کو بڑھاتی ہے۔ اور اسکے ساتھ ساتھ یہ بھی پہلو نکلتا ہے کہ چمن میں جب تک آشیانہ تھا اس وقت تک تباہی کا خوف لگا ہوا تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن آشیانہ جل جانے پر داغ دل جو اس کی نشانی ہے زندگی بھر باقی رہے گا اور دستبرد زمانہ سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

گلچیں بُرا کیا جو یہ تنکے جلا دیے تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا

مضمون تو صرف اتنا ہے کہ بے سبب کسی کو آزار نہ پہونچانا چاہیے لیکن نہ معلوم میرزا صاحب نے اس شعر میں کیا جادو بھر دیا ہے کہ دل پہ چوٹ لگتی ہے۔ طائر کا گلچیں سے بےساختہ خطاب کر کے کہہ دینا کہ تونے بُرا کیا اسکے دلی حزن و ملال کو ظاہر کرتا ہے اور آشیانے کو چند تنکوں سے تعبیر کر کے گلچیں کی نظر میں اس کو حقیر ٹھہرانا اور یہ واضح کر دینا کہ ان تنکوں سے تیرا کوئی نقصان نہ تھا کیوں کہ وہ تو تیرے پھولوں سے بہت دور تھے پھر تونے انھیں جلا کر میری کائنات کو کیوں مٹا دیا۔ یہ تمام چیزیں مل کر قلب سامع پر نشتر کا اثر کرتی ہیں۔

کہنے کو مشت پر کی اسیری تو تھی مگر خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

اس شعر میں بھی باوجود سادگی کے نہ معلوم کیا اثر بھرا ہوا ہے۔ مشت پر کی اسیری سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک طائر جو اپنے مسرت انگیز نغموں سے چمن میں نواسنجی کرتا تھا وہ گرفتار ہو گیا۔ "مشت پر" ظاہر کرتا ہے کہ دیکھنے میں تو طائر کی کچھ حقیقت نہ تھی مگر اس کے قید ہونے کا اثر یہ ہوا کہ گلستاں میں سناٹے کا عالم ہو گیا یعنی طائر کی نغمہ سنجی سے جو چمن بولتا تھا اس کے اوپر مہر سکوت لگ گئی۔ "چمن بولتا ہوا" طائر کی زمزمہ پردازی کی تصویر کھینچتا ہے۔

تڑپا دیا ہے دل کو شاباش ہمصفیرو یوں ہی پھر اک صدا دو ٹوٹا قفس چلا میں

اس شعر میں زور اور اثر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ ع

آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوت تخیل بند الفاظ کو توڑے ڈالتی ہے۔ ایک طائر جو اپنے ہمصفیروں کے ساتھ گلستاں میں نغمہ سنجی کرتا تھا اور عیش و عشرت کی فضا میں زندگی بسر کر رہا تھا گرفتار ہونے کے بعد اس کی یہ حالت ہے کہ جب وہ کنج قفس میں اپنے ہم نوا ساتھیوں کی آواز سنتا ہے تو بے قابو ہو جاتا ہے اور یہ کوشش کرتا ہے

کہ کسی نہ کسی طرح بند قفس کو توڑ کر رہا ہو جاؤں تاکہ اپنے ہمصفیروں میں مل کر نواسنجی میں مشغول ہوں "شاباش" کے لفظ سے اپنے ہمصفیروں کی ہمت افزائی بھی کرتا ہے کہ اگر ایک مرتبہ اور انھوں نے ایسی ہی صدا دی تو میں قفس کو توڑ کر انھیں میں جا ملوں گا۔ "ٹوٹا قفس چلا میں" طائر کے یقین کو ثابت کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مرزا صاحب کا دیوان جواہر آبدار کا ایک خزانہ ہے کہ جس کا ہر ورق اپنے دامن میں بیش بہا جواہر لئے ہوئے ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می بینم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ان کے پرکھنے کے لئے وقت کی وسعت اور جوہری کی نظر درکار ہے اور میں ان دونوں سے محروم ہوں۔ لہذا سر دست انھیں چند سطور پر اکتفا کرتا ہوں۔ ارباب فن اور نقادان سخن جب اس دیوان کا مطالعہ کریں گے تو مجھے امید قوی ہے کہ انھیں اس میں وہ بیش قیمت موتی ملیں گے جو عام نگاہوں سے مخفی ہیں۔

خاتمہ کلام میں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ میرے ائے جناب

میرزا صاحب کے دیوان پر ان چند سطروں کے لکھنے کے دو محرک ہوئے پہلا محرک تو خود میرزا صاحب کا کلام ہے جو صنف غزل میں اپنی نظیر آپ ہی ہے اور جسے دیکھکر باوجود کثرت اشغال و قلت وقت میرے دل نے فوراً مجھے آمادہ کر ہی دیا کیوں کہ ایسے کلام کو دیکھکر خاموش رہنا اور داد سخن نہ دینا آئین ادب میں جرم عظیم کا مرتکب ہونا تھا۔ البتہ اتنی شکایت ضرور ہے کہ میرزا صاحب کی غفلت شعاری نے کتابت اور طباعت تک سرایت کی چنانچہ کتابت کے اغلاط اور طباعت کے اسقام ان جواہر پاروں کی آب و تاب پر پانی پھیرتے ہیں۔

دوسرا محرک عالی جناب مستغنی عن الالقاب راجہ محمد امیر احمد خانصاحب بہادر بالقابہ دام اقبالہم کی شخصیت ہے کہ جو بمصداق الولد سر لابیہ عالیجناب معلی القاب مہاراجہ صاحب بہادر بالقابہ اعلی اللہ مقامہ کے ہر حیثیت سے جانشین و قائم مقام ہیں۔ علاوہ دیگر اوصاف و فضائل کے جس طرح مہاراجہ صاحب بہادر اعلی اللہ مقامہ سخن فہم و سخن سنج و ادیب کامل و قدر دان و سرپرست ارباب ادب تھے بفضلہ اسی طرح

عالی جناب راجہ صاحب بہادر دام اقبالہ بھی سرچشمۂ ادب اور مربی ارباب
کمال ہیں اور بمفادمن خلف مثلہ ما مات اپنے پدر بزرگوار طاب ثراہ
کی نظیر آپ ہی ہیں۔ دیوان کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جناب ثاقب
کی غفلت شعاری کی تو کوشش یہی تھی کہ تمام کلام کو کسی نہ کسی طرح ضائع
کر دے اسلئے کہ میرزا صاحب نے اپنے کلام کو اوراق پریشان کی بھی
حالت میں باقی نہیں رکھا تھا بلکہ کاغذ کے پرچوں پر کہیں ایک بیت اور
کہیں دو چار شعر لکھکر ڈال دیے تھے جیسا کہ دیوان کا آخری حصہ شاہد
حال ہے کہ جس میں متفرق اشعار اور ماسبق غزلوں کے مختلف ابیات
مندرج ہیں۔ لہذا یہ بیش بہا کلام جو ادب اردو میں گرانقدر اضافہ ہے
کتم عدم سے حیز وجود میں کسی طرح نہ آسکتا اگر عالی جناب راجہ صاحب
بہادر و معلی القاب مہاراج کنور محمد امیر حیدر خاں صاحب بہادر دام اقبالہا
کی ہنر شناس نظریں۔ علم دوست دل اور کمال پرور ہاتھ اسکی بقا کے متکفل
نہ ہوتے۔ ممدوحین دام اقبالہا کی اس قدر دانی اور رتبہ شناسی کی ادبی
دنیا ہمیشہ رہین منت رہے گی۔ راقم الحروف کے دل میں جو وقعت اور

عظمت ہر دو موصوفین زاد اجلالہما کی راسخ ہے اس کے اظہار کے
لئے الفاظ کا خزانہ خالی اور قلم کی زبان عاجز نظر آتی ہے دونوں حضرات
کے اخلاق جمیلہ اور اوصاف حمیدہ کا کون شخص ہے جو گرویدہ نہ ہو۔
خدائے تعالے ہر دو صاحبان کی عمر کو طویل اور دولت و اقبال کو مزید کرے
آمین ثم آمین :۔

سید محمد حسین۔ لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ۔

ریختۂ کلک گہر سلک

عالی جناب نواب صدر یار جنگ بہادر

مولانا مولوی حبیب الرحمن خان صاحب

حسرت شروانی رئیس بھیکن پور حبیب گنج

ضلع علی گڈھ

آنریری سکرٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس و رکن

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

۴۸۶

جس شاعر کا موٹو یہ ہو کہ "زبان میر کی اور تخیل غالب کا سا ہو"

اور جو لکھنؤ کے سخن سنجوں میں، عہد حاضر میں ممتاز پایہ رکھتا ہو۔ اسکے کلام پر

اظہار خیال کرنا ہے۔ کس کو؟ حسرت دہقانی کو! یہ جرأت کیوں؟ یوں کہ ایک سے

زیادہ تحریکیں جمع ہیں۔ میرزا ثاقب کی پیدائش آگرہ کی ہے۔ گلا بخانہ اور حاجی

حسن کے کٹرہ سے تاریخی تعلق ہے۔ تعلیم سینٹ جانس کالج میں حاصل کی۔

زمانہ تعلیم ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۱ء تک ہے، حسن اتفاق، گلابخانہ، حاجی

حسن کا کٹرہ، حکیموں کی گلی میرے لئے بھی ایک دفتر انس و قدر اپنے اندر رکھتے

ہیں۔ وہاں کے واقعات جو گزرے، دیکھے، سنے، شرافت اور محبت کے نورانی

قمقمیں تھے، جو دل و دماغ کو روشن کرنے والے تھے۔ اس عہد کی فرقہ

بندیوں سے بلند اور بہت بلند تھے:۔

آہ میرزا حامد حسین! آہ میرزا حبیب حسین! آہ احسن اللہ خاں ثاقب!

آہ ڈاکٹر ماشاء اللہ خاں۔ تم میں محبت اور وفا کے وہ جلوے دیکھے جنکو دنیا

آج ترس رہی ہے۔ میرزا ثاقب نے زمانہ تحصیل علم سینٹ جانس کالج میں

۹۱-۱۸۸۷ء) گزارا، تو میں بھی ۸۹-۱۸۸۶ء میں آگرہ کالج میں مشق نادانی کرتا رہا۔

ایک اور عزیز محرک۔ اس کلام کے نشر و قدر کا سہرا محمود آباد کے نوجوان راجہ صاحب کے سر ہے۔ یہ ہونہاری اور سخن پروری بھی ایک طومار ربط در آغوش ہے مجھکو وہ زمانہ یاد آتا ہے کہ جب اسی سن و سال میں مہاراجہ مرحوم محمود آباد میدان عمل میں گام زن ہوئے تھے۔ علیگڈھ پر وگرام میں نمایاں مقام تھا۔ علی گڈھ والونکو خدمت و ہم نوائی کے موقعے ملتے تھے۔ مخلصین کی دلی تمنا ہے کہ فرزند رشید نامور باپ کے خلف الرشید ہوں

بعض اور تحریکیں بھی ہیں جنکے سامنے بسر و چشم کہکر سر جھکانا ہے۔ ہاں یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ صرف بیرونی تحریکوں نے میرے قلم کو رواں کیا ہے۔ ان تحریکوں میں دل گرمانے والی ایک اور چنگاری بھی ہے۔ آج سے سترہ۔ اٹھارہ۔ برس قبل علی گڈھ یونیورسٹی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا، اس میں میرزا ثاقب صاحب لکھنوی بھی شریک تھے۔ میں بھی تھا۔ وہاں کلام سنا مشاعرہ کی ہنگامہ خیزی میں میرزا صاحب کے کلام نے دل پر خاص

اثر کیا، اُس کا اظہار بھی ہوا، وہ وقت اور اثر مجھکو بھی یاد ہے، میرزا صاحب کو بھی۔ شاید وہی ربط تھا جو اٹھارہ برس بعد بار آور ہوا۔ اور اس وقت دیوان میرزا ثاقب لکھنوی تبصرہ کے لئے سامنے ہے۔

اوپر کی تمہید سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ حال اور قال دونو کی تاثیر جنبشِ قلم کا باعث ہوی ہے۔ دیوان ثاقب کا حجم تقریبًا ۳۰۰ صفحوں کا ہے ۱۸۸۲ء سے لے کر زمانہ حال تک کا کلام اوسمیں شامل ہے۔ دو حصے ہیں۔ حصہ اول ۲۴۰ صفحے کا ہے، یہ غزلیات ہیں۔ دوسرا حصہ ۴۸ صفحے کا، اسمیں تاریخیں ہیں جو شعرا کے لئے ہمیشہ حیرانی کا سامان بنی ہیں۔ یہاں غزلیات پر خصوصًا نظر ڈالنی ہے۔ آغاز تحریر میں جو مقولہ میں نے نقل کیا تھا وہی نظر کی کسوٹی ٹھہریگا۔ "زبان میر کی اور تخیل غالب کا" ایک عجیب لطیفہ ہے۔ ادب اُردو کی خدمت میں دو دارالسلطنتہ سرگرم و بلند آواز رہے ہیں۔ ایک سارے ہندوستان کا دارالسلطنتہ شاہجہاں آباد۔ دہلی۔ دوسرا اودھ کا دارالسلطنتہ اختر نگر لکھنؤ۔ لیکن ایک اور دارالسلطنتہ ہے جو بلند آواز نہیں، تاہم عالم سکوت میں

گرم سخن سنجی رہا ہے یعنی اکبر آباد آگرہ۔ میرؔ اور غالبؔ جہاں سے علم استادی لے کر اُٹھے ہوں اسکے دعوے کو کون تسلیم نہ کریگا۔ اب تو نظیر اکبر آبادی کو بھی اہل نظر مان گئے ہیں۔ ہاں تو یہ کہنا ہے کہ جس شاعر نے دو اکبر آبادی الاصل باکمالوں کو رہنما بنایا ہے، وہ خود بھی اکبر آبادی الاصل ہے۔ اسطرح میرؔ اور غالبؔ سے دوگونہ مناسبت ثاقبؔ کو ہے۔

میرزا ثاقبؔ کی غزلیات کو میں نے مکرر پڑھا ہے، معتقدانہ نہیں معاندانہ یعنی اس نظر سے کہ دیکھوں سکۂ رواں کے دام میں میرزا صاحب کہاں کہاں پھنسے ہیں۔ بازار ہنر ہیں کچھ اپنی گرہ میں بھی لے کر آئے ہیں یا دوسروں کے فرسودہ مال ہی پر نظر للچایا کی ہے۔

غزلوں کو مکرر پڑھکر کہا جا سکتا ہے کہ میرزا ثاقبؔ نے اپنے لئے راستہ خود صاف کیا ہے جس میں میرو میرزا سے ثانی کے نقش قدم بہ گام زن ہوئے ہیں۔ ہاں یہ بھی سن لو کہ پھسلے بھی ہیں، گرے بھی ہیں۔ یہ عیب نہیں! ہنر ہے! اور مجسم شہادت اسکی ہے کہ حصول مقصد میں

پوری دوڑ دھوپ کی ہے۔ شہسوار ہی گرتے ہیں۔ ع۔

وہ طفل کیا کرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے۔

زرا "زبان میر اور غالب کے تخیل" پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے اس کے بعد ثاقب کے اشعار سنیے گا تاکہ لطف قدیم تازہ ہوجائے۔

طول طویل بحث بیکار ہے۔ خلاصہ یہ کہ غزل اصناف کلام میں جس خصوصیت میں قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ سے ممتاز ہوی، وہ عشق وحسن کا بیان ہے۔ آپ کہیں گے مثنوی بھی عشقیہ لکھی گئی ہیں۔ لیلی مجنوں، شیریں خسرو کی مسلسل داستانیں مثنوی ہی نے سنائی ہیں۔ قصائد کی تشبیب میں حسن وعشق کے آتشکدے گرم ہوے ہیں۔ یہ سچ ہے مگر مثنویاں کثرت سے رزمیہ بھی ہیں، حکمت میں بھی ہیں۔ کثرت وقوت کلام دونوں کے لحاظ سے بسرمایہ مشترک ٹھہریں گی نہ مخصوص۔ غزل کا سرمایۂ مقصود حسن وعشق اور صرف حسن وعشق ہے۔ اگر یہ تسلیم نہ ہو تو مولانائے روم، عطار، سنائی، سعدی، خسرو، حسن دہلوی، حافظ شیرازی کے مانند صدہا اہل کمال کو بزم غزل سے باہر

کرنا پڑے گا۔ بہت سے شعراء نے دوسرے مضامین مثلاً مثالیہ، پند و موعظت کو مقصد غزل بنایا ہے، وہ اُستاد بھی ہیں، اُنکے کلام کا پایہ مُسلّم بھی ہے۔ مگر وہ عطار و سعدی کا مرتبہ نہ پا سکے۔ دیکھو شیخ علی حزیں لاہجانی نے۔ خود نوشتہ حیات میں لکھا ہے کہ اہل فن کی ایک مجلس میں اُنکے والد نے کہا کہ "ملا محتشم کاشی کی اُستادی مُسلّم مگر کلام میں نمک نہیں اتنی شیرینی نہیں جو بے نمکی کی تلافی کرے" یہ معمولی فقرہ نہیں، ایک دستور العمل ہے۔ غور طلب۔ غور میں مدد ان دو شعروں سے ملے گی: ۔ (محتشم کاشی)

اے قامتِ بلند قداں در کمندِ تو ؎ رعنائی آفریدۂ قدِّ بلندِ تو

(حزیں لاہجانی) صید از حرم کشد خمِ جعدِ بلندِ تو؎ فریاد! از تطاولِ مشکیں کمندِ تو

کہنا یہ تھا کہ زبان میر سے مُراد وہ زبان ہے جو زبان محبت اور سوز و گداز کے مضامیں کے لئے موزوں ہو۔ تخیل غالب سے مراد یہ ہے کہ خیال ہو تو معیار شاعری کے اندر اس پر جدّت رکھتا ہو۔ پامال اور دست مال نہ ہو۔

بابر بادشاہ "واقعات بابری" میں جہاں آصفی کا ذکر کرتا ہے اوسکی

سرد کلامی سے نالاں ہے، کہتا ہے! "سوز و گداز نہیں"۔ آصفی اُستاد ہے اُسکا کلام استاد کا کلام ہے اسیر بھی شکایت بجا اور بالکل بجا ہے۔

دیکھو فغانی شیرازی نے جب سینۂ گرم سے صور پھونکا۔ بے سوز کلام مُردہ ہو گیا۔ غزل (اصلی غزل) زندہ ہو گئی۔ اور زندہ رہی جبتک علی حزیں نے بنارس میں "بالیں آسایش" پر سر نہیں رکھا۔

فغانی اور اُسکے پیرووں کا کلام پڑھو اس سے پہلے جو بزم سخن سے اُٹھ گئے تھے ان کا کلام پڑھو۔ صاحب درد ہو تو صاف امتیاز کرلوگے کہ غزل کس نے لکھی۔

اب "سرِّ دلبراں" "حدیثِ دیگراں" میں سُنکر اصل مقصد کیطرف آؤ۔ اشعار ذیل سنو اور میرے بیان کی تصدیق کرو۔ ذرا سنبھلکر پڑھنا آپ کے ذوق سخن کا امتحان بھی ہے۔ مُنتخب کلام اس نظر سے دیکھئے کہ یہ کلام اُس کلام میں سے انتخاب ہوا ہے جو اس کا ہم رنگ ہے۔ ہم آہنگ ہے۔ تخیل کی جدت اور نوی اپنے اندر رکھتا ہے:۔

انتخاب کلام

چشمِ دنیا میں بھر آیا حسرتِ دیدار نے
طور کے سرمے کو پھر بھی شوقِ بینائی رہا

کیا چیز ہے حیات کہ مرنے کے بعد بھی
جو چُپ ہوا وہ گوش برآوازِ صور تھا

دل کھینچ کے جاذبِ شوق میں خنجر تک آ گیا
پہلو کا فاصلہ رگِ گردن سے دور تھا

گلشن بہار پر تھا، نشیمن بنا لیا
میں کیوں ہوا اسیر، مرا کیا قصور تھا

کم سمجھتا ہے محبت میں فنا ہو جانا
دل کی قسمت میں ہے کیا جانئے کیا ہو جانا

عادتِ شانہ کشی زلفِ گرہ گیر میں ہے
فرض ہے روز اسیروں پہ جفا ہو جانا

دامِ الفت نے قفس مجھکو دکھایا آخر
خوف کہتا تھا کہ گلشن سے ہوا ہو جانا

فائدہ دیتی ہے کیا، چادرِ قبرِ منعم
ہاں، مگر بوجھ پر اک بوجھ سوا ہو جانا

دل کو دیکھے وہ، کہ ہے مقتلِ شوق و حسرت
جس نے دیکھا نہو کعبے کا منا ہو جانا

زندگی ہے ترے بڑھنے ہی تک اے زلفِ دراز
چوم کر اُنکے قدم، میری بلا ہو جانا

ڈھونڈتا ہے چمنِ عشق میں کیا فصلِ بہار
خون رُلوائیگا زخموں کا ہرا ہو جانا

لطفِ آزادی دل اُنکی اسیری میں ہے
اک نئی قید ہے زنداں سے رہا ہو جانا

جیتے جی آئے قیامت تو مزہ ہے ثاقب — دیکھ لیں، وعدۂ فردا کا وفا ہو جانا

یوں تو مشتِ خاک تھا دل خون ہو کر بہہ گیا — لیکن اس قطرہ میں وہ کچھ تھا جو دریا میں نہ تھا

کام اپنا کر چکا تھا، عشقِ جانگیر اے اجل — تیرے آنے سے بہت پہلے میں دنیا میں نہ تھا

وہ تو وہ ہیں، راہ چلنے میں نظر ڈالی تھی کل — آپ میں ذرہ کوئی نقشِ کفِ پا میں نہ تھا

تیرگی نام ہے دل والوں کے اُٹھ جانے کا — جسکو شب کہتے ہیں مقتل ہے وہ پروانے کا

دیدۂ دوست! تری چشم نمائی کی قسم — میں تو سمجھا تھا کہ در کھل گیا میخانے کا

بزمِ رنگیں میں تری، ذکرِ غم آیا تو سہی — خوش رہے چھیڑنے والا مرے افسانے کا

ہو گیا غرقِ سرِ شعلۂ شمعِ محفل — خون اونچا ہوا اتنا کسی پروانے کا

نزع اک عید ہے، روتے ہوئے وہ آئے ہیں — اے دلِ زار یہی وقت ہے مر جانے کا

بلا ہے عہدِ جوانی سے خوش نہ ہو اے دل — سنبھل، کہ عمر کی دنیا میں انقلاب آیا

بڑھائے حوصلے، دریا دلی نے ساقی کی — ذرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا

تیرا سرمہ پھیلکر، پھر کیوں سمٹکر رہ گیا — اے شبِ وصلت، یہ کیسا داغ دل پر رہ گیا

موت ہی اچھی کہ بر آئی مرادِ اہلِ ہجر — میری شہ رگ سے لپٹکر اُنکا خنجر رہ گیا

عشق کی دو چار راہیں ہوں تو دل کو ڈھونڈ لوں — مجھکو کیا معلوم کس کوچے میں مر کر رہ گیا

آبِ شمشیر گزرتا مرے سر سے، توبہ — ہاں، مگر قلزمِ خوں تا بہ گریباں ہوتا

دیکھا وسعتِ دنیا کا تماشا، میں بھی — دل کا عالم جو زمانے میں نمایاں ہوتا

ذرا سی خاک سے پیدا ہوا تھا دل لیکن — جہاں سمائے جہاں، ایسا دوسرا نہ ملا

یہ کس نے غمکدہ دنیا کا نام رکھا ہے — ہمیں تو کوئی یہاں دردآشنا نہ ملا

وفا کا راہبر ہے، تو دغا کی نہ جان اسکو — کمانکش! دل ہم آگئے اک ذرا ہشیار ہو جانا

میں وہ ہوں، جسکا زمانے نے سبق یاد کیا — غم نے شاگرد کیا، پھر مجھے استاد کیا

نہیں معلوم، وہ میں ہوں کہ کوئی اور اسیر — سُن رہا ہوں کہ گرفتار کو، آزاد کیا

تماشا گاہِ حیرت ہے دیارِ دل کی ویرانی — یہ سناٹا میانِ دشت صحرا ہو نہیں سکتا

بڑھا ایک اور غم، افشائے رازِ عشق سے ورنہ — نہ میں کھلتا نہ وہ کہتے کہ ایسا ہو نہیں سکتا

مرے ظلمتکدے میں روزنِ دشمن کا گزر کیسا — سلامت ہے شبِ غم تو اجالا ہو نہیں سکتا

صبر کی سالم قبائیں تو ہزاروں ہیں، مگر — ٹھیک ہوتی ہی نہیں کوئی دلِ صد چاک کی

دم نہیں لیتا دھواں دل کا، نظر آئے تو کیا — سیکڑوں پردے پڑے ہیں دیدۂ ادراک پر

شبِ فرقت نہیں وہ شب کہ آئے اور گزر جائے — رہیگی رات میری سرمۂ اہلِ نظر ہو کر

جہاں تھا تنگ جب طولِ امل کے پھیل جانے سے — لحد میں آگیا سارا وہ قصہ مختصر ہو کر

بڑھا دیا ہے دل کو، شاباش ہمصفیرو!
یونہی پھر اک صدا دو، ٹوٹا قفس چلا میں

وہ نزع کی خموشی، جامِ جہاں نما تھی
اک عمر کی کہانی، دم بھر میں کہہ گیا میں

ناز و ادا کی چوٹیں سہنا تو اور شے ہے
زخموں کو دیکھ لیتا کوئی، تو دیکھتا میں

برقِ جمالِ وحدت، تو ہی مجھے بتا دے
شعلہ تو دور بھڑکا، پھر کس لئے جلا میں

حُسن کی وہ صورتیں، خوابِ پریشاں ہو گئیں
پردۂ دل میں لگا کر آگ نہاں ہو گئیں

مٹ کے بھی آئینۂ رخسارِ خوباں ہو گئیں
خونِ اہلِ عشق کی بوندیں گلستاں ہو گئیں

زندگی میں کیا مجھے ملتی بلاؤں سے نجات
جو دعائیں کیں وہ سب تیری نگہباں ہو گئیں

اس ہولے دہر میں جمعیّتِ خاطر کہاں
دل کو جانے دو، یہ زلفیں کیوں پریشاں ہو گئیں

میں نثارِ دستِ قاتل، مر کے زندہ ہو گیا
خنجر و شمشیر کی دھاریں رگِ جاں ہو گئیں

عُقدہ ہائے غم سے وابستہ ہے اپنی زندگی
ہم کہاں، یہ مشکلیں جس وقت آساں ہو گئیں

کم نہ سمجھو دہر میں، سرمایۂ اربابِ غم
چار بوندیں آنسوؤں کی بڑھ کے طوفاں ہو گئیں

خود فراموشِ قفس ہم ہیں، چمن یاد نہیں
غیر کے ہو گئے ایسے، کہ وطن یاد نہیں

طرۂ گیسوئے جاناں! تری نکہت کی قسم
میں نے دیکھا تھا مگر مشکِ ختن یاد نہیں

تیرے نظّارے میں دل محو تھا ایسا دمِ ذبح
تیغ کا پھل مجھے اے سیبِ ذقن یاد نہیں

لاغری سے اک ورق ہوں دفترِ تاثیر میں — جان پڑ جائے جو کام آئے تری تصویر میں

اور دنیا تنگ ہو جائے، تو کیا ہو گا مرا — پاؤں برسوں لکھ چکا ہوں خانۂ زنجیر میں

پیشِ عاقل بولتا ہے، عالمِ نقش و نگار — کہہ گئی سب کچھ خموشی، پردۂ تصویر میں

غرقِ رحمت ہو کے دیکھا، جوشِ دریائے کرم — عفو نے دھبّا نہ چھوڑا دامنِ تقصیر میں

جز زمینِ کوئے جاناں، کچھ نہیں پیشِ نگاہ — جس کا دروازہ نظر آیا، صدا دینے لگے

دل کے قصّے کہاں نہیں ہوتے

ہاں وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے

از رسالۂ شمع آگرہ مطبوعۂ اکتوبر۔ نومبر و دسمبر۔ ۱۹۲۷ء

حضرت ثاقب لکھنوی

جانشین میر و غالب

از ماثر جناب مولوی شاکر حسین صاحب نکہت سہسوانی

حسب و نسب | مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب[۵۶] کی اصل و نسل اہل طبرستان سے ہے

مولد و مسکن | آپ کے مورثِ اعلیٰ حاجی علی قزلباش ماژندرانی تھے جنکو تاریخ عجم علی قلی خاں شاملو کے لقب سے روشناس عالم کراتی ہے یہ بزرگ شاہ طہماسپ صفوی کے معتمد علیہ امرائے دربار سے تھے۔ شاہ موصوف نے جب عباس مرزا اپنے پوتے کو جو زمانہ مابعد میں شاہ عباس کے نام سے مشہور ہوا عالم خُرد سالی میں حکومت خراسان پر مامور کر کے بھیجا تو غایت وثوق کی بنا پر حاجی صاحب کو اسکا اتالیق اور متکفل مہمات حکومت بنایا۔ شاہ طہماسپ کے بعد محمدؐ مرزا پدر شاہ عباس کے مقابلہ میں یہ شاہ عباس کے ساتھی رہے اور اسکے استحکام سلطنت کا باعث ہوئے۔ تغیرات زمانہ کے اثر سے آبائے کرام بسلسلۂ تجارت وارد ہندوستان ہوئے جسکو تقریبًا دو سو برس کی مدت گزرتی ہے۔

مقام آگرہ محلہ گلاب خانہ میں ایک کوٹھی مع ایک مسجد کے پرانی بنی ہوئی ہے جسکے محاذ میں ایک عظیم الشان امام باڑہ ہے۔ یہ عمارتیں آپ کے اجداد حقیقی حاجی مہدی اور حاجی حسن کے نام سے مشہور ہیں۔ امام باڑے کے چپ و راست چند پختہ مکانات ہیں جن میں آپ کے اہل خاندان آباد ہیں اس محلے سے تھوڑے فاصلہ پر حاجی حسن کا کٹرہ

واقع ہے یہ مقام اب بھی آپ ہی کے اعزہ و اقربا سے معمور ہے۔

عہد دولت برطانیہ میں آپ کے اہل خاندان کو بصلہ خیرخواہی گورنمنٹ شرکت دربار شاہی کا اعزاز حاصل ہوا اور خلعت فاخرہ سے معزز و ممتاز فرمائے گئے۔ اکثر ارکین خاندان اپنی ذاتی وجاہت اور علم و فضل کے باعث عہدہ ہائے جلیلہ پر سرفراز رہے چنانچہ یہ سلسلہ بفضلہ تعالے اسوقت تک جاری ہے۔

حسن اتفاق سے کالا محل جو میرزا غالب مرحوم کا مولد اور عنفوان شباب تک اُن کا مسکن رہا ہے اسی محلہ گلاب خانہ سے بالکل ملحق واقع ہے۔ وہیں ہمارا ہونہار مرزا ۱۹۔ماہ مبارک صیام ۱۲۸۵ھ ہجری شب سہ شنبہ مطابق ۲۔ماہ جنوری ۱۸۶۹ء کو چار بجے صبح کے قریب شاعری کی مجسم تصویر بن کر عالم وجود میں آیا۔

کرشمہ قدرت کچھ عجیب اتفاق ہے کہ جن اصحاب کمال کی ترکیب جسمانی میں آگرے کی خاک اور جمنا کے پانی کا امتزاج ہے دُنیا میں وہ کوئی نہ کوئی درجہ امتیازی حاصل کر کے رہے ہیں۔ دیکھئے خان آرزو۔ میر تقی۔ مرزا غالب۔ نظیر اکبرآبادی اپنے اپنے طرز و روش کلام میں کس پایہ کے لوگ تھے اور اب ہمارے مرزا کی نسبت قدر شناسان سخن کا کیا خیال ہے۔

مرزا صاحب کے سال پیدایش ہی کے ماہ جولائی میں اُن کے والد بزرگوار مولوی آغا محمد عسکری قزلباش المعروف بہ مرزا محمد حسین وکیل مرحوم جو بوجوہ چند سکونت اکبرآباد سے برداشتہ خاطر و تنگدل تھے ہمیشہ کے لئے ارباب وطن کو خدا حافظ کہہ کر معہ اپنے اہل خانہ اور اس شش ماہہ مولود مسعود کے لکھنؤ چلے آئے جس کی آب و ہوا میں یہ نونہال چند سال تک نشو و نما پاتا رہا۔ ملازمت پیشگی کے باعث سے بڑے مرزا صاحب کا مستقل قیام شہر لکھنؤ میں غیر ممکن تھا اسوجہ سے بعض اعزہ کی موجودگی کی بدولت حسب معمول زمانہ کبھی یہ لکھنؤ میں رہے اور کبھی الہ آباد میں جہاں بہ سبب ملازمت بڑے مرزا صاحب سکونت پذیر تھے۔ یہاں تک کہ بڑے مرزا صاحب ملازمت سرکاری سے مستعفی ہو کر ۱۸۸۶ء میں بھوپال تشریف لائے اور ریاست سے درجہ اول کی سند وکالت حاصل کی۔ موصوف الیہ چونکہ فطرۃً نہایت ذہین و ذکی الطبع واقع ہوئے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ زیور علم و فضل سے بھی آراستہ تھے بہت جلد کافی نام و نمود حاصل کر لیا۔ اپنی طلاقت لسانی و سحر بیانی سے جماعت وکلا میں سربرآوردہ اور ممتاز سمجھے جانے لگے بارہ سال مستقل قیام کرنے کے بعد ۱۸۔ اپریل ۱۸۹۸ء کو آپ نے بھوپال چھوڑا

اور لکھنؤ میں دائمی سکونت اختیار کرلی جہاں ۲۶- اگست سنہ ۱۹۱۶ء کو اس جہان فانی سے رحلت فرما کر راہی دارالبقا ہوئے۔ جناب مرزا صاحب مرحوم صاحب تالیف و تصنیف تھے۔

ابتدائی تعلیم اور جذبات شادی کا نمو۔ استبداد و حریت کی کشمکش

ثاقب والا مناقب کی تعلیم و تربیت محض اس کمبخت شاعری کی بدولت جناب میرزا صاحب مرحوم کے حسب منشاء اعلیٰ پیمانے پر نہ ہوسکی جس کا افسوس اُن مرحوم کو تادم واپسیں رہا۔ مگر پھر بھی بحد کمال فارسی اور بقدر ضرورت عربی اور انگریزی میں اُن کو کافی مہارت حاصل ہے اُن کی طباعی و ذہانت علوم و فنون متداولہ میں اُن کا کسی سے پیچھے رہجانا گوارا نہیں کرتی۔

بیٹا فطرۃً شاعر پیدا ہوا تھا اور باپ کو بالطبع اس فن سے نفرت کلی تھی جس کا انجام وہی ہوا جو قدرتاً ہونا چاہیئے تھا یعنی اس ہونہار شاعر کے جذبات نفس دل ہی دل میں گھٹتے رہے اور سعادتمندانہ رضا جوئے پدر کی رکاوٹ نے آزادی کے ساتھ اُنکو اُبھرنے کا موقع نہیں دیا۔ یہ امر داخل بدیہات ہے کہ آلات رمی پر جسقدر دباؤ زیادہ ڈالا جائے اُتنی ہی قوت رمی اُن میں بڑھ جاتی ہے۔ قدرت نے

جو مادّہ فن طبیعت میں ودیعت رکھا تھا وہ بیکار نہ تھا اور نہ اس لئے کہ اُس کو غیر طبعی اسباب روکے رہیں۔ قدرتی سیلاب کا مصنوعی احتیاطیں مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ آخر جوش طبیعت دب نہ سکا اور اُس سے بغیر گل کھلائے نہ رہا گیا۔ فطرتی طغیانی جذبات نے اپنے بہاؤ کے لئے ایک دوسرا راستہ نکال لیا۔ یعنی جبکہ آپ سال ۱۸۸۱ء میں ایک طالب علم کی حیثیت سے تحصیل علوم میں مشغول تھے اور انوار سہیلی اور سکندر نامہ کا درس لے رہے تھے اور منازل عمر سے گیارھویں منزل کے جادہ پیما۔ موانع ناراضی پدر بزرگوار کے باعث سے خود نہ تو مشاعروں میں شرکت کر سکتے تھے اور نہ علی روس الاشہاد غزل پڑھنے کی جرأت تھی لیکن مشاعروں کی طرحوں میں غزلیں لکھ کر اپنے ہم درس و ہم مکتب طلبا کو جن کی فرمایش سے وہ غزلیں کہی جاتی تھیں دیدیا کرتے تھے۔ لکھوانے والے ان غزلوں کو اپنے اپنے نام اور تخلص سے مشاعروں میں پڑھ کر سُرخ روئی حاصل کرتے اور یہ فقط اتنا سُننے ہی پر کہ فلاں غزل مشاعرے میں خوب پھلی اور اُس شعر کی اساتذہ باکمال نے اچھی تعریف کی۔ اکتفا کر کے اپنا مرجھایا ہوا دل خوش کر لیا کرتے تھے۔

حکمائے محققین و اساتذہ علم ادب کا اس مسئلے میں اتفاق ہے کہ فطرت ہی

شاعر پیدا کرتی ہے۔ شاعر کسی کے بنانے یا خود بننے سے جیسا پہلے ابھی اشارہ کیا گیا ہے کوئی نہین بن سکتا۔ طبع سلیم کو رہنما یا استاد کی احتیاج نہین ہوتی عالم وجود مین آنے سے پہلے ہی طاؤس کے بال و پر مین گلکاریان کر دی جایا کرتی ہین بلبل کی ترانہ سنجی دُنیا کے کسی اُستاد فن موسیقی سے مشق تعلیم و سبق آموزی کی محتاج نہین الشعراء تلامیذ الرحمٰن ایک مشہور مقولہ ہے جس کا بدیہی ثبوت ہمارے مرزا کی شخصیت ہے۔ درحقیقت یہ نعمت بے بہا ایک ودیعت الٰہی و عطیہ یزدانی ہے جو نصیبون سے صرف مستحقین ہی کو ملا کرتی ہے۔ ہر کہ و مہ اسکا اہل نہین ہے کہنے کے لئے ہر موزون طبع شاعر ہے مگر صحیح معنی مین اس معزز لقب کا اہل وہی ہو گا جس کو فطرت نے شاعر پیدا کیا ہو ؂

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ؛

یہی وجہ ہے کہ ہر دور مین حشرات الارض کی طرح شاعر پیدا ہوتے ہین اور فنا ہو جاتے ہین مگر درجہ قبولیت حاصل کرنے والے اُن مین شاذ ہی ہوتے ہیں جو اپنے بعد اپنا نام قیامت تک قائم رہنے کے لئے دنیا مین چھوڑ جاتے ہین۔

امتحان شاعری کا پہلا معرکہ

زمانۂ قیام الہ آباد مین مرزا صاحب کی مشق سخن کو چوتھا سال تھا کہ شیخ محمد جان صاحب حیرت الہ آبادی کی تحریک معیت نے اُن کو شاہزادہ میرزا قیصر بخت فروغ دہلوی کی صحبت مین جا پہونچایا یہ واقعہ ماہ دسمبر ۱۸۸۴ع کی یادگار ہے جناب شاہزادے صاحب مرحوم اُس زمانہ مین وہان دپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ گو ملک و دولت اس شاہی خاندان سے کنارہ کر چکے تھے لیکن علم و فضل اور صحت مذاق نے ساتھ نہین چھوڑا تھا جیسے شاہزادے صاحب برگزیدہ و مجمع اوصاف تھے ویسے ہی اُن کی صحبت کے لوگ بھی منتخب و صاحب علم و ہنر تھے چنانچہ اس جلسہ مین علاوہ دوسرے اصحاب کمال کے حافظ زکریا خان صاحب زکی تلمیذ غالب مرحوم قاضی نجم الدین خان صاحب برق شاگرد مومن دہلوی خان بہادر ذوالقدر خواجہ غلام غوث بیخبر دہلوی شمس العلما، مولوی ذکاء اللہ خان دہلوی کی موجودگی اس دعوی کا ثبوت بیّن ہے جناب حیرت نے ایک معقول تمہید و تقریر کے ساتھ حاضرین بزم علی الخصوص جناب شہزادیصاحب سے اُنکا تعارف کرایا۔ یہ پہلا دن تھا کہ ہمارا ہونہار شاعر ایک اہل فن کی حیثیت سے

ارباب کمال کی صحبت مین باریاب ہوا اور پہلا ہی موقع تھا کہ ایسی بھری محفل میں جہان زبان کھولنا دشوار تھا امتحان سخت کا سامنا کرنا پڑا۔

جناب فروغ کے ارشاد سے چند شعر پڑھے جو بلحاظ سن وسال مرتبہ شاعر نومشق سے بالاتر سمجھے گئے۔ چونکہ جناب حیرت نے ہمارے نوعمر جوان طبیعت مرزا کے وہ فضائل و مناقب بیان کئے تھے جو اس کمسنی کے اعتبار سے کسی طرح قابل یقین نہ تھے امتحان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جناب فروغ نے ان کے سن وسال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مصرعے پر گرہ لگانے کی فرمائش کی۔ ع

پر مارتے ہین چرخ کے سینے پہ پھٹا پھٹ

فروغ مرحوم کی زبان سے اس مصرعے کا نکلنا تھا کہ مرزا نے بغیر کسی توقف کے دوسرا مصرعہ بہم پہنچا کر یہ پورا شعر سنا دیا ؎

ایسے ہین مرے نالہ و افغان کے کبوتر

پر مارتے ہین چرخ کے سینے پہ پھٹا پھٹ

تضمین سنتے ہی ساری محفل دنگ ہوگئی مرزا کی ذہانت و ذکاوت کی بے انتہا تعریف کی گئی۔ معاملہ اسی جگہ ختم تھا مگر جناب حیرت نے اپنے دعوے کو ناقص

چھوڑنا قرین مصلحت نہ سمجھا کچھ اور فرمائش کی تحریک کی چنانچہ اُن کے اشارہ و ایما سے جناب برق دہلوی اس طرف متوجہ ہوئے اور یہ مصرع پڑھ کر ع

نہ وہ آسمان کی ہین گردشین نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

ارشاد فرمایا کہ میاں اس طرح مین کچھ طبع آزمائی کرکے دو چار شعر سُناؤ

حضرت کو نہ تو قلم دوات کی ضرورت تھی نہ خلوت کی احتیاج تھوڑی ہی سی مشغولی فکر یعنی کم و بیش نصف گھنٹے مین جبکہ حاضرین مجلس اِدھر اُدھر کی باتوں مین مصروف تھے گیارہ شعر کی ایک مرصع غزل زبانی کہہ کہہ مطلع سے مقطع تک پڑھ کر سُنا دی۔ حاضرین جلسہ نے نعرہائے تحسین و آفرین سے آیندہ شاعر کامل بننے والے کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ خان مرحوم نے ان الفاظ کے ساتھ داد سخن دی "میاں صاحبزادے اگر زندہ رہے تو اپنے وقت کے میر ہو گے" یہ مبارک کلمات کچھ ایسی ساعت سعید مین اُس مرحوم بزرگ قوم کی زبان سے نکلے تھے کہ انجام کار اُس کی پیشین گوئی پوری ہو کر ہی رہی اور آج الفاظ "جانشین میر و غالب" ثاقب کے نام کے اجزائے لاینفک ہین۔

وہ غزل اپنی اصلی حالت پر درج دیوان ہے جس کو ایک تازہ مشق نوعمر شاعر کا کلام ہونے کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے نہ کہ حال کے گھٹے منجھے ہوئے شاعر ثاقب کی نظر سے ۔

سونے مین سُہاگا زبان انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جولائی ۱۸۸۷ء مین آپ بعض مقتضیات وقت کا لحاظ کرکے سینٹ جانس کالج مین داخلے کے لئے پھر آگرے بھیجے گئے ۔ جہان ماہ اپریل ۱۸۹۱ء تک آپ کو قیام کرنا پڑا حسن اتفاق ہے وہان انکا سابقہ ایک ایسے شخص سے پڑا جس نے انکی شاعری کے لوازم اچھی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچا دے ۔ یہ بزرگ امروہے کے رہنے والے ملک الشعرا مہدی علیخان ذکی مرادآبادی کے ارشد تلامذہ تھے فن نظم کی مشق کرتے ہوئے انکی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی ۔ نام نامی مولانا میر مومن حسین اور صفی تخلص تھا ۔ آگرے کے لوگ ان کو ماہر فن عروض و شاعر باکمال سمجھتے تھے ۔ عربی ۔ فارسی ۔ اُردو ۔ تینون زبانون مین شعر کہنے پر یکسان قادر تھے ۔ خوشنویسی مین بھی اچھی دستگاہ تھی نسخ و نستعلیق دونون خطون کے استاد جید مشہور تھے ۔ فن عروض و قافیہ مین رسالہ طوبی العروض منظوم

بزبان اُردو جو غالباً ۱۸۷٦ء مین مطبع نولکشور واقع لکھنؤ سے شائع ہوا تھا انھین مرحوم کی یادگار ہے۔

ہمارے مرزا جب ان کی خدمت مین باریاب ہوئے تو وہ ان کی جدت ذہن وجودت طبع ملاحظہ کر کے بہت خوش ہوئے۔ اور بڑی قدر و منزلت فرمانے لگے ضیق فرصت کے باعث اپنے اکثر تلامذہ کا کلام اصلاح کے لئے ان کے سپرد فرما دیا کرتے تھے اور اُس کے بعد عند الضرورت خود ترمیم فرماتے تھے۔ ان کو مرزا صاحب کی سلامت طبع پر کچھ ایسا وثوق تھا کہ جب کسی مشاعرے کے لئے خود کوئی غزل تصنیف فرماتے تو انتخاب اشعار کی خدمت انھین کے سپرد کیجاتی فرصت وقت سے فائدہ اُٹھا کر مرزا نے فن عروض اور کچھ حصہ علم معانی و بیان و بدیع کا انھین مرحوم سے حاصل کیا ہے۔

سلسلۂ تعلیم ختم ہونے کے بعد آپکا قیام زیادہ تر بھوپال مین ہونے لگا۔ یہ زمانہ انکے عنفوان شباب کا تھا اور جذبات طبع کی آہنگین شاعری کے لباس مین اپنے حسن روز افزون کی بہار دکھا رہی تھین۔ جن کی بدولت اکثر و بیشتر راتین فکر سخن مین گزر گئی ہین اور ایسے واقعات بھی پیش آئے ہین کہ شعر کی دُھن مین کھانے پینے کا مطلق ہوش نہین رہا ہے۔

یہ حالات یک جائی وصحبت ہر روزہ کے سبب سے چشم دیدہ ہین۔ مشاعرون کی صحبت مین اگرچہ شرکت کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا جس کی وجہ اوپر بیان کردی گئی ہے۔ لیکن پھر بھی جب کبھی بزم انشاد مین آپ پہونچ جاتے تھے مشاعرے مین جان پڑ جاتی تھی۔

انداز غزل خوانی قدرت نے جس طرح انکو انداز سخن گوئی مین دوسرون سے ممتاز کیا ہے ویسا ہی طرز غزلخوانی مین بھی اپنا نظیر نہین رکھتے۔ اس دلکش انداز اور مؤثر لب ولہجہ سے شعر پڑھتے ہین کہ سامعین پر ایک عالم وجد طاری ہوجاتا ہے اور چھوٹے بڑے فرط طرب سے مبہوت ہو کر جھومنے لگتے ہین۔ زمانہ سابق مین کسی لحن یا ترنم کے ساتھ غزل سرائی کا دستور نہ تھا یہ زمانہ حال کی ایجاد ہے جس کو بہت ہی کم مدت ہوئی ہے۔ یہ طرز کلام کو وقیع بنانے اور اُس مین دلکشی پیدا کرنے کی غرض سے ایجاد کیا گیا ہے اور اس مین شک نہین کہ ایک حد تک عیب پوش ومؤثر ضرور ہے مگر موجودہ زمانے مین بھی بارہا تجربہ کیا گیا ہو کہ اچھے سے اچھا خوش لحن اور طرے سے بڑا ماہر فن موسیقی بھی ہنگام غزل خوانی مرزا کی نہایت سادہ اور پر جوش خواندگی کے سامنے بزم سخن مین اپنا رنگ نہین

جا سکا۔ اکثر دعوے کے ساتھ حریف بیٹھے ہین اور بازی ہار کے اُٹھے ہین۔

الہ آباد کا مشاعرہ۔ تین چار ہی سال ہوئے ہین کہ مجھے بعض ضرور تین وطن سے الہ آباد لے گئین وہان پہونچکر دوران ملاقات مین مخدومی جناب میر اکبر حسین صاحب اکبر مرحوم الہ آبادی سے معلوم ہوا کہ آج شہر مین ایک جگہ بہت ہی بڑے پیمانے پر بزم مشاعرہ منعقد ہونے والی ہے جس مین نکتہ سنجان شہر کے علاوہ دوسرے مقامات کے مشاہیر شعرا بھی شرکت کے لئے طلب ہو کر آئے ہین۔ میر مشاعرہ صاحب کی جانب سے جناب موصوف کو بھی دعوت شرکت جلسہ و تکلیف تحریر غزل دی گئی تھی۔ حضرت مرحوم چونکہ اپنے عوارض اور دوسرے خاص وجوہ کے باعث شرکت سے معذور تھے میری حاضری سے کچھ ہی قبل طرحی غزل لکھ کر معذرت نامہ کے ذریعہ سے روانہ فرما چکے تھے۔ مسودہ اُس کا موجود تھا جس سے میری سامع نوازی فرما کر تاکیداً شرکت جلسہ پر مجھے آمادہ کیا۔ گو ایسی صحبتون سے مجھے کوئی خاص دلچسپی باقی نہین رہی ہے مگر بیکاری مین وقت صرف کرنے سے اسوقت یہ مشغلہ بہتر معلوم ہوا۔ اس لئے اپنے ایک عزیز کے ساتھ جو اس صحبت مین مدعو تھے ایک تماشائی کی حیثیت سے مین بھی مشاعرے مین جا پہونچا

مین ابتک نہین سمجھ سکا کہ میرا یہ جا پہونچنا اتفاقیہ تھا یا کسی کشش نے مجھے وہان پہونچنے پر مجبور کیا تھا لیکن میری اس خوشی کا کوئی اندازہ نہین کیا جا سکتا جو وہان پہونچ کر خلاف امید مرزا صاحب کی موجودگی اور ان کے اچانک مل جانے سے مجھے حاصل ہوئی ہے تھوڑی دیر کے بعد غزل خوانی شروع ہوئی۔ اس صحبت مین جس کو بجائے بزم مشاعرہ بلحاظ حالات نمائشگاہ فن موسیقی کہنا ناموزون نہین ہے بیشتر ارباب کمال نے اپنے سخن سنجی کے پردے مین اس فن خاص کی مہارت کامل کا ثبوت ہر طرف کی واہ واہ اور سبحان اللہ سے دلوایا اور اپنے کمال غزل سرائی وجولانی طبع کا نذرانہ سامعین کی تحسین و آفرین سے حاصل کیا لیکن جب شمع ہمارے مرزا کے سامنے آئی ہے تو سب کے چراغ گل تھے اور ان کی سادہ شعر خوانی سارے نغمہ و سرود کا لطف دلون سے محو کر کے اپنا سکہ بٹھا رہی تھی۔

انکی رنگینی کلام جدت ادا اور حسن تخیل کی مقناطیسی قوت۔ پڑھنے کا انداز ملا جلا کر دلونمین وہ اثر پیدا کرتے ہین جو دیکھنے اور سننے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ معرض بیان مین نہین آسکتا۔ چنانچہ میرے محترم عنایت فرما اور خاص کرم گستر جناب قاضی [illegible] محمد [illegible] صاحب [illegible] ناقل رتھے کہ لکھنؤ [illegible] جناب

کی غزل خوانی کا مجھپر یہ اثر ہوا کہ بے اختیار بار بار جی چاہتا تھا کہ کپڑے پھاڑ ڈالون اور چیخین مارکر رونا شروع کر دون۔ حاصل کلام بھوپال مین بلالحاظ سن وسال مرزا صاحب کا شمار اُن اصحاب فن مین ہونے لگا جن کی مشق سخن حد کمال کو پہونچی ہوئی ہوتی ہے۔ مقبولیت کلام اس حد پر تھی کہ ہر صاحب مذاق سلیم کی زبان پر آپکی خوش بیانی کا افسانہ تھا۔ ناقدانِ فن رُوسا و امرا و اکابرین ریاست بالاتفاق آپکے مداح اور آپکے کلام کے دلدادہ تھے ہر صحبت مین آپکا کلام پڑھا جاتا تھا اور سُننے والے محظوظ ہوتے تھے خصوصًا حکیم سید عماد الحسن صاحب۔ مرحوم صفی پوری اور مولوی شاہ قطب عالم صاحب صفی پوری تو گویا آپکے جواہر افکار کے عاشق زار تھے۔ قبلہ حافظ خان محمد خان صاحب مرحوم شہیر تخلص مخاطب بہ افتخار الشعرا۔ شاگرد میرزا غالب مرحوم وجناب منشی صابر حسین صاحب مرحوم صبا سے سہسوانی والد ماجد نامہ نگار جو فارسی واُردو مین مسلمہ طور پر اساتذہ فن سمجھے جاتے تھے مرزا صاحب کے کلام کو نہایت قدر و وقعت کی نگاہون سے دیکھتے تھے اور ہمیشہ ان کے ساتھ بزرگانہ محبت وشفقت سے پیش آتے تھے۔ صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خان صاحب شمس العلما جو ایک مدت

دراز سے لکھنؤ مین قریب لال باغ تشریف فرما ہین اور اُن کے برادر بزرگ نواب سید نور الحسن خان صاحب مرحوم سے تو آپ کے بیحد مراسم تھے جو حضرت اول الذکر کے ساتھ آجتک بدستور قائم ہین۔ نور محل اور شاہجہان آباد مین شبانہ روز شعر و سخن کی خاص صحبتین گرم رہا کرتی تھین اور ہر وقت کی نشست و برخاست یک جائی تھی ؎

الا لیت ایام الشباب جدید
ودھرا قد مضی ما بثین یعود

مکرمی جناب منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی مصنف ترانہ شوق شاگرد رشید اسیر مرحوم بھی بسلسلۂ ملازمت اُس زمانے مین وہان موجود تھے وہ بھی ان کے معترف کمال رہا کرتے تھے۔

امتحان طبیعت کا دوسرا معرکہ ایک مرتبہ بعض حسد پیشہ مدعیان سخن کی وجہ سے یہ امر قرار پایا کہ ایک جلسے مین سب سے غزلین لکھوا کر ہمیشہ کے لئے یہ جھگڑا ختم کر دیا جائے۔ دن اور وقت مقرر ہوکر اس مشغلہ کے لئے غریب خانہ منتخب کیا گیا۔ حسن اتفاق سے ابھی جلسے کی تکمیل نہین ہوئی تھی کہ منشی

تیغ بہادر صاحب مرحوم مالک مطبع انوار محمدی لکھنؤ اور خواجہ محمد وزیر صاحب
ایک دوسرے صاحب مطبع لکھنؤ معہ دیگر چند احباب کے جو حضرت والد ماجد
مرحوم سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے پہونچ گئے۔ ان حضرات نے
شرکت صحبت کو اپنے رفع تکان سفر پر ترجیح دے کر نہایت خوشی سے لطف
جلسہ حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر فرمائی چنانچہ مجمع پورا ہو جانے پر غالباً خواجہ صاحب
یا کسی دوسرے صاحب نے مصرع طرح تجویز فرمایا اور ایک گھنٹے کی میعاد
مقرر کر کے جملہ مریضوں کے سامنے جن کی تعداد علاوہ سامعین کے پندرہ بیس کے
اندر تھی کاغذ قلم دوات جو پیشتر سے مہیا کر رکھے تھے رکھوا دئے مرزا صاحب اگرچہ
وقت مقررہ سے بہت پہلے اپنا کام انجام کو پہنچا چکے تھے مگر دوسروں کے لئے
ختم مدت کا انتظار ضروری تھا۔ اس لئے وقت گذر جانے پر غزل خوانی شروع
ہوئی کسی صاحب کے پانچ شعر تھے اور کسی کے سات آٹھ مگر مرزا صاحب کی
غزل تیرہ شعر کی تھی اور سب ایسی کہ جسکی بدولت یہ معرکہ انھیں کے ہاتھ رہا۔
ان پردیسی حضرات کی تحریک سے تیسرے روز ایک پورا مشاعرہ قرار
پایا جس کے لئے اسی وقت مصرعہ طرح تجویز کر کے مشتہر کر دیا گیا تھا جناب

والد ماجد مرحوم جو بحصول رخصت وطن تشریف لائے ہوئے تھے ایک روز قبل اس مشاعرے سے وہ بھی واپس تشریف لے آئے غرض یہ کہ یہ دوسرا مشاعرہ جس مین اساتذۂ شہر اور بڑے بڑے ارباب ذوق سامعین کی حیثیت سے شریک تھے بہت آب و تاب کے ساتھ ختم ہوا اور اس مین بھی میدان سخن ہمارے مرزا ہی کے ہاتھ رہا۔

انداز شعر گوئی و کیفیت استغراق

ہمارے مرزا کو برجستہ و قلم بر داشتہ شعر کہنے کا ایک خداداد ملکہ ہے جن حضرات نے ان کو دیکھا بھالا ہے وہ خوب جانتے ہین کہ حضرت ہر وقت فکر سخن مین منہمک رہتے ہین حتی کہ راہ روی مین بھی داہنے بائین کسی طرف نظر اٹھا کے نہین دیکھتے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو آپ کا سرمایۂ شاعری زیادہ تر راستہ چلنے ہی مین مکمل ہوتا ہے۔ جس قدر تیز رفتاری مین ترقی ہو سمجھ لیجئے کہ اسی قدر افکار سخن کی اسٹیم تیز ہے۔ اکثر و بیشتر ایسے سانحات پیش آئے ہین کہ اس استغراق کی بدولت سخت صدمات اٹھانا پڑے ہین ایک دن کا واقعہ ہے کہ مزدور سامنے سے خار دار لکڑیون کا گٹھا سر پہ رکھے چلا آرہا تھا حضرت عالم محویت مین اس سے ٹکرا گئے۔ اور پیشانی لہولہان

ہوگئی مگر جناب کو یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ کیا گذری اور کس بر راستے مین ایک دوست نے
خون آلودہ پیشانی دیکھ کر جب اس طرف توجہ دلائی ہے تو آپ چوٹ سے آگاہ ہوئے ہین
اسی طرح ایک بار اپنی دھن مین مدہوش آپ ایک زنانہ مکان مین غلطی سے گھس پڑے
گھر والون نے شور مچایا تو اُلٹے پانون واپس ہوئے ہین خوش قسمتی سو صاحب خانہ آپ سے
اچھی طرح واقف تھے ورنہ خدا جانے کیا نوبت آتی۔ کبھی کبھی استغراق کا یہ عالم ہوتا ہے
کہ اپنے خاص الخاص دوستون کو بھی نہین پہچانتے۔ لکھنؤ مین ایک دوست نے آپکے
سامنے ہی بیان کیا کہ چودھری شفیق الزمان خان صاحب تعلقدار امبیھہ (اودھ) جو آپکے
کلام کے شیدائی اور مربی و محسن ہین اور جن کے جملہ اہل خاندان سے آپکے گہرے تعلقات
ہین۔ ایک روز امین آباد کے بازار مین آپ کو مل گئے اور راہ مین ٹوک کر صاحب سلامت
کی۔ خدا جانے حضرت اُس وقت کس خیال مین محو تھے کہ سلام کا جواب حسب عادت
دے کر مزاج پرسی کے بعد اُن سے دریافت فرماتے ہین کہ آپ کون بزرگ ہین۔
چودھری صاحب کو اس ادا سے حیران ہو کر کہنا پڑا کہ مین شفیق ہون تب کہین آپ
ہوش و حواس مین آئے اور نہایت عاجزی سے عذر خواہ تقصیر ہوئے۔ اس قسم کے
اور بھی بہت واقعات ہین جن سے مرزا صاحب کے ملنے والے یا جہان جہان آپ

رہے ہین وہان کے لوگ بخوبی واقف ہین۔

تاریخ گوئی | اس فن سے میرزا صاحب کی طبیعت کو مطلق لگاؤ نہین ہے مگر اکثر موقعون پر دیکھا اور سُنا گیا ہے کہ آپ نے فرمایش کے ساتھ مجبوری سے ادنے توقف مین برجستہ تاریخین بھی کہی ہین جو نہایت پسندیدہ و مقبول ہوئین۔

حضور طبع | زود گوئی اور فی البدیہ سخن سرائی کے جن واقعات کا تذکرہ اوپر آچکا ہے وہ خاص حالات کے ماتحت تھے۔ لیکن اس کے علاوہ بعض مواقع پر یون ہی اُن سے فرمایشون کی فوری تعمیل کرائی گئی ہے جس مین میرزا صاحب نے نہایت شگفتگی خاطر کے ساتھ حصہ لیا ہے یہ برجستہ شعر گوئی اُن کے حضور طبع کی بین دلیل ہے۔ بھوپال مین اکثر ان کے قلم برداشتہ غزل لکھنے کا لوگون کو تجربہ ہے اسی بنا پر وہان عامۃً یہ فقرہ زبان زد تھا کہ "میرزا شعر کہنے مین آندھی ہے"۔

ایک دن جناب سر مہاراجہ صاحب بہادر والئی محمود آباد کو بہ مشورہ ماسٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم و شہزادہ مسعود قدر صاحب خیال ہوا کہ میر تقی مرحوم کی اس طرح مین ؏

نیچی نیچی نظرین کیا یہ اوپر اوپر جائین گی

اس قید کے ساتھ کہ ہر شعر کے ارکان صدر و ابتدا مین تکرار لفظی ہو میرزا سے غزل لکھوائی جائے یہ کوئی امتحان نہ تھا فی البدیہ غزل لکھنے کی فرمایش تھی لیکن مرزا نے اُسی صحبت مین تھوڑی ہی سی فرصت وقت کے اندر سترہ شعر کی غزل کہہ کر پیش کر دی جو درج دیوان ہے۔ سر مطلع غزل یہ ہے ع

روتے روتے شام ہوئی ہو کب تک اشک بہائینگی

سلسلۂ تالیف و تصنیف شاعری کا انہاک ان کو کسی دوسری طرف متوجہ نہین ہونے دیتا لہٰذا اس باب کے وقائع سے آپ کا کارنامہ زندگانی بالکل سادہ و معرا ہے البتہ ۱۹۰۲ء مین بعض احباب خاص کے اصرار بلیغ پر ایک ڈراما لکھا تھا جو بیحد مقبول خاص و عام ہوا۔

سرمایہ سخن اس کثرت مشق و بے انتہا مشغولی فکر کے لحاظ سے مرزا صاحب کا ذخیرہ کلام ایک اچھی حیثیت کا معتد بہ مقدار مین مہیا ہونا چاہیئے تھا۔ مگر افسوس کہ بد قسمتی نے اُن کا اس امر مین بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ باوجود ایسی محنت شاقہ کے جس کا کافی اثر صحت جسمانی پر پڑ چکا ہے بلکہ جس کی بدولت مدتون سے آج تک خون تھوک رہے ہین اپنی حبیب کی طرح بیچارے اس خزانے سے بھی محروم ہی رہے

اُن کی اکثر غزلین قصائد مثنویان مسدس وغیرہ اور دوسری نظمین بہ تعداد کثیر یا تو بے توجہی کے ہاتھون برباد ہوئین یا نذر احباب ہوتی رہین کلام کے اس طرح تلف ہوتے مین کچھ تو اُن کی استغنا اور لاپروائی اور فیاضی کا دخل ہے اور کچھ شائبہ احتیاج مندی کا بھی شامل ہے جو ناگفتہ بہ ہے بہرکیف موجودہ دیوان مین وہی کلام درج ہے جو حُسن اتفاق سے یارون کی دستبرد اور اضاعت و اتلاف سے بچ رہا ہے۔ یہ مجموعہ جس کی ابتدا ۱۸۶۷ء سے شروع ہوتی ہے اُنکی چھیالیس سالہ محنت کا سرمایہ ہے جس کو مرزا کا حاصل زندگی سمجھنا چاہیئے۔ ابھی چند سال قبل کا واقعہ ہے کہ ایک مکمل بیاض جس مین تقریبًا بیس بائیس قصیدے اور اسی نوے غزلین درج تھین چوری ہوگئی جسمین کی بعض غزلین یا اشعار جو وقتًا فوقتًا یاد آگئے متفرقات کی ذیل اور ناتمام غزلون کی ضمن مین درج دیوان ہین۔

اطوار و عادات | مرزا صاحب فطرةً نہایت با اخلاق متواضع صاحب مروت سیر چشم ہین۔ دوستون اور احباب خاص کی خاطر و مدارات کا تو دوسرا ہی عالم ہے کسی اجنبی کے ساتھ بھی۔ دامے درمے۔ قدمے سخنے۔ جو کچھ حیطہ امکان مین ہو اُس سے دریغ نہین فرماتے۔ اس حالت فقدان

نعمت مین بھی اُسی آن بان سے اپنی زندگی بسر کرتے ہین جو کبھی زمانہ فراغت وخوش حالی مین حاصل تھی۔ کسی اہل غرض یا شاگرد کا جوابی کارڈ یا ٹکٹ جواب کے لئے آئے تو بے حد ناگوار ہوتا ہے اور اس امر کو اپنی توہین سمجھ کر بھیجنے والے کے پاس واپس کر دیتے ہین۔ طبیعت مین ایثار کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اپنی خواہشون پر دوسرے لوگون کی خواہش کو مقدم سمجھتے ہین۔ عجز و انکسار کا یہ عالم ہے کہ ہیچ نہد شاخ پر میوہ سر بر زمین کا مجسم مصداق بنے ہوئے ہین۔ باوجود اُس کمال اور تفوق کے جو اس وقت اُردوئے معلّٰی کی شاعری مین ان کو ہمعصرون پر حاصل ہے کبھی ادعائے شاعرانہ نہین کرتے۔ جیسا کہ اُن کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

نازشِ فن کیا ہے کہنے ہین کسے دعوائے نظم
اعتراف بے سوادی ہے رعونت کچھ نہین

سنہ ۱۹۱۵ع مین جبکہ مختلف اخبارات اور رسالجات ادبی کے مدیرون اور دیگر اہل الرائے صاحبان تصنیف نے آپ کے نام نامی پر الفاظ (جانشین میر و غالب) کا اضافہ فرمایا تو یہ ملکی خطاب بعض حسد پیشہ معاصرین کی دلشکنی کا

باعث ہوا۔ آپ نے اطلاع پاکر ایک قطعہ بہ عنوان "عرضداشت" لکھ کر
جو ماہ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے رسالہ تمدن میں شائع ہوچکا ہے مجروح دلوں کی
یوں مرہم پٹی کردی

پورا قطعہ درج دیوان ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۸۴

حسد کا تو کچھ علاج ہی نہیں ع حسود را چہ کنم کو زخود برنج درست۔ مگر واقعہ
یہ ہے کہ اپنے کمال کے ساتھ ہمارے مرزا کا یہ عجز و انکسار ہی زیادہ تر ان کی شہرت
و ہردلعزیزی کا باعث ہے۔ مشیت ایزدی میں چون و چرا کا دخل نہیں۔ کرشمہ ہائے
قدرت خداوندی کیا کسی کی سمجھ میں آسکتے ہیں وہ اگر کسی کو عزت دینا چاہے تو کون
سی قوت اس کو روکنے والی ہے۔ دنیا میں نام و نمود حاصل کرنے اور شہرت
پانے کا ہر شخص خواہشمند ہے اگرچہ ہر ذاتی سے یہ نعمت ہاتھ نہ آئے تو ذرائع ڈھونڈے
جاتے ہیں ارباب جاہ کے ساتھ متملقانہ تعلقات پیدا کئے جاتے ہیں۔ مگر ہمارے
مرزا کا خاصہ طبیعت بالکل اس کے برعکس ہے۔ دنیا اس جوہر فرد کے پیچھے دوڑتی
ہے اور یہ بھاگتا ہے۔ چنانچہ اسباب میں مرزا کا شعر ان کے حسب حال ہے سے

عروس دہر کو دل دیکھے آزماؤں کیا ؎ سنوارنے میں جو بگڑے اسے بناؤں کیا

کبھی کسی دوست یار آشنا شاگرد سے اشارۃً وکنایۃً بھی ایسی خواہش نہین کی کہ اُنکو
کسی خاص لقب یا خطاب سے مخاطب کیا جائے۔ بلکہ اکثر احباب کو ایسے الفاظ کے
استعمال سے منع کرتے رہتے ہین۔ اول تو افکار زمانہ نے اتنی فرصت ہی کب دی کہ
ایسا خیال بھی دل مین لاتے دوسرے آپ کی طبیعت کا استغنا بجائے خود اُسی
نمایشون کا دشمن سخت ہے۔ جیسا کہ اُن کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

خاطرِ عزلت گزین ہے دشمنِ نام و نمود
مر مٹی ہو جس پہ دُنیا اُس سے رغبت کچھ نہین

اپنا کلام کبھی اپنی خواہش سے کسی اخبار یا رسالہ مین شائع ہونے کے لئے نہین بھیجتے استدعا
پر بھی ہزارون حیلے اور عذر کئے جاتے ہین اگر بپاس خاطر احباب یا کسی دوسری مجبوری
سے کبھی کسی فرمایش کی تعمیل کی بھی گئی تو وہ با دل ناخواستہ ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حالت مشاعرون
کی شرکت اور غزل خوانی کی ہے۔ اپنا کلام سُنانے مین نہایت بخیل ہین۔ اگر اتفاقیہ کہین
پھنس گئے تو غزل خوانی مین ہمیشہ اختصار پر نظر رہتی ہے اور اس امر کی تمنا کہ شائقین
کلام کم سے کم پر رضامند ہو جائین۔ یہ اغماض لوگون کی اور زیادہ گرویدگی و اشتیاق کا
باعث ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اطراف ہندوستان مین جہان کوئی بڑی صحبت

مشاعرہ منعقد ہوتی ہر بانی مشاعرہ اپنی وجاہت تعلقات کی بنا پر یا دوسرے مقتدر اصحاب کی سفارشین بہم پہنچا کر مرزا صاحب کی شرکت کے متمنی رہتے ہین اگر دعوت شرکت قبول ہو گئی تو یہ اپنی اور مشاعرے کی بہت بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے

اسباب معیشت اور اُنکا سلسلۂ تلاش

دنیا کی سب نعمتین کمتر ایک ذات مین جمع ہوتی ہین شاذ و نادر انسان یہان غالب مرحوم کے اس شعر کے مصداق ہون گے۔ ؎

تنگدستی اگر نہ ہو غالب تندرستی ہزار نعمت ہے

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگون کو فطرت الٰہی نے کوئی کمال عطا فرمایا ہے وہ مال و دولت کی نعمت سے حرماں نصیب رہے ہین یہی حال ہمارے مرزا کا ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے جس قدر حصۂ کفاف ان کو ملنا چاہئے تھا اُس سے بدرجہا زائد نہایت فیاضی سے وہ ان کو شاعری کی صورت مین دے دیا گیا۔ پہلے پہل تو ۱۸۹۶ء مین اُنھون نے اپنے والد مرحوم کے ایما سے عبدالشکور نامی ایک بگڑے ہوے مدراسی تاجر کی معیت مین سلسلہ کاروبار تجارت شروع کیا جس سے ابتدا مین تو فائدہ کثیر ہوا مگر من بعد نقصان پر نقصان اُٹھانا پڑے حتیٰ کہ کل اثاث البیت جمع جتھا اس تجارت کی نذر ہو گئے یہ

ایک اصولی غلطی تھی یعنی جو شخص بدقسمتی سے اپنی بنی بنائی کافی دولت تباہ کر چکا
تھا تقدیر جس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی اُسکی رفاقت دوسرے کے کام کو کیونکر بر دبرہ
ہونے دیتی۔ انجام کار وہی نتیجہ ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ اس ناکامی کی بدولت
ان کی عمر کا بہت سا حصہ سیر و سیاحت مین گزرا۔ اسی ضمن مین آپ کو عالی جناب
امیر الدولہ سعید الملک سر راجہ محمد امیر حسن خان صاحب بہادر اعلی اللہ مقامہ
فی دار الجنان والئی ریاست محمود آباد کے دربار فیض آثار مین باریابی ہوئی۔ یہ
واقعہ ۱۸۹۶ء کا ہے حضرت محتشم الصدر اور خصوصاً جناب ولیعہد بہادر نے جو
فی زمانہ مسند آرائے حکومت ہین نہایت عزت افزائی اور قدر دانی فرمائی محمود آباد
و قیصر باغ لکھنؤ مین شعر و سخن کی صحبتین گرم رہنے لگین چھوٹے راجہ جناب محمد احمد علی خان
بہادر مرحوم و مغفور بھی خاص طور پر قدر شناسی و نظر التفات فرماتے رہے۔ یہ سب کچھ
ایک طرف تھا اور ایک طرف مرزا صاحب کی گردش نصیبی جس نے ایسے دربار سے
جہان کسی کا پہونچ جانا ہی اسکی خوش نصیبی کی دلیل ہے ان کو بے نیل مرام نکالا
یہ انھین آلام و افکار مین مبتلا تھے کہ پدر شفیق کا سایہ سر سے اُٹھ جانے سے نئے اور بھی
اسباب شدائد و مصائب کا تکملہ کر دیا۔ ہزار ہا روپیہ تلف کرنے کی بعد تلاش معاش

کی پریشانیوں سے یہ زمانہ مرزا کے لئیے سوہان روح تھا جو نامساعدت روزگار سے روز بروز

روبہ ترقی تھیں آخر یہ حالت کبتک قائم رہتی - اس سلسلے کی کوئی انتہا بھی ہونی چاہئے تھی

درپس ہر گریہ آخر خندہ ایست

ایک صحیح دواقعی ضرب المثل ہے نومبر ۱۹۰۶ع میں بدبختی نے قدرے کنارہ کیا اور حسن اتفاق سے انکو کلکتہ کا

سفر پیش آیا - وہاں پہونچکر سفارتخانۂ ایران میں پرائیوٹ سکریٹری کی جگہ ملگئی نواب نصیر الملک

میرزا شجاعت علی بیگ خان بہادر مرحوم کانسل جنرل ایران آپ کے کمال فن شاعری

وانشاپردازی سے نہایت خوش اور رضامند تھے دوسال کلکتہ کے قیام کو گزرے تھے

کہ اکتوبر ۱۹۰۸ع میں میر تجمل حسین صاحب تجمل نے بمقام محمود آباد اس عالم فانی سے

رحلت کی اور اُن کے قائم مقام میرزا صاحب تجویز کئے گئے - چنانچہ نومبر ۱۹۰۸ع سے

ریاست میں یہ اُس خدمت پر فائز ہیں اور سرکار دولتمدار **عالیجناب سر**

مہاراجہ محمود آباد سے وظیفہ بلا شرط انجام دہی کسی کام کے ماہ بماہ

ملا کرتا ہے -

قسمت سے ایسا رئیس ان کو مل گیا ہے جو ان کے کمالِ ہنر کا قدر دان کامل

اور اُن کو وقعت کی نگاہ سے دیکھنے والا ہے -

تبصرہ

از اثر جناب سید اکبر علی صاحب

ایم ۔ اے ۔ ال ۔ ٹی ۔

الہ آباد یونیورسٹی

ماہر علوم نفسیات و فلسفہ و

ریاضی و جغرافیہ و ادب

حضرت ثاقب اور انکا کلام

نفس انسانی ذی شعور ہے، شعور تین قوتون کا حامل ہوتا ہے، قوت حس،
قوت ادراک اور قوت ارادہ، انھین تینون قوتون کے مجموعے کا نام شعور ہے،
لہذا ہر ذی شعور انسان مین ان تینون قوتون کا ہر لمحہ کارفرما رہنا لازم اور ضروری ہے
کبھی ان مین سے قوت حس نمایان ہوتی ہے اور ادراک و ارادہ پس پشت رہتے ہین،
کبھی ادراک منظر عام پر آتا ہے اور قواے حس و ارادہ پس پردہ رہتے ہیں اور کبھی ارادہ
حکم فرما ہوتا ہے اور حس و ادراک کی قوتین ماتحت رہتی ہین۔ محل اور موقع کی مناسبت
سے ان تینون قوتون مین سے ایک کی حکمرانی لازمی ہوتی ہے اور مابقی دو قوتین
ماتحت کی حیثیت سے رہتی ہین۔

ادب کا فرض ہے کہ ان تینون قوتون کی نشو و تربیت کرے۔ لہذا کسی
قوم کے جمود اور بیداری کا اندازہ اسکے ادبیات سے کرنا نہایت آسان ہے
اگر قومی ادب حس، ادراک اور ارادے کی نشو و تربیت کو ارتقائی منازل پہ

لے جا رہا ہے یہ یقیناً قومی بیداری کا بیّن ثبوت اور روشن دلیل ہے۔

جب ہم ادب اردو کو نفسیات کی کسوٹی پر جانچتے ہین اور اس کا جائزہ لیتے ہین تو ہمین حد درجہ افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ ادب اردو مین نفس انسانی کے تکملے کے لئے کافی سامان موجود نہین ہے۔

صنف غزل قوت عمل مین تحریک پیدا کرنے کے لئے وضع نہین کی گئی ہے اس کا کام صرف قوت حس یا زیادہ سے زیادہ قوت ادراک کی ضیافت ہے غزل کے ذریعہ سے قوت ادراک کی نشو و تربیت کا فرض صرف معدود سے چند شعرا نے ادا کیا ہے جن مین میرزا غالب پیش پیش ہین اور سچ تو یہ ہے کہ اگر مصحفی کے راز و نیاز، درد کی خستگی و آہ، اور میر کے سوز و گداز نے قوت حس کے جائز مطالبات کو کما حقہ پورا کر کے غزل کے مرتبے کو نہ بڑھایا ہوتا تو آج اس سے بدتر کوئی صنف کلام نہ ہوتی جو ایک مدت مدید سے بے شمار غزل گو شعرا کی بدولت پست جذبات اور رکیک خیالات کی جولانگاہ بنکر رہ گئی ہے۔ اسکا اصلی مقصد (یعنی حسن و عشق کا بیان اور صحیح واردات نفس کی ترجمانی جو معین اخلاق تھی) مسنح اور فوت ہو چکا ہے۔

جناب میرزا صاحب نے میر کو اس میدان میں اپنا رہنما بنا کر اعلےٰ جذبات کی ضیافت کا سامان فراہم کیا اور قوت ادراک کی نشوونما تربیت کا طریقہ سیکھنے کے لیے غالب کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ لہذا آپکے کلام میں حس اور ادراک دونوں قوتوں کا وجود بدرجۂ اتم اور بحد کمال نمایاں ہے اب رہی قوت ارادی یا عملی کی تحریک، یہ چونکہ غزل کا موضوع نہیں ہے اور نہ یہ صنف اس مطلب کے لئے ایجاد کی گئی ہے اس بنا پر میرزا صاحب بھی اس خدمت کو انجام دینے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ افسوس ہے کہ آپنے سوائے غزل کے کسی دوسری صنف کلام کی طرف خاص توجہ نہین فرمائی چنانچہ قوت ارادی کو یہی شکایت آپ سے باقی رہ گئی۔ اگرچہ آپ کے چند اشعار میرے پیش نظر ہین جن مین قوت ارادی منتہائے جوش کے ساتھ سرگرم عمل نظر آتی ہے۔ لیکن ان اشعار کی تخئیل کے تجزیئے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بیدار شدہ قوت عمل درحقیقت مشتعل شدہ جذبات کا اظہار ہے جس نے مردہ دلون مین ارادہ اور ارادے مین قوت اور قوت مین عمل پیدا کر دیا ہے جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہے ؎

بو نکلنے لگی غنچوں سے! تو پھر ڈر کس کا،	یہ خبر سچ ہے، تو صیاد نے آزاد کیا!
جھگڑے آپس کے ہین دل کہتا ہے بس چشت لبن	ہاتھ کہتے ہین گریبان، یہ گریبان ہوتا،

اب کمی اچھی نہیں اے نالۂ شبگیر دل! دیکھ نہ کچھ بستر سے پہلو ہٹ چلا صیاد کا
نالے کرتا جا! کہ زور ناتوانی ہے بہت جھک چلا ہو چرخ، گر جائیگا دو اک تیر میں
تڑپا دیا ہے دل کو، شاباش ہمصفیرو! یونہی پھر اک صدا دو، ٹوٹا قفس! چلا میں!

حقیقت یہ ہے کہ جناب میرزا صاحب نے یہ پانچوں شعر بے مثل اور بے پناہ کہے ہیں جن میں سے ہر شعر اپنی جگہ پر ایک مستقل دیوان کا حکم رکھتا ہے۔ یہ اشعار آپ کے آیات کمال میں سے ہیں حسن و ادراک کی یہ انتہائی معراج ہے کہ وہ قوت عملی و ارادی کے مدارج پر فائز ہو کر اُسی لباس میں نظر آنے لگیں۔ بڑے بڑے اساتذہ فن اس مقام پر سپر انداختہ اور دست باچہ نظر آتے ہیں۔ شاعرانہ محاسن جو ان اشعار میں جلوہ نما ہیں اُنکو تو گھاتے میں رکھئے ایسے بکثرت اشعار آپ کے دیوان میں موجود ہیں جن سے اُردوے معلیٰ میں ایک معتد بہ اضافہ ہوتا ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ دنیا مشکل سے اشعار متذکرہ بالا کا جواب پیش کر سکتی ہے۔

میرزا صاحب میں بعض خصوصیات ملٹن کی پائی جاتی ہیں۔ آپ کے اشعار میں وہی دقتِ نظر اور بلند پروازی کی شان جلوہ نما ہے جو ملٹن کے کلام میں نظر آتی ہے اور جسطرح ملٹن اپنے جواہر افکار کو ودیعت الٰہی اور عطاے ربانی سمجھتا تھا میرزا صاحب کا بھی

اپنے کلام کے متعلق یہی خیال ہے۔ خدا کی عطا کی ہوئی نعمت کا آپ کو احساس
کامل ہے جس کے شکر مین ہر وقت تر زبان رہتے ہین ہر چند ملکی فضا مکدر اور
تیرہ و تار رہی مگر آپ نے اپنے جواہر پارونکو ناپاک خیالات سے ملوث نہونے دیا
سچ ہے تیز بہتے ہوئے دھارے کے خلاف پیرنا شیرون ہی کا کام ہے۔ عجیب و
غریب اتفاق ہے کہ ملٹن اور میرزا صاحب کے والد ماجد بھی فن شاعری سے
متنفر کے باب مین متفق الرائے واقع ہوے تھے۔ میرزا صاحب کے ایک خیال کا
توارد بھی ملٹن سے ہو گیا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہین ؎

قفس کی تیلیان اچھی ہین تنکونسے نشیمن کے ۔۔۔ یہ سب کچھ ہے مگر صیاد یا دل پر کیا اجارا ہے

اسی جذبۂ حب الوطنی اور حریت پسندی کو ملٹن نے "فردوس گم شدہ" مین نظم
کیا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"دوزخ کی حکومت جنت کی غلامی سے ہزار درجہ بہتر ہے"

حسن و عشق کے متعلق میرزا صاحب کا نقطہ نظر عام نگاہون سے بہت بلند
ہے چنانچہ آپ حسن و عشق کے تمام رائج الوقت کھوٹے سکون کو ٹکسال باہر کرنے کا
حکم دیتے ہین اور عقل حقیقت آشنا کو روشناس کرنے کی غرض سے مجازی حسن و عشق کو

یون بے نقاب فرماتے ہین ؎ -

عقلِ حقیقت آشنا اور ہی قلب اور ہے
عشق نہین یہ ضعف ہی حسن نہین شباب ہے

واقعی حسن و عشق کی تعریف اس سے بہتر غیر ممکن ہے دنیا مین حقیقت شناس تو
کمیاب ہین، بھرمار عقل کے اندھون کی ہے۔ جو رنگی کو نارنگی اور اننت مال کو
کھویا کہتے ہین کفایت شعاری کو بخل سے اور اصراف کو سخاوت سے تعبیر کرتے
ہین۔ کبیر داس اور تسودین ہار کی طرح میرزا صاحب بھی اس اُلٹی دنیا کے شکوہ سنج
نظر آتے ہین، سچ کہتے ہین اور بجا فرماتے کہ دنیا جس کو عشق کہتی ہے وہ عشق نہین
ہے بلکہ نفس انسان کی کمزوری ہے اور جس کا نام حسن رکھا گیا ہے وہ محض شباب
کی جلوہ آرائیان ہین۔ جوانی مین ہر چیز دل کش اور نظر فریب ہوتی ہے اور
حقیقت بھی یہی ہے کہ نفس انسان کی یہ کمزوری جس کو عوام عشق کہتے ہین
اُسی عالم مین پیدا ہوتی ہے جب آنکھون پر پردے پڑے ہوتے ہین اور
شباب حُسن ظاہری کا دوسرا نام ہے۔ اس شعر مین لفظ قلب کی معنویت کوہ
نور کی طرح درخشان ہے۔ مین جناب میرزا صاحب کے کلام کو بغور مطالعہ
کے بعد اس مطلب پر پہونچا ہون کہ آپ اپنے کلام مین مراتب حسن و عشق کا

اپنے کلام کے متعلق یہی خیال ہے۔ خدا کی عطا کی ہوئی نعمت کا آپ کو احساس
کامل ہے جس کے شکر میں ہر وقت تر زبان رہتے ہیں ہر چند ملکی فضا مکدر اور
تیرو تار رہی مگر آپ نے اپنے جواہر پاروں کو ناپاک خیالات سے ملوث نہ ہونے دیا
سچ ہے تیز بہتے ہوئے دھارے کے خلاف پیرنا شیروں ہی کا کام ہے۔ عجیب و
غریب اتفاق ہے کہ ملٹن اور میرزا صاحب کے والد ماجد بھی فن شاعری سے
تنفر کے باب میں متفق الرائے واقع ہوئے تھے۔ میرزا صاحب کے ایک خیال کا
توارد بھی ملٹن سے ہو گیا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں ؎

قفس کی تیلیاں اچھی ہیں تنکوں سے نشیمن کے   یہ سب کچھ ہے مگر صیاد بادل پر کیا اجارا ہے

اسی جذبۂ حب الوطنی اور حریت پسندی کو ملٹن نے ”فردوس گم شدہ“ میں نظم
کیا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

”دوزخ کی حکومت جنت کی غلامی سے ہزار درجہ بہتر ہے“

حسن و عشق کے متعلق میرزا صاحب کا نقطہ نظر عام نگاہوں سے بہت بلند
ہے چنانچہ آپ حسن و عشق کے تمام رائج الوقت کھوٹے سکوں کو ٹکسال باہر کرنے کا
حکم دیتے ہیں اور عقل حقیقت آشنا کو روشناس کرنے کی غرض سے مجازی حسن و عشق کو

یون بے نقاب فرماتے ہین ؎ -

عقلِ حقیقت آشنا اور ہی قلب اور ہے　　　　عشق نہین یہ ضعف ہے حسن نہین شباب ہے

واقعی حسن و عشق کی تعریف اس سے بہتر غیر ممکن ہے دنیا مین حقیقت شناس تو کمیاب ہین، بھرمار عقل کے اندھون کی ہے۔ جو رنگی کو نارنگی اور امنت مال کو کھویا کہتے ہین کفایت شعاری کو بخل سے اور اصراف کو سخاوت سے تعبیر کرتے ہین۔ کبیر داس اور شوپن ہار کی طرح میرزا صاحب بھی اس اُلٹی دنیا کے شکوہ سنج نظر آتے ہین، سچ کہتے ہین اور بجا فرماتے کہ دنیا جس کو عشق کہتی ہے وہ عشق نہین ہے بلکہ نفس انسان کی کمزوری ہے اور جس کا نام حسن رکھا گیا ہے وہ محض شباب کی جلوہ آرائیان ہین۔ جوانی مین ہر چیز دل کش اور نظر فریب ہوتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نفس انسان کی یہ کمزوری جس کو عوام عشق کہتے ہین اُسی عالم مین پیدا ہوتی ہے جب آنکھون پر پردے پڑے ہوتے ہین اور شباب حُسن ظاہری کا دوسرا نام ہے۔ اس شعر مین لفظ قلب کی معنویت کوہ نور کی طرح درخشان ہے۔ مین جناب میرزا صاحب کے کلام کو بغور مطالعہ کے بعد اس مطلب پر پہونچا ہون کہ آپ اپنے کلام مین مراتب حسن و عشق کا

خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھتے ہین چنانچہ آپ کا مقولہ ہے کہ عاشق کو محبوب پر حکم
کرنے کا کوئی منصب حاصل نہین ہے وہ ہر حالت مین حسن کا تابع فرمان رہتا ہے
جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے ؎

ہے حکم "بدلتا رہے چہرے کا ترے رنگ" مین کہہ نہین سکتا کہ "ادھر دیکھتے رہنا"

قدیم الایام مین یونانیون اور عبرانیون کی زبان مین صرف ایک ہی لفظ تھا
جو حسن، صداقت، فرض اور نیکی کے معنون مین مستعمل تھا۔ انگلستان کے مایۂ ناز
فلسفی میکنزی حیات انسانی کا مقصد محض تکمیل حسن قرار دیتے ہین اُنکا عقیدہ ہے
کہ یہی انسانی فرض یعنی تکمیل حسن بہترین منصب وطاعت ہے وہ اسکے بھی قائل
ہین کہ حسن نیکی اور صداقت کا مترادف ہے۔ انگلستان کا مشہور ومعروف
شاعر براوننگ بھی اپنے ایک شعر مین اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے جسکا
ترجمہ درج ذیل ہے۔

"اُسے کائنات عالم! جیسا کہ خدا نے تجھے خلق فرمایا ہے تو ہمہ تن حسن ہے
یہ معلوم ہونے پر کہ یہ جو کچھ ہے عشق ہے۔ تو پھر عشق ہی حسن ہے"

اسی مطلب کو ایک دوسرا انگریزی شاعر کیٹس اپنے کلام مین یون ادا کرتا ہے

"صداقت عین حسن ہے اور حسن عین صداقت ہے"

میرزا صاحب بھی اسی خیال کے موید ہین جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے ؎

انتہا ہے عشق آکر ہو گیا ہے عین حسن

موت کی بھی آنکھ پڑتی ہو ترے بیمار پہ

اس شعر مین محاورے کا حسن حد توصیف سے باہر ہے اس موقع پر ہمکو

میرزا صاحب کی پرانی غزل کا ایک شعر یاد آگیا جو مذکورہ بالا مفہوم پر کافی

روشنی ڈالتا ہے ؎

وہ گبر مسلمان صورت ہی دینداز ہین تاقبۂ سہی

خود صدق و صفا کہتے ہین ولی اس زحجبہ بسیرت کو

لارڈ مکالے کا قول ہے کہ کامیاب شاعر فقط ابہام معنوی کے ذریعے

سے سامع کے متخیلہ کو کارفرمائی کا موقع دیتا ہے۔ عام دستور ہے کہ اپنی کاوشوں

سے حاصل کی ہوی چیز زیادہ مسرت کا باعث ہوتی ہے چنانچہ ذیل کے شعر مین

میرزا صاحب نے قائل کے مبتلائے عشق ہو جانے مین ابہام پیدا کر کے سامع

کے قوائے ذہنی کو بیدار کر دیا ہے ؎

سینے مین دل کا نگین محفوظ تھا

خود بخود اک داغ پیدا ہو گیا

ظاہر ہے کہ بغیر کسی سبب خارجی کے از خود کسی داغ کا دل پر نمودار ہونا

دلیل عشق ہے کیونکہ اثرات عشق براہ راست دل پر پڑتے ہین جسکی خبر بھی عاشق کو نہین ہونے پاتی۔ چونکہ قائل اس کلیّے سے ناواقف ہے اس بنا پر وہ اپنا استعجاب ظاہر کرتا ہے اور یہ داغ جو اسکے دل پر نمایان ہے محبت کا داغ ہے۔ محصل کلام یہ ہے کہ اثرات عشق سے دل کے سوا کوئی باخبر نہین ہو سکتا۔ اسی مطلب کو میرزا صاحب نے زیادہ واضح طور پر یون نظم فرمایا ہے ؎

جلوۂ حسن اک اشارے مین بہت کچھ کہہ گیا　　　مین نہین سمجھا مگر ہان دل تڑپ کر رہ گیا

رفتار خیال سے وقت کا اندازہ ہوتا ہے اگر خیالات کا مرور دماغ مین سرعت کے ساتھ ہو رہا ہے تو وقت جلدی کٹتا ہے اور اگر دماغ پر ایک ہی خیال مُسلّط ہے۔ جیسے مقدمے کا حکم، امتحان کا نتیجہ یا کسی کا انتظار تو پھر وقت کا کٹھن ہونا لازمی ہے۔ شب وصل ہزارون تمناؤن کے پورا ہونے سے لاکھون خیال دماغ سے گزرتے ہین اس لئے وقت جلدی کٹتا ہے اور موذن کی اذان قبل از وقت معلوم ہوتی ہے شب ہجر اسکے بالکل برعکس ہے المختصر وقت کے جس فلسفے کو برکلے نے کئی صفحون مین بیان کیا ہے اسکو میرزا صاحب نے دو مصرعون مین نظم فرمایا ہے ؎

یہ زمانہ بڑھ رہا ہے فقط اضطرابِ دل سے   شبِ غم نہ یون ٹھہرتی جو مجھے قرار ہوتا

کارگاہ عالم مین ایک کی فنا سے دوسرے کی بقا ہے۔ بچھو کا پیٹ چاک کر کے اسکے بچے پیدا ہوتے ہین کیٹرپلر سے تتلی نکلتی ہے، پانی بخارات مین تبدیل ہوتا ہے بخارات سے بادل بنتے ہین الغرض ایک چیز کے مٹنے سے دوسری شے وجود مین آتی ہے اس فلسفے کو میرزا صاحب یون نظم فرماتے ہین ؎

مری فنا مین بقا تھی آنکی عجب طرح سے بسر ہوئی ہے   کہ ایک دو دن کی زندگی بھی ادھر سے ٹھکرا ادھر ہوئی ہے

دنیا امتحانگاہ ہے ہر فرد بشر معرضِ امتحان مین ہے زندگی بھر ہزارون امتحانات ہوا کرتے ہین لیکن امتحانِ عشق ہر ایک کے لئے نہین ہے وہ اہل دل کے لئے مخصوص ہے ؏ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند؛ دنیا مین وہ کون شخص ہے جس نے کبھی کسی بیمار کو یا کسی ضعیف العمر کو یا کسی جنازے کو نہین دیکھا لیکن گوتم بدھ کی طرح ہر انسان ان مشاہدات سے متاثر نہین ہوتا۔ اسی مطلب کو میرزا صاحب نے اس شعر مین نظم فرمایا ہے ؎

بلا ہے عشق لیکن ہر بشر قابل نہین ہوتا   بہت پہلو مین ایسے بھی کہ جنمین دل نہین ہوتا

قدرت نے بیدرد اور اہل درد کی یہی شناخت رکھی ہے کہ بیدرد یا سنگدل یا شقی القلب

کبھی کسی مصیبت زدہ یا ستم رسیدہ پر ترس نہین آتا اور اہل دل دیکھتے ہی تڑپ جاتا ہے اور بیتاب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیدرد کو کسی مظلوم کے ساتھ ہمدردی نہین ہوتی۔

انگلستان کے مشہور شاعر ورڈس ورتھ نے اپنی مشہور معرکہ آرا نظم "فطرت مولود" مین ایک عجیب شاعرانہ خیال ظاہر کیا ہے وہ کہتا ہر کہ انسان جب کتم عدم سے حیز وجود مین آتا ہے تو وہ عالم روحانی کے اثرات لیکر پیدا ہوتا ہے جو مادی دنیا مین آکر رفتہ رفتہ فنا ہوتے جاتے ہین لیکن اُس کو اس مادی دنیا کی ہر شے مین عالم روحانی کی کسی دیکھی ہوئی شکل کا جلوہ نظر آتا ہے ورڈس ورتھ بھی قائل ہے کہ یہ ایک ایسی ذاتی وجدانی کیفیت ہوتی ہے جو بیان مین نہین آسکتی میرزا صاحب بھی اسی گومگو مین ہین ؎

کس جلوے پہ مرتے ہین ہم سے نہ کوئی پوچھے　　پہچان نہین سکتے لیکن کبھی دیکھا ہے

انسان بذاتہ ایک جہان ہے یہ مرکب ہے دو جزون سے۔ پیکر مادی اور روح جسکو انگریزی زبان مین "آئی" اور ہماری زبان مین "مین" کہتے ہین۔ قفس عنصری بغیر مرغ روح کے بیکار محض ہے اور ہر جاندار مرنے کے لئے

پیدا ہوتا ہے اس فلسفے کی تفسیر کے خواستگار میرزا صاحب کے اس شعر کو یاد رکھین ؎

چمن تھا دو جزو جنکا نام یعنی ایک گل اک مین　　کھلا میری اسیری سے کہ آئیگی خزان پھر بھی

کبھی سبب سے مُسبّب اور کبھی مُسبّب سے سبب معلوم کیا جاتا ہر کسی کے دل کی حالت کوئی نہین جان سکتا مگر ظاہری علامتون سے کچھ نہ کچھ قیاس کیا جاسکتا ہے، ہر کولیس کے سر پر کوہ اٹیلس کا نظر آنا آسان ہے لیکن مصائب کا ہجوم دکھائی دینا غیر ممکن ہے کیونکہ مصائب محسوسات و مادّیات سے نہین ہین اس امر کی تفصیل محال ہے لیکن میرزا صاحب کی قوت متخیلہ جس کو کائنات سے ہمدردی ہے دل محزون کے مصائب کا دفتر ہماری آنکھون کے سامنے یون کھول کر رکھدیتی ہے ؎

مرے آنسو کا قطرہ ایک دفتر ہے مصائب کا　　یہ تار ٹوٹتا ہے جب تو دل کو یاد کرتا ہے

یہ شعر حقیقت مین ایک دفتر معانی ہے جسکی کما حقہٗ تفصیل مین زبان قلم قاصر نظر آتی ہے لطف یہ ہے کہ سہل ممتنع ہے اور نہایت سادہ لفظون مین بکمال فصاحت و بلاغت ادا کیا گیا ہے ایسے شعرار دو زبان مین نادر الوجود ہین۔ مصرع اول مین لفظ ”مرے“ کی قوت و تخصیص اور اس کے بعد یہ فقرہ ”ایک دفتر ہے مصائب کا“ قائل کی بے پناہ علو ہمت، عالی ظرفی، اور شان تسلیم و رضا پر تیز روشنی ڈال رہا ہے

اور واضح کر رہا ہے کہ قائل صبر و تحمل کا وہ عظیم الشان پہاڑ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت نہ اُسکے مطمئن قلب مین کیفیت اضطراب پیدا کر سکتی ہے نہ استقلال مزاج مین خلل انداز ہو سکتی ہے۔ مگر یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ انسان ہے فرشتہ نہین ہے اب دوسرے مصرعہ مین اس فقرے پر غور فرمایئے "جب یہ تارا ٹوٹتا ہے" یعنی اول تو ایسی نوبت ہی کبھی نہین آتی کہ ضبط و استقلال مین فرق آجائے اور اگر بمقتضائے بشریت ایسا اتفاق ہوا بھی تو جب کبھی کوئی قطرہ اشک میرے دل سے جدا ہو کر آنکھ سے ٹپکتا ہے اس وقت اُس کو میرے دل کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ کس رفیع المنزلت مقام سے نکلکر کس تحت الثریٰ مین پہونچا ہے اور دیکھنے والون کو میری کیفیات قلبی سے آگاہ کرتا ہے۔ غم و الم کے وہ شدائد جو ایسے مستقل مزاج اور باہمت شخص کو اتنا مجبور کرین کہ اسکی آنکھین اشک آلود ہو جائین اندازہ و قیاس سے باہر ہین اور فہم و ادراک کی رسائی وہان تک غیر ممکن ہے۔ ایسے مثبن بہا جواہر میرزا صاحب ہی کے کلام مین ملتے ہین اور اسی حسن خداداد کی بدولت آپ کا کلام حد کمال پر فائز ہے۔ چنانچہ آپ کے شعر پر جس قدر غور و فکر سے

کام لیا جائے اسی قدر لطف معنی مین ترقی داضافہ ہوتا جاتا ہے۔

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا　　　　بہار آ گئی تھی آشیان بن چکا تھا

یہ شعر سہل ممتنع کا حقیقی مصداق اور جناب میرزا صاحب کے آیات کمال کا ایک بےمثل نمونہ ہے۔ شعر کیا ہے شاعر کی طبع خداداد کا روشن معجزہ کہنا چاہیے دونون مصرعے بظاہر علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے ہین اور دیکھنے مین لخت ہیں قائل اپنی زبان سے واقعہ بیان کرنا بھی نہین چاہتا۔ ایک مصرعہ مین زمانے کا پتہ دیتا ہے اور دوسرے مصرعہ مین حالت کا ذکر کرتا ہے مگر کیا انداز بیان ہے کہ دونون مصرعون مین وہ ربط معنی پنہان ہے کہ شعر سنتے ہی سارا واقعہ آنکھون کے سامنے آجاتا ہے جسکی تفصیل درج ذیل ہے۔

موسم بہار کی ابتدا تھی اور مین اُس سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنا آشیانہ بھی بنا چکا تھا کہ دفعتہً قضائے الٰہی سے صیاد کے ہاتھون گرفتار ہو کر قفس مین بند کر دیا گیا اور آشیانہ بھی پھونک دیا گیا۔ نہ تو اپنے اُس گھر مین جسکو بڑے شوق کے ساتھ مین نے بکمال محنت وجانفشانی بنایا تھا رہنا نصیب ہوا نہ گلہائے رنگین کی بہار دیکھنے پایا۔ ایسے وقت مین کہ عیش ونشاط کا جملہ سامان مہیا

ہوچکا تھا ایک ساتھ دو بلائین مجھپر نازل ہوئین اور مین اپنے ارادون مین ناکامیاب رہا چنانچہ اس ناگہانی حادثے نے میرا دل توڑ دیا اور مجھے سمجھا دیا کہ ہر امر خدا کی مرضی پر موقوف ہے یہ شعر اہل دل کے لئے ایک عجیب درس عبرت ہے اسی قسم کے ایجاز کو اعجاز کہنا چاہیئے۔

دوست اور دشمن کی پہچان ایک خاص ملکہ ہے جس شخص مین اس صفت کا فقدان ہے اُس سے اکثر سنگین جرایم سرزد ہوتے ہین وہ اپنے دوست کو دشمن سمجھکر ہلاک کر ڈالتا ہے اور دشمن کو دوست خیال کر کے اُس کو عزت دیتا ہے۔ رام کی جلاوطنی، قیصر روم کا اپنے دوست بروٹس کے ہاتھون قتل، شمع کا پروانے کو جلانا اسی معرفت کے حاصل نہونے کے نتائج ہین۔ راجہ دسرتھ کو لازم تھا کہ وہ رانی کیکئی کو جلاوطن کرتے، بروٹس کا فرض تھا کہ وہ کیٹس وغیرہم کو قتل کرتا۔ شمع کو مجھے جلانا چاہیئے تھا کیونکہ مین نے اندھیرے مین روشنی پیدا کرنے کی غرض سے اُس کو جلایا تھا، مین گنہگار تھا نہ کہ پروانہ لہذا اگر شمع مجھ سے اپنا انتقام لیتی تو میرزا صاحب کو کسی طرح اس بد الزام لگانے کا موقع نہ مل سکتا۔ ~~~

شمع سے ہو نہ سکی معرفت دشمن و دوست ہم گنہگار تھے پروانہ گنہگار نہ تھا

فلسفۂ حیات و ممات پر ہزار ہا متفکرین نے روشنی ڈالی ہے لیکن میرزا صاحب کی طرح شاید ہی کوئی آسان طریقے سے اس مطلب کو سمجھا سکا ہو، فرماتے ہین کہ زندگی عشرت وصل کا نام ہے اور موت صعوبات ہجر کا۔ وصل و فراق کے ان اثرات کا یقین نہو تو عملی تجربہ یون کر لیجئے ؎

پھول کو توڑکے دیکھو اثرِ وصل و فراق موت ہے، چاہنے والون سے جدا ہو جانا

ظاہر ہے کہ پھول کے چاہنے والے شاخ و برگ سے زیادہ کون ہو سکتے ہین جنکا وہ پروردہ آغوش ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ جس پر گزرتی ہے کیفیات قلبی کو وہی خوب جانتا ہے نا واقف سمجھانے پر بھی نہین سمجھ سکتا گلشن سے بچھڑی ہوی بلبل نشیمن کی یاد مین بیتاب و بیقرار ہے جس کا سبب صیاد کی سمجھ سے اسیطرح باہر ہے جس طرح راون کے فہم و ادراک سے سیتا کی پریشانی کا راز۔ راون کے نزدیک سیتا کے لئے مہا کنترا کے جنگل کی جھونپڑی سے لنکا کا عالیشان محل اور اُسکی آرائش کہین زیادہ دلکش اور موجب آسائش و راحت ہے۔ لیکن سیتا کیونکر اپنے قلبی حزن و ملال کو ایک ایسے شخص پر جو اُن کے دلی اضطراب کو سمجھنے سے قاصر ہے واضح کر سکتی ہین میرزا صاحب اُنکے کیفیات

قلبی کی ترجمانی یون فرماتے ہین ؎

کہون کیونکر کہ مین کچھ بھول آیا ہون نشیمن مین
مرا صیاد کہتا ہے کہ کیا رکھا ہے گلشن مین

محصل کلام یہ ہے کہ اسیری وہ مصیبت عظمیٰ ہے جس کو بخوشی خاطر کوئی آزاد شخص گوارا نہین کر سکتا یہ مطلع اس غزل کا ہے جو پنڈت برج نرائن صاحب چکبست آنجہانی کے مشاعرے مین بمقام کشمیری محلہ پڑھی گئی تھی۔

زمزمے خلقی جو تھے میرے وہی تھے وقتِ قید
~~جب نہ بگڑے بات تو کس کو بنانا چاہیئے~~

زمزمہ منتر کو کہتے ہین یعنی وہ کلمات جو آتش پرست یا بت پرست ہنگام عبادت آہستہ آہستہ باواز نرم ایک خاص لحن یا ترنم کے ساتھ اپنی زبان پر جاری کرتے ہین قائل کہتا ہے کہ وہ زمزمے جو قدرت نے مجھے ودیعت فرمائے تھے اور جو ازل سے میری سرشت مین داخل تھے وہ ہر حالت اور ہر محل و موقع پر میرے ورد زبان رہے چنانچہ دوران اسیری مین بھی جبکہ مین انھین ترانہ سنجیون کی بدولت بے خطا و قصور گرفتار کیا گیا تھا تو یہی کلمات حق بے کم و کاست اور بلا تغیر و تبدل میری زبان پر جاری تھے اور مین نے اُن مین کوئی ترمیم اس لئے پسند نہین کی کہ مین حق گو تھا اور یہ قید نہ میرے لئے باعث وہن و ذلت تھی نہ موجب ایذاو

تکلیف ہیں درآنحالیکہ نہ میری بات بگڑی تھی اور نہ میری ساکھ مین کوئی فرق پیدا ہوا
تھا پھر مین کیون تصنع اور بناوٹ سے کام لیکر محض بخیال آزادی خدا کا گنہگار ہوتا۔
یہ شعر ہر موقع پر درس آموز صبر و تحمل و استقلال ہے اور حق پسندی کی تلقین کرتا ہے
کسی مصیبت زدہ سے ہمدردی کا راز اُس آفت کا خوف و خطر ہے جو دوسرے
انسان کے دل مین گویا یہ خلش پیدا کرتا ہے کہ مبادا حکم قضا و قدر سے وہ خود بھی اُن
مصائب و آلام کا شکار ہو جائے جس مین وہ آفت زدہ گرفتار ہے۔ جب تک یہ خطرات
دل و دماغ کو گھیرے رہتے ہین اُسوقت تک ہمدردی کا جوش باقی رہتا ہے لیکن
جب سبب اور نتیجہ معلوم ہو جاتا ہے تو کیفیت انتشار کم ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی اُس
ہمدردی مین بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ سبب کے معلوم ہو جانے پر ہمدرد کو اُن مخصوص
مصائب سے محفوظ رہنے کا اطمینان ہو جاتا ہے اور غم و الم کی وہ بھیانک اور
انتشار پیدا کرنے والی ڈرانی صورتین جن کا خوف اُسکے دل پر طاری تھا نظر کے سامنے
سے ہٹ جاتی ہین۔ پریشانیان دور ہو جاتی ہین صبر آجاتا ہے اور سکون قلب
پیدا ہو جاتا ہے۔ مصیبت کیسی ہی سنگین کیون نہو اگر دنیا کو اُس کا سبب معلوم
ہے تو ہمدردی کم ہو گی اور اگر کچھ ہوئی بھی تو وہ اسوقت تک رہتی ہے جب تک

کہ اُسکا نتیجہ ظاہر نہو۔ عاشق سے دنیا کو ہمدردی صرف اس بنا پر ہوتی ہو کہ اُسکا چور ہر دل میں بیٹھا ہوتا ہو۔ ہر شخص بلائے عشق میں مبتلا ہونے کے اسباب سے اپنے آپکو محفوظ نہیں پاتا ثانیاً بلائے عشق کے نتائج سے ہر ایک لا علم ہوتا ہو یہ خوف کہ "کیا ہو گا" سکون قلب کا جانی دشمن ہے دلچسپی اور ہمدردی کے اس فلسفے کو میرزا صاحب اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

جسمیں بھرا ہوا ہے مری زندگی کا حال　　دنیا کو نیند آتی ہو اب اُس فسانے میں

یعنی جبتک میں بقید حیات تھا مصائب کا خاتمہ نہوا تھا' داستان غم جاری تھی جسکو دنیا بچینی کے ساتھ سن رہی تھی اور اثر لے رہی تھی نتیجہ کا ہر شخص منتظر تھا۔ بعد مرگ وہ قصہ ختم ہو گیا اور لوگ انجام کار سے باخبر ہو گئے ۔ میرے اندوہناک واقعات سے جو مجھپر گزرے اب کسی کو دلچسپی باقی نہیں رہی چنانچہ اب وہی افسانہ لوری کا کام دیتا ہو میرزا صاحب نے اس شعر میں وہ فلسفہ نظم فرمایا ہو جو شکسپیر کے حزنیہ والمیۂ ڈراموں کی جان و روح ہو انگریزی ڈراموں سے میرزا صاحب کو خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہو۔ قریب قریب اسی مطلب کو میرزا صاحب نے اس شعر میں بھی نظم فرمایا ہو ؎

جہاں تھا تنگ جس طول امل کے پھیل جانے سے　　لحد میں آ گیا سارا وہ قصہ مختصر ہو کر

مقصد حیات کی گتھی سلجھانے والے دنیا میں صرف دو فلسفی نظر آئے ایک کہتا ہے کہ زندگی محفوظ کرنے سے ضایع ہوتی ہے اور ضایع کرنے سے محفوظ ہوتی ہے

ع "درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو"۔ دوسرا اسکے برعکس زندگی کو محفوظ رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ جو جس فلسفے پر عامل ہوتا ہے اسکے اعتبار سے دوسرون کے طرز عمل پر نکتہ چینی کرتا ہے میرزا صاحب اس اختلاف رائے کی مطلق پروا نہین کرتے وہ اسپنے مذہب عشق پر کاربند نظر آتے ہین چنانچہ فرماتے ہین ؎

جنون اس کو جانئے کہ شغلِ زندگی دل   لگا کے آگ دیکھتا ہون خانہ شباب مین

مطلب یہ ہے کہ جوانی کو نذر آتش عشق کر کے گھر پھونک تماشا دیکھ رہا ہون ایک خود پرست، مطلب آشنا اور بندۂ غرض اس طرز عمل کو حماقت سمجھکر اعتراض کرتا ہے لیکن وہ شخص جس نے دوسرون کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے جانتا ہو اور سمجھتا ہے کہ زندگی نام ہی اسی کا ہے کہ اپنی ہستی کو دوسرون کے لئے فنا کر دیا جائے اور یہی واحد ذریعہ زندہ جاوید رہنے کا ہے۔ اسی مطلب کو زیادہ واضح طور پر میرزا صاحب یون نظم فرماتے ہین ؎

بلا سے ہو گیا خالی مرا پہلو تو ہونے دو   وہی دل کام کا ہو جو کسی کے کام آتا ہو

یہ شعر بھی قریب قریب اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے ؎

دعائیں دیں مرے بعد آنیوالے میری وحشت کو   بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

ملک روس کا فلسفی ٹالسٹائی اپنے "اعتراف زندگی" مین تحریر کرتا ہے کہ مجھے اڑھسٹ برس کی عمر تک اطمینان قلب نصیب نہین ہوا حالانکہ دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہین ہے جس سے مین محروم رکھا گیا ہون یا جو مجھے میسر نہین ہے، زوجہ بھی وہ ملی جس سے مین محبت کرتا تھا اور جو مجھ سے محبت کرتی تھی، اولاد بھی سعادتمند پیدا ہوئی اور انکی تعلیم و تربیت بھی میرے حسب منشا ہوی۔ دولت بھی بے قیاس ہر جایداد مین اضافے پر اضافہ ہوتا جاتا ہے، سب دوست ہی دوست نظر آتے ہین دشمن کوئی نہین ہے، بڑے سے بڑا ملکی خطاب بھی حاصل کر چکا ہون، شہرت عظمی کا مالک ہون، تصانیف کی تعداد سیکڑون تک پہونچ گئی ہے اور سب اس درجہ مقبول خاص و عام ہوئین کہ متعدد زبانون مین ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہین صحت ایسی اچھی ہے کہ بغیر کسی تکان اور خستگی کے اس پیرانہ سالی مین بھی متواتر دس گھنٹے جسمانی ریاضت اور آٹھ گھنٹے دماغی محنت کر سکتا ہون مگر باوجود ان تمام و کمال نعمتون کے جو مجھے حاصل ہین کسی وقت میرے دل کو سکون اور اطمینان حاصل نہین ہے۔ مین ان دو سوالون سے بیحد پریشان خاطر رہتا ہون "آخر یہ ہے کیا؟ اور ہوگا کیا؟"۔ کہین سے ان سوالون کا تشفی بخش جواب نہین ملتا۔ میری سمجھ مین تو یہ آتا ہے کہ مجھے

پیدا کر کے کسی نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے، مین اپنی زندگی سے عاجز ہون
خودکشی کی طرف طبیعت اکثر راغب ہوتی ہے لیکن بزدلی کا خیال مانع اور
سدباب ہوتا ہے۔

ٹالسٹائی کے دل کی ترجمانی میرزا صاحب اس طرح فرماتے ہیں ؎

دل مردہ کبھی جینے کا طلبگار نہ تھا ‏ ‏ ہوشیاری کو سمجھتا تھا یہ ہشیار نہ تھا

انسان کے لئے اعتراف خطا و قصور صعب ترین امر ہے۔ غلطیوں
کو چھپانے کے لئے صدہا عذر لنگ اور حیلے تراشے جاتے ہین۔ بھیڑیا بکری کے بچّے
کو دریا کا پانی گندا کرنے کا ملزم ثابت کرنا چاہتا ہے، لومڑی مرغ پر نیند حرام کرنے
کی تہمت لگاتی ہے مسولینی حبش کو غیر مہذب ہونے کا خطاوار قرار دیتا ہے
میرزا صاحب اپنی بریت کے لئے دل کو مورد الزام ٹھہراتے ہین ؎

پیدا ہوا ہی جو مری ہستی سے انقلاب ‏ ‏ دل کا کیا دھرا ہے مجھے کیا شعور تھا

اور سچی بات بھی یہی ہے کہ اگر انسان کے پہلو مین دل نہوتا تو نفسانی خواہشین
پیدا ہی نہ ہوتین اور نہ کسی کو کوئی فکر لاحق ہوتی۔ ہنی بال، قیصر روم، تیمور
چنگیز خان ہلاکو، نادر شاہ، نپولین، قیصر جرمنی وغیرہم کے پہلوؤں مین اگر دل

نہ ہوتے تو نہ انکو ملک گیری کی ہوس ہوتی اور نہ دنیا میں اسقدر شدید انقلابات رونما اور وقوع پذیر ہوتے۔

ڈارون کے فلسفۂ ارتقا کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا ارتقائی منزلیں طے کر رہی ہے جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات ظہور میں آئے حیوانات نے ترقی کرکے انسانی جامہ پہنا۔ جاندار کی ابتدا ایک "سل" والے جانور سے ہوتی ہے۔ جو صرف خوردبین سے نظر آتا ہے اس میں اور نباتات میں فرق محض جان اور خون کا ہوتا ہے، لیکن اسکے خون کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ ایک سل کے بعد کئی سل والے جانور صورت پذیر ہوتے ہیں جیسے کیچوا وغیرہ اسکے بعد مچھلی وجود میں آتی ہے، مچھلی میں خون کا رنگ سرخ ہوجاتا ہے لیکن حدت سے بے نیاز رہتا ہے۔ مچھلی کے بعد مینڈک وغیرہ پیدا ہوتے ہیں اسکے بعد رینگنے والے جانور، رینگنے والے جانوروں سے دودھ پلانے والے جانور پیدا ہوتے ہیں جن کا خون گرم ہوتا ہے، ان سے ترقی کرکے انسان پیدا ہوتا ہے ان تمام صوری وجسمانی انقلابات وتغیرات کے اسباب درحقیقت خون کے تغیرات وانقلابات بشرط استعداد ہوا کرتے ہیں

میرزا صاحب بھی اسی فلسفے کے موید نظر آتے ہین ؎

انقلاب آکر مدد دیتے ہین استعداد کو   کروٹین بدلین لہو نے اور انسان ہو گیا

ملک امریکہ کا ماہر نفسیات جیمس جس کا پایہ ماہرین علم النفس مین سب سے بلند

ہے کہتا ہے کہ انسان کے لئے جو چیز سب سے زیادہ مولم ہوتی ہے وہ عیش

ماضی کی یاد ہے اس حقیقت کو میرزا صاحب یون نظم فرماتے ہین ؎

تصور عیش کا کرتے ہین تو غم اور بڑھتا ہے   جو یاد آنے سے بھولا ہوا اسے ہم یاد کیا کرتے

یہ شعر بظاہر ذکر العیش نصف العیش کے مقولے کی ضد معلوم ہوتا ہے لیکن

فی الحقیقت دونوں قول متضاد نہین ہین، ان مین سے ہر ایک اپنے اپنے

مقام پر بالکل درست اور واقعیت پر مبنی ہے۔ عیش مستقبل کا ذکر نصف العیش

ہوتا ہے لیکن جب ہمکو عیش ماضی کا خیال آتا ہے تو رنج و غم مین یقینی اضافہ

ہو جاتا ہے لہذا عیش کا یاد کرنا سبب ازدیاد رنج و ملال ہوتا ہے اور جس قدر

ہم عیش گزشتہ کو یاد کرتے ہین اسی قدر رنج بڑھتا ہے، مصرع ثانی مین

اس مطلب کو ادا کرنے مین نہایت جدت سے کام لیا گیا ہے، کہ عیش گزشتہ

کی یاد ہی عیش کو فنا کر دیتی ہے اور موجب حزن و ملال ہوتی ہے۔

جدّتِ خیال اور اس کا فلسفہ

"عالم ایجاد میں کوئی شے زیر آفتاب نئی نہیں ہے"

خاصۂ فطرۃ انسانی ہے کہ وہ نشہ کبر و نخوت کی ترنگ میں خود اپنی شخصیت کو دنیا سے بالاتر دکھانے کی غرض سے کوئی بڑا خطاب اپنے لئے تجویز کرتا ہے، جسقدر زیادہ خود پرستی کا نشہ خرابی دماغ کا باعث ہوتا ہے، اسی قدر زیادہ جلیل الشان اور بلند پایہ خطاب اختیار کرنے کی ہوس دل میں پیدا ہوتی ہے چنانچہ ادعاے ولایت و امامت و نبوت و الوہیت اسی ذہنیت کے ماتحت ہیں۔

چونکہ عالم ایجاد میں کثرت ایسے ہی افراد کی ہے جو "ندانند کہ ندانند" کے صحیح معنی میں مصداق ہیں! "بدانند کہ ندانند" کے فلسفہ حقیقت کو جاننے اور سمجھنے والے معدودے چند نظر آتے ہیں لہذا ایسے حقیقت شناس نفوس کا وجود اس دنیا میں شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے، جنکے گوش حقیقت نیوش تک خود پرستی کے شیطانی صور کی آواز نہ پہونچی ہو۔

اظہار حق ہیں گو سقراط کی طرح زہر کا پیالہ ہی کیوں نہ پینا پڑے مگر ہم

بغیر یہ کہے نہیں رہ سکتے کہ انسان کسی نئی چیز کو ایجاد کرنے میں بالکل عاجز و قاصر ہے اور کبھی کسی استاد فن نے کوئی نئی چیز ایجاد نہیں کی۔ تخلیق صرف واجب الوجود اور قادر مطلق کا کام ہے جو کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں دیا گیا حیوان ناطق یعنی انسان جس نے محض اپنے شعور کی بدولت اشرف المخلوقات کا خطاب حاصل کیا اور دیگر حیوانات سے ممتاز ہوا محض اپنی صناعی سے کوئی نئی چیز پیدا نہیں کر سکتا۔

انسان کو اس سے زیادہ قوت ایجاد حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کے بنائے ہوئے حیوانات مثلاً ہاتھی، اونٹ، شتر مرغ، زرافہ، گینڈا، شیر، بارہ سنگا، دریائی گھوڑا، لنگور وغیرہم میں سے کسی کا سر کسی کا جسم، کسی کی ناک کسی کے کان، کسی کے سینگ کسی کی گردن، کسی کی کھال کسی کے بازو، کسی کی دم کسی کی ٹانگیں لیکر ایک عجیب الہیت جانور بنا سکے لیکن مانگے ہوئے پر اگر چھین لئے گئے تو وہی کوے کا کوا رہ جائیگا۔ یہ ہے انسان ضعیف البنیان کے ایجادوں کی اصل و حقیقت۔

اپنی شان دکھانے کے لئے ہم جس کو لفظ جدت سے تعبیر کرتے ہیں وہ درحقیقت

صرف تحقیق یا انکشاف راز ہوتا ہے۔ علم کی فراوانی رازہائے سربستہ کو بقدر طاقت بشری بے حجاب کر سکتی ہے اور اُسکی روشنی میں ایک محقق کو وہ چیزیں نظر آنے لگتی ہیں جن تک عوام الناس کی آنکھیں جہل و نادانی کے باعث نہیں پہونچ سکتیں پردۂ آزمیش سے اسوقت تک جو ایجادیں ہوئیں اور جو انکشافات معرض ظہور میں آئے اُنکی واقعیت اور اصلیت وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔

ایک اسٹنیجے کا ڈھیلا ماہر علم طبقات الارض سے گھنٹوں بلکہ پہروں باتیں کرتا ہے جسکی آواز کسی نااہل تک اس لئے نہیں پہونچتی کہ وہ اس علم سے بے بہرہ ہے۔ گلاب کے پھول کی ہر پنکھڑی ماہرین علم نباتات کے لئے ایک دفتر معرفت کردگار ہے عوام اس نعمت سے محروم ہیں۔

محصل کلام یہ ہے کہ ایجاد کے مسئلے میں انسانی کوششیں اور کاوشیں ممکن الوجود ہونیکی حیثیت سے ظرف زمان و مکان سے متجاوز نہیں ہوسکتیں۔ انسان زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ وہ ان ستاروں کو کسی ذریعے سے دیکھ لے جو عام نگاہوں سے اوجھل ہیں وہ جوڑ بند لگاکر اپنی خاص بندشوں اور ترکیبوں کے ساتھ تاحد امکان شکل و صورت بدل سکتا ہے لیکن تخلیق

سے ہرگز قادر نہیں ہے لہذا یہ امر پایہ ثبوت کو پہونچ گیا کہ کسی نئی چیز کا خلق کرنا

انسان کے حد اختیار و قدرت سے باہر ہے

"شاعر کی وسعت تخیل کے حدود"

ایک سائنسداں مادیات کی حدود سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتا

فلسفی فقط راز حقیقت کو دریافت کرنے کی ادھیڑ بُن میں غلطاں و پیچاں

رہتا ہے وجدانی قوتوں کے حامل کو مذہبیات میں نئی نئی شاخیں پیدا کرنے

کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں آتا اور ان میں سے کسی ایک شعبے کا ماہر دوسرے

شعبے کا کام انجام نہیں دے سکتا ہر علم و فن کا ماہر فقط اپنے ہی کام میں

مہارت رکھتا ہے البتہ ایک شاعر کو جو تلمیذ الرحمٰن کہلاتا ہے بشرطیکہ وہ حقیقی

معنی میں شاعر ہے یہ ملکہ اور قوت من جانب اللہ عطا ہوئی ہے کہ وہ حسب

استعداد و قابلیت علم۔ مادیت، روحانیت اور وجدانیت میں جوڑ توڑ لگاکر

ایک نئی صورت پیدا کر سکے اُسکے خیال کی رسائی قوس قزح میں ایک

دوسرے کی آمیزش سے ہزاروں رنگ پیدا کر سکتی ہے، وہ زمین آسمان

کے قلابے ملا سکتا ہے، عالم لاہوت و ملکوت و جبروت کی سیر کر سکتا ہے

وہ کیفیات وجدانی کا راز داں ہے جو اس خمسہ کا جائزہ لے سکتا ہے وہ فلسفہ قدرت کا ہمراز اور رموز حکمت کا بھیدی ہے دنیائے عقل کی پیمائش کر سکتا ہے عالم وجدانی میں تحقیقاتی کمیشن بٹھا سکتا ہے المختصر عالم امکان کا کوئی عنوان ایسا نہیں ہے جہاں شاعر کی قوت متخیلہ اپنا عمل اور تصرف نہ کر سکتی ہو۔ اس بنا پر جدت خیال کا مالک وہی حقیقی شاعر ہو سکتا ہے جو متضاد اشیا کو متحد اور بالعکس بنا سکے اور اس فن میں ید طولیٰ رکھتا ہو یا وہ شاعر جو اپنی قوت تخیل اور ذہن رسا سے کسی حقیقت کا انکشاف کرے یا متعدد حقیقتوں کی آمیزش سے کوئی نیا کلیہ ایجاد کرے یا مملکت دل کے کسی نظر انداز گوشے سے کوئی ایسا باریک جذبہ ظاہر کرے جو اس سے قبل معرض ظہور میں نہ آیا ہو یا اپنے خیالات، مشاہدات، جذبات و انکشافات کے اظہار میں کوئی نرالی طرز ادا اختیار کرے اور بیان میں جدت و ندرت پیدا کرے جیسے یہ مطلع۔

بلا ہر عشق لیکن ہر بشر قابل نہیں ہوتا   بہت پہلو ہیں ایسے بھی کہ جن میں دل نہیں ہوتا

یہ مسلمہ ہے کہ مطلق بلا، بوجہ عدم شعور کسی مخصوص ہستی کو انتخاب کرنے سے قاصر ہے، بلا سب پہ یکساں نازل ہوتی ہے گدا ہو یا بادشاہ، امام ہو

یا ہی مگر عشق وہ بلا ہے جس کو استعداد تاثر کے لحاظ سے انتخاب کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ اہل دل کو ڈھونڈتا ہے لہذا یہ کلیہ کہ بلا انتخاب نہیں کر سکتی باطل ہو گیا۔ شاعر درحقیقت مادی، روحانی اور وجدانی تینوں عالموں کا سیاح ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر کوئی دوسرا شخص تحقیقات و انکشافات کر ہی نہیں سکتا۔

تمام بزرگ ہستیوں کا مرکز خیال متحد ہوتا ہے

یہ مسلمہ ہے کہ خیال کسی کی ملکیت نہیں ہے اور یہ بھی بدیہی ہے کہ سقف عمارت کا قیام بغیر ستون کے ممکن نہیں، علوم نظری ہوں یا عملی بغیر علوم متعارفہ کے وجود میں نہیں آ سکتے، علم ہندسہ کی بنا نقطے کے وجود پر ہے اور علم النفس کی اساس اتحاد خیال پر۔ یہ صحیح ہے کہ ہر کس بخیال خویش خبطے دارد لیکن احول یا مذاق طبیعت کے لحاظ سے خبط کا مختلف ہونا تو مسلّم ہے مگر فیما بین خبط کا وجود ہر دماغ میں یقیناً مشترک ہے فقط نوعیت خیال بدلی ہوئی ہے۔ منارہ بابل کی تعمیر میں محض اختلاف لسانی کے باعث رخنہ پڑا، اختلاف خیال بھی اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر تہذیب و تمدن کی عمارت وجود میں آ ہی نہیں سکتی

نہ تو کوئی ہم جنس اپنے ہم جنس کے ساتھ مشغول پرواز ہو سکتا ہے نہ کوئی شخص اپنے ہم نشینوں اور ساتھ والوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔

شہنشاہ اکبر کا حاملہ عورتوں کو ایک ماحول میں نظر بند کرنا، نوزائیدہ بچوں کا گونگا رہنا "دو سیانے آدمی ایک ہی مت کے ہوتے ہیں" اس دعوے کے ثبوت میں بیربل کا شہر کے بنیوں اور مہاجنوں کو حکم دینا کہ وہ پردۂ شب میں فرداً فرداً اور علیحدہ علیحدہ خالص دودھ کے گھڑوں سے ایک خالی حوض کو بھر دیں اور صبح ہونے کے بعد حوض کا پانی سے لبریز پایا جانا اور دریافت کرنے پر اس حقیقت حال کا انکشاف ہونا کہ ہر بنیئے اور مہاجن نے اپنے مقام پر یہ خیال کیا تھا کہ سب تو دودھ کا گھڑا لائینگے اگر میں اس اندھیری رات میں ایک گھڑا پانی کا لیجا کر حوض میں ڈالدونگا تو کیا پتہ چلے گا اور اس کثیر المقدار دودھ کے حوض میں تھوڑا سا پانی کیا معلوم ہو سکے گا۔

اس قسم کے تجربات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے اور یہ فلسفہ حقیقت ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایک شعبۂ زندگی کے ہم پیشہ لوگ یا کسی ایک شعبۂ علم کے استاد و شاگرد یا ہم مذاق رنگ طبیعت رکھنے والے افراد یا ایک ہی ماحول میں رہنے سہنے

والوں کے خیالات میں باہم گر توارد ہونا لازمی ہے جس سے محفوظ رہنا محال عقل ہے چنانچہ جملہ دانشوران روزگار مثلاً شیخ الرئیس حکیم بوعلی سینا، ظہیر فارابی، ملا باقر داماد، ڈیکارٹے، لاک، برکلے، ہیوم، نیٹشے، شوپن ہار، کمنیس وغیرہم کا اس مسئلے میں اجماع ہے۔

اردو زبان کی ایک مشہور مثل ہے "اندھوں میں کانا راجہ" بعینہ انھیں الفاظ کے ساتھ انگلستان کے مشہور معروف شاعر ورڈس ورتھ نے اسی مثل کو اپنے کلام میں اس طرح نظم باہے کہ صاف لفظی ترجمے کا دھوکا ہوتا ہے حالانکہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

اسی طرح اس مسئلے کی موافقت میں کہ "سنو زیادہ اور بولو کم" کیونکہ خدا نے دو کان دیئے ہیں اور زبان ایک ہی دی ہے۔ یہ خیال بالکل انھیں الفاظ کے ساتھ انگریزی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں نظم ہوا ہے جیسا کہ حضرت ذوق دہلوی کا شعر ہے ؎

کہ ایک جب سن لے انسان دو — کہ حق نے زبان ایک دی کان دو

اتحاد خیال کے فلسفے پر مزید روشنی ڈالنے کی غرض سے ہم ذیل میں۔

جناب میرزا صاحب کے چند اشعار درج کرتے ہیں جن کا توارد دوسرے شعرا کے کلام سے ہو گیا ہے، ان اشعار کے وارد کرنے کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ میرزا صاحب کا کلام کسی نہج سے ان اساتذہ کے کلام سے بہتر یا اُن کے ہم پلہ ہے :—

توارد خیال کی مثالیں

درد — ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا
اعیان ہیں مظاہر، ظاہر ظہور تیرا

میر — اُسکے فروغِ حسن سے جھکے ہے سب میں نور
شمعِ حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

ثاقب — بتائیے رہیگی شمع کس طرح حجاب میں
یہ کیا کہ جھلکے حُسن کو چھپا دیا نقاب میں

ذوق — تجھے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

غالب — تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

امیر — اُسکی حسرت ہے جسے دل سے بھلا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اُسکو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں

ثاقب — اپنی قسمت سے بگڑ جاؤں کہ دورِ چرخ سے
میں تو وہ ڈھونڈا کیا جو جیب دنیا میں نہ تھا

درد — جس مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے
کیا تاب گزر ہو وے تعقل کے قدم کا

ثاقب — دم نہیں لیتا دھواں دل کا نظر آئے تو کیا
سیکڑوں پردے پڑے ہیں دیدۂ ادراک پر

میرؔ اپنی ہستی حباب کی سی ہے — یہ نمایش سراب کی سی ہے

ثاقبؔ ڈھونڈ نہ جیسے برق بھول کے خاک و آب میں — دیکھ لے چہرۂ جہاں آئینۂ سراب میں

غالبؔ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

ثاقبؔ اپنے ہی دل کی آگ میں آخر پگھل گئی — شمع حیات موت کے سانچے میں ڈھل گئی

دردؔ ہو گیا مہمان سرائے کثرت موہوم آہ — وہ دل خالی جو تیرا خاص خلوت خانہ تھا

ثاقبؔ جو کچھ ہوا عالم میں ہوتا نہ تو کیا ہوتا — بہتر تھا مگر ٹوٹے کو یہ دل نہ بنتا ہوتا

دردؔ وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ثاقبؔ افسوس ہے کہ عمر فانی نے ختم کر دیا — مجھکو وہی بنایا جس کو میں جانتا تھا

قائمؔ قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند — کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

ثاقبؔ مری قید کا دل شکن ماجرا تھا — بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا

سوداؔ اے ہمصفیر فائدہ ناحق کے شور کا — ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو گئے

ثاقبؔ قفس میں چپ ہوں میں تو کیا کروں کہ قید — نہ دوستی کے لئے ہے نہ دشمنی کے لئے

دردؔ گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر — میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

ثاقبؔ شکر گزار درد ہو دل کی خبر بھی ہو چکی — تو جو نہیں نہیں سہی نالہ تو بار یاب ہے

درد جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنستے ہی رو دیا ہوگا

ثاقب شادی میں بھی کچھ غم کے پہلو نکل آتے ہیں — بیساختہ ہنسنے میں آنسو نکل آتے ہیں

درد کھل گیا جو کچھ کہ تھا اسے عیسیٰ — ہستی موہوم کا یاں افترا

ثاقب نظر کر غور سے آئینۂ اسرار ہستی پر — جسے تو زندگی سمجھا ہے وہ دھوکا ہی دھوکا ہے

درد آتی ہے دل میں اور ہی صورت نظر مجھے — شاید یہ آئینہ بھی کسی کے حضور ہے

ثاقب ہٹے یہ آئینہ محفل سے اور تو آئے — کوئی تو ہے جو میرے دل کے روبرو آئے

خاقانی ہمسایہ شنید نالہ ام گفت — خاقانی را دگر شب آمد

درد رکھتا ہوں ایسے طالع بیدار میں کہ رات — ہمسایہ میرے نالوں کی دولت نہ سو سکا

میر جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو کاہے کو ہمسایہ سوتا رہے گا

ثاقب ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے — سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

لاعلم شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم — دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

درد ہستی نے تو ٹک جگا دیا تھا — پھر کھلتے ہی آنکھ سو گئے ہم

ثاقب عمر بھر غفلت رہی ہستی بے بنیاد سے — اٹھ گئے اک نیند لیکر عالم ایجاد سے

درد واعظ کسے ڈراتے ہو یوم الحساب سے — گریہ مرا تو نامۂ اعمال دھو گیا

ثاقب اسطرح پاک کیا اشک ندامت نے مجھے — اس سے پہلے کبھی جیسے میں گنہگار نہ تھا

درد بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ — سب اہل قبر اسی کا خمار رکھتے ہیں

ثاقب کیا چیز ہے حیات کہ مرنے کے بعد بھی — جو چپ ہوا وہ گوش بر آواز صور تھا

درد اگر آہ بھرئیے اثر شرط ہے — وگر ضبط کیجیے جگر شرط ہے

ثاقب پھول سا قلب ہے اور صبر کی سل رکھتا ہوں — جب تو کہتا ہے زمانہ کہ میں دل رکھتا ہوں

درد یا رب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں — دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

ثاقب اپنی حد سے بڑھ کے جاتا کسطرف دم دل — جان پڑتے ہی یہ مشت خاک بیجاں ہو گیا

درد جنہوں کے دل میں جگہ کی ہے نقش عبرت نے — سدا نظر میں وہ لوح مزار رکھتے ہیں

ثاقب نزدیک سمجھ حشر ہو یا یک اجل ہو — ملنا جسے منظور ہے وہ دور نہیں ہے

ولہ عبرت شہر ہو گیا جب سے چھپا مزار میں — خیر جگہ تو مل گئی دیدۂ اعتبار میں

درد کیجیے کیا آہ کدھر جائیے — چھوٹئیے اس دکھ سے جو مر جائیے

ذوق اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

ثاقب ایک دم تھا جو کسی صورت نکلتا ہی نہ تھا — عشق کے ہاتھوں سے یہ مشکل بھی آساں ہو گئی

جامی بہر سنگے کہ خدا ہی جامہ می پوشی — من انداز قدرت را می شناسم

درد: گر معرفت کا چشم بصیرت میں نور ہے — تو جسطرف کو دیکھئے اس کا ظہور ہے

ثاقب: چھپاؤ آپ کو جس رنگ یا جس بھیس میں چاہو — مگر چشم حقیقت بیں سے پردا ہو نہیں سکتا

درد: جلا کر دیکھ نامے کو حقیقت گر نہیں پڑھتا — محبت کے شراروں نے یہ چھاپی جسطرح ہونی

ثاقب: نامہ لکھتے وقت کیا جانے قلم کیونکر چلا — اضطراب دل نظر آنے لگا تحریر میں

درد: بس ہے یہی مزار پہ میرے کہ گاہ گاہ — جائے چراغ کوئی دلِ مہرباں جلے

ثاقب: بہت سے یاد ہیں محفل کے بیٹھنے والے — کبھی تو بھول کے کوئی سر مزار آئے

درد: ہم نے تو ایک معصیت چاہی چھپنے چھپ سکی — اپنے گناہ کو ترا عفو ہی پردہ پوش ہے

ثاقب: پردہ پوشی پہ تری ناز ہے اے ذرہ نواز — حشر میں ڈھانپ لیا منھ مری رسوائی نے

درد: مآل کار سمجھایا قبور نے ہم کو — یہ نقد مال لگا ہاتھ اس دفینے سے

ثاقب: روشنی ڈال کے دنیا کا دکھاتا تھا مآل — یہ چراغِ سر تربت مرا بیکار نہ تھا

درد: مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے — کہ زندگانی عبارت ہے ترے جینے سے

ثاقب: دلِ مردہ کبھی جینے کا طلبگار نہ تھا — ہوشیاری کو سمجھتا تھا یہ ہشیار نہ تھا

ولہ: زندگی اچھی سہی لیکن اسے سمجھے تو کون — دل نہیں تو عالمِ ایجاد میں کیا رہ گیا

درد: اس ہستی خراب سے کیا کام تھا ہمیں — اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

ثاقب ہستی فانی یہ اک اصرار تھا تقدیر کو — ورنہ کب منظور تھا خواب پریشاں دیکھنا

درد اطفائے نار عشق نہ ہو آب اشک سے — یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

دلِ آتشیں کو دل کی میں سمجھا تھا آنسو بجھا دینگے — ولے یہ آگ تو پانی سے بھڑکی اور بھی دونی

ثاقب جہاں تک آنکھ میں آنسو تھے رو کے دیکھ لیا — کہ دل کی آگ کا ممکن نہیں بجھا دینا

میر مرتا تھا میں تو باز رکھا مرنے سے مجھے — یہ کہے کوئی ایسا کرے ہے، ارے، ارے!

غالب میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ثاقب درد سر اک آدھ بھی کرنے نہیں دیتے مجھے — موت ہو آساں مگر مرنے نہیں دیتے مجھے

میر ڈرتا ہوں مالکان جزا چھاتی دیکھکر — کہنے لگیں نہ واہ رے زخم اسکے ہاتھ کا

غالب نظر لگے نہ کہیں انکے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ثاقب داد پائیگا بھلا کیا حشر کے بازار سے — نام قاتل چھپ سکیگا زخم دامندار سے

غالب زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

ثاقب وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فراز دہر — جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھکر

غالب کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ثاقب ویرانہ جہاں دیکھ لیا راہ سفر میں — بڑھتا ہوں اسی سمت کہ شاید مرا گھر ہو

غالب نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے — جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آکے دم ہوئے

ثاقب وہ روح بخش جاں تھے جو نکاہ بنکے نکلے — کچھ دم تھے پاس میرے جو آہ بنکے نکلے

غالب قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ثاقب عقدہائے غم سے وابستہ ہے اپنی زندگی — ہم کہاں یہ مشکلیں جس وقت آساں ہو گئیں

غالب ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائینگے ہم تمکو خبر ہونے تک

ثاقب سد حادثہ دہر کی ٹوٹی نہ اجل سے — جاتی نہیں ان تک مرے مرنے کی خبر بھی

میر کوئی تو تھا طرف پر آواز دی نہ ہمکو — ہم بیقرار ہو کر چاروں طرف پکارے

ثاقب یہ سب بے مروتیاں دیکھئے اگر لب شہ ملے — جو پاس تھے ہم آنکھیں دور تک پکار آئے

ولہ قریب ہو کے نہ ٹھنڈا ہو دلیل الفت ہے — پکارے جاؤ کوئی ہم کلام ہو کہ نہ ہو

میر دنیا کی قدر کیا جو طلبگار ہو کوئی — کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی

ثاقب عروس دہر کو دل دیکے آزماؤں کیا — سنوارنے میں جو بگڑے اسے بناؤں کیا

میر اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ثاقب راستہ وحشت کو آخر ملگیا تنگی میں بھی — یہ گریباں تھا جو دو ہاتھوں میں داماں ہو گیا

میر دیدنی ہے شکستگی دل کی — کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

ثاقب ہم بھی سمجھے تھے انجام کہ جب فطرت نے — خاک اور خون سے تیار کیا خانۂ دل

سعدی گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم — چہ بگویم کہ غم از دل برود چون تو بیائی

میر ہم کہتے تھے یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — یہ کہنے کی باتیں تھیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

ثاقب بیان حال کا نیرنگ عشق دشمن ہے — ادھر وہ سامنے آئے ادھر گلا نہ رہا

ولہ اُنکی بزم ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی — نالہ کش پر سوز کا اک تصویر بنکر رہ گیا

میر اُسکے ایفائے عہد تک نہ جئے — عمر نے ہم سے بے وفائی کی

ثاقب زاد حیات دے نہ سکا قصد دل کا ساتھ — اُس در پہ جاتے جاتے میں افسانہ ہوگیا

میر میر صاحب سے خدا جانے ہوئی کیا تقصیر — جس سے اس ظالم نایاں کے سزاوار ہوئے

غالب حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

ثاقب یا نہ تھا اُنکے سوا دہر میں ظالم کوئی — یا سوا میرے کوئی اور گنہگار نہ تھا

میر وہ گل کو خوب کہتی تھی میں اُسکے روئے ہنس — بلبل سے آج باغ میں جھگڑے بڑے رہے

آتش یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے — ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے

ثاقب میں سن چکا دل و بلبل کی بحث بیجا ہے — وہ اپنی شکل کے ہیں پھول اپنی صورت کے

میر ترا ہی وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں — نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے

ثاقب یہ ضعف کا عالم ہے کہ تقدیر کا لکھا — بستر پہ ہوں میں یا کوئی تصویر پڑی ہے

میر یا بادۂ گلگوں کی خاطر سے ہوس جائے — یا ابر کوئی آئے اور آکے برس جائے

ثاقب بڑے شباب پہ دردِ فراق مستی ہے — نہو شراب تو پھر وان گھٹا برستی ہے

میر آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز — وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

ثاقب اپنا سا زور کر کے تھکے منعمانِ دہر — مٹھی نہ کھل سکی مرے دست سوال کی

میر حال بدگفتنی نہیں اپنا — تم نے پوچھا، تو مہربانی کی

ثاقب کس منہ سے زباں کرتی اظہار پریشانی — جب تم نے مری حالت صورت سے نہ پہچانی

میر پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج — ناطاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا

ثاقب گرنے لگی ہے قیمت دل آنسوؤں کے ساتھ — کس نے الٹ دیا ورقِ اعتبار کو

میر آہ ہر غیر سے تا چند کہوں دل کی بات — عشق کا راز تو کہتے نہیں محرم سے بھی

ثاقب دل نے رگ رگ سے چھپا رکھا ہے تیرا دردِ عشق — جسکو کہہ دے نبض ایسی میری بیماری نہیں

میر دل کے تئیں آتش ہجراں سے بچایا نہ گیا — گھر جلا سامنے اور ہم سے بجھایا نہ گیا

ثاقب مختار ہے بندہ کوئی مجبور نہیں ہے — پھر کیا ہے جو دل پہ مرا مقدور نہیں ہے

ولہ حواس، سوزِ غم دل کی تاب لا نہ سکے — ~~وہ آگ گھر میں لگی تھی کہ ہم بجھا نہ سکے~~

لگی کچھ آگ ہی ایسی

درد تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا
پر وہ کیا کچھ تھا کہ جی کو بھا گیا

ثاقب جفا اٹھانے کی عادت پڑے تو کیونکر جائے
ستم سہے مگر اتنے کہاں کہ جی بھر جائے

درد آیا نہ چین جی کو نہ دل سے تپک گئی
میں چپ رہوں کہاں تئیں چھاتی تو پک گئی

ثاقب فشار غم ابس ہے تو ضبط میں بھی آگ لگتی ہے
لہو جلتا ہوا رسنے لگا ہر گوشۂ دل سے

درد مری سی نالہ تراشی نہ کر سکا فرہاد
اگرچہ اس نے بھی اک عمر تیشہ رانی کی

ثاقب دل غمناک ایسا ہے کہ درد ایجاد کرتا ہے
زمانہ رو رہا ہے یوں کوئی فریاد کرتا ہے

غالب ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ثاقب آؤ تو ہم دکھائیں تمھیں اک نیا جہاں
آباد ہے خیال میں دنیا مثال کی

درد اٹھتی نہیں ہے خانۂ زنجیر سے صدا
دیکھو تو کیا سبھی یہ گرفتار سو گئے

ثاقب قابل جنبش تھا جھنکارے وہ کہیں کڑیاں مجھے
آج سناٹا پڑا ہے خانۂ زنجیر میں

درد ہم اتنی عمر میں دنیا سے ہو گئے بیزار
عجب ہے خضر نے کیونکر کے زندگانی کی

ثاقب یہاں دم بھر کا جینا بھی ہے دوبھر
کوئی خوش ہوگا عمر جاوداں سے

میر اب حال اپنا اسکے ہے دلخواہ
کیا پوچھتے ہو الحمد للہ

ثاقب جائے خوں ثاقب رگ و پے میں ہے سارے عشق دوست
شکر ہے میرا گلا کٹنے کے قابل ہو گیا

غالب دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہوا

ثاقب ابھرا ہوا نہ دیکھا نقش وفا کسی کا
خوش دل ملا نہ کوئی اس لفظ بے نشاں سے

درد غیر از ملال زاہد! کیا ہے طریق زہد میں
دل ہو شگفتہ جس جگہ کوچہ مے فروش ہے

ثاقب دور نشاط سے نہیں محروم غیر بھی
ہنستے ہیں لوگ چہرۂ میخوار دیکھکر

درد درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے
جو سانس بھی نہ لے سکے وہ آہ کیا کرے

ثاقب خموشی ہی مری کیونکہ گمانی ہے مرے دل سے
وہ کیا نالے کرے جو سانس بھی لیتا ہو مشکل سے

درد کوئی بھی شخص اس کا مارا ہوا نہ بچا
دل مت کہیں لگانا الفت بری بلا ہے

ثاقب تڑپنا کسکا دیکھو گے جو زندہ ہو تو سمجھو
بلائے عشق کا مارا کبھی بسمل نہیں ہوتا

درد خبر اپنی لے اے گلستان خوبی
کرے ہے تبسم ترا گل فروشی

ثاقب مست رہتے ہیں ہمیشہ مے فروشان جمال
ہم تو مانگینگے کوئی ساغر وہ فرمائینگے کیا

درد دل بھی ترا ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

ثاقب ہر دم ہے اب نئی خلش غم کہ دل مرا
صورت نمائے جلوۂ جاناں نہ ہوگیا

غالب حیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب
جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

ثاقب ہاتھوں کی خطا ہو کہ مقدر کی جفا ہو
جو چاک نہ ہوتا وہ گریباں نہیں دیکھا

تمام شد

قطعات تاریخ وفات حضرت شمس العلماء مولانا مولوی سید سبط حسن صاحب طاب ثراہ

چار دن کی زندگی بھی کیا مصیبت ناک ہے — ہر گھڑی کی روح فرسا آفتیں ہر دم کی موت

کون کہہ سکتا ہے کب آئیگی بہر قبض روح — راز سربستہ ہے قدرت کا بنی آدم کی موت

ہائے یہ ماہ محرم، یہ عزاداری کے دن — اس پہ اک طرفہ قیامت، زیب بزم غم کی موت

مجلسوں میں ہر طرف کہرام پر کہرام ہے — رونما ہے حشر ہے سر حلقۂ ماتم کی موت

قوم کو رلوائیگی ہر معرکے میں اشک خوں — دین حق کی فوج! تیرے قائد اعظم کی موت

زندگی پر خاک ایسے ہادی ایماں کے بعد — باعث مرگ جہاں ہو جس اکیلے دم کی موت

ہے پے سبط حسن ثاقب جو فکر سال مرگ — کہئے سچ ہے موت اک عالم کی اک عالم کی موت

۱۳۵۴ ہجری

دیگر

سید سبط حسن چوں در نوشت — رخت رحلت جانب خلد برین

فکر سالش داشتم ثاقب کہ گفت — ناگہاں در گوش دل روح الامین

روح او را رب اکبر بے نیاز (۶۵) — داد اذن فادخلوہا خالدین

۱۳۵۴ ہجری

دیگر

اے کہ بر اوراق عالم از حدیث مرگ تو — نقش در ماہ عزا شد تازہ عنوان سخن

کیست تا داند کہ زیں غم بر سر عالم چہ رفت — کیست تا بیند چہ بر دل آمد از رنج و محن

بزم افروزِ عزاے شاہِ دیں! رفتی کجا ‏ ‏ ‏ مجلسِ غم بے تو بے شمع است گویا انجمن

بسکہ شد از رفتنت عالم بچشمِ ما سیاہ ‏ ‏ ‏ شامِ غربت می نماید در نظر صبحِ وطن

بے تو ماند لاشۂ بے روح ہر شخصِ جہاں ‏ ‏ ‏ تو ز ما گشتی جدا و شد جدا جانہا ز تن

عارفِ رمزِ حقیقت رازدانِ شرعِ دیں ‏ ‏ ‏ قدوۂ اربابِ معنی، سیدِ سبطِ حسن

عالمِ فقہ و حدیث و عاملِ اعمالِ خیر ‏ ‏ ‏ واعظِ معجز بیان و ذاکرِ اعجاز فن

بخشدت آرامِ جاں از قربِ شاہِ کربلا ‏ ‏ ‏ در جوارِ رحمتِ خود کردگارِ ذوالمنن

صبحگاہِ پنجشنبہ بود دو بست و ہشتِ ماہ ‏ ‏ ‏ تا نہاد این داغِ نو بر سینہام چرخِ کہن

ثاقب افسردہ خاطر سالِ ایں ماتم نوشت ‏ ‏ ‏ شد تہی بزمِ علوم از جلوۂ انوارِ فن

۱۳۵۴ ہجری

قطعۂ تاریخِ رحلتِ فرخ جہاں بیگم

بانوے نورِ نگاہم، میرزا جعفر حسین ‏ ‏ ‏ پاک طینت، نیک خو، فرخ لقا، عصمت سرشت

چوں بروزِ پنجشنبہ وقتِ عصر از ماہِ صوم ‏ ‏ ‏ رہگرا گردید در بست و ششم سوئے بہشت

در غمش بر داشت ثاقب دل ز دہر و سالِ فوت ‏ ‏ ‏ بر مزارش، مرقدِ فرخ جہاں بیگم، نوشت

۱۳۵۰ ہجری

تمت بالخیر